یادِ ایّام

جلد سوئم

خود نوشت سوانح حیات

حافظ ڈاکٹر نواب سعید الملک بہادر

محمد سعید خاں والی چھتاری

چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

علی گڑھ
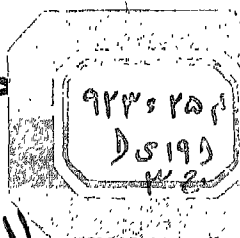
یادِ ایام

پھر بھولی کہانی یاد آئی

دوسری جلد نامکمل رہ گئی

اب پھر پرانی یادوں کو سپردِ قلم کر رہا ہوں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آل انڈیا بوائے اسکاؤٹ

سیاسی تحریکات سے ہر طرف مجھے ۱۹۳۵ء میں ایک سوشل تحریک میں بھی کام کرنے کا موقعہ ملا۔ لارڈ ولنگڈن نے جو بحیثیت گورنر جنرل کے ہندوستان کے چیف اسکاؤٹ بھی تھے مجھے ہندوستان کا چیف کمشنر مقرر کیا۔ یہ ایک اعزازی خدمت تھی مگر بہت ہی دلچسپ تھی۔ مجھے اپنے ملک کے نوجوانوں سے ملنے کا موقعہ ملا۔ اُن کے خیالات۔ ان کی امیدیں۔ ان کے جذبات اور ان کی دشواریوں کو سمجھنے کا موقعہ ملا۔

بوائے اسکاؤٹ تحریک کے بانی لارڈ بیڈن پاؤل تھے۔ یہ ایسے خوش نصیب اور با اقبال تھے کہ اُن کی تحریک بوائے اسکاؤٹ اُن کی زندگی ہی میں دُنیا میں مقبول ہو گئی۔ مجھے کمیونسٹ ممالک کا تو علم نہیں لیکن دُنیا کے مہذب اور ترقی یافتہ ملکوں میں بوائے اسکاؤٹ کی تحریک اور تنظیم ہر ملک میں شروع ہو گئی۔ لارڈ بیڈن پاؤل عالمی چیف اسکاؤٹ تھے۔ اسی سلسلہ میں لیکن اس سے بالکل جُدا طور پر لیڈی بیڈن پاؤل نے ایک تنظیم لڑکیوں کے واسطے بنائی اور اس کا نام گرل گائیڈ رکھا گیا۔

یہ تحریک لڑکوں اور لڑکیوں کے واسطے بہت مفید ثابت ہوئی۔ یہ تحریک
بالکل غیر سیاسی ہے۔ مذہب نسل و قوم کی بناء پر کوئی تفریق نہیں۔ اس کا مقصد
یہ ہے کہ نوعمری کے زمانہ میں تہذیب نفس (Deceplime) اور خود اعتمادی
کو ذہن نشین کیا جائے۔ نوجوان میں خدمت خلق کا جذبہ پیدا کیا جائے معصوم
کھیل اور تفریحات کی صورت میں ان اعلیٰ جذبات کو اُن کے دلوں میں پیدا
کیا جاتا ہے وہ خود اپنے اوپر قیود اور پابندیاں لگاتا ہے اور انہیں خوشدلی کے
ساتھ برداشت کرتا ہے اور ایک اچھے اور کارآمد شہری میں جو صفات
درکار ہیں وہ اس میں پیدا کرنے کی کوشش کیجاتی ہے۔

یہ چیز بھی قابل غور ہے کہ لارڈ اور لیڈی بیڈن پاؤل کہ جو ایک ایسے
ملک کے باشندے تھے کہ جہاں کی سوسائٹی میں مرد و عورت ہمیشہ ملکر کام کرتے
رہے جنسی آزادی ایشیائی ممالک سے وہاں بہت زیادہ ہے مگر بانی تحریک
بانی تحریک نے دونوں جماعتوں کو الگ الگ رکھا۔ کوئی مخلوط تنظیم نہیں کی۔
لڑکیوں کی تنظیم لیڈی بیڈن پاؤل نے اپنے ہاتھ میں لی اور لڑکوں کی تنظیم لارڈ
بیڈن پاؤل نے خود لی۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ نوعمر بچوں کے لئے ایسی مخلوط تنظیم
کا بنانا خطرے سے خالی نہیں فطری رجحانات بعض اوقات ان کی تعلیم و تربیت
میں حائل ہوجاتے ہیں اور جنسی کشش مستقبل کی تباہی کا سبب ہوجاتی ہے۔

مجھے اس حیثیت سے دورہ کرنا ہوتا تھا۔ گو جس قدر میں چاہتا تھا اُسی قدر
تو نہیں پھر بھی۔ اجمیر۔ بمبئی۔ ٹراونکور۔ کوچین اور دوسرے بہت سے مقامات
پر جانے کا اتفاق ہوا اور اپنے ملک کے نونہالوں سے شناسائی کا موقعہ ملا
چیف کمشنر کا تقرر وایسرائے کی سفارش پر جو بحیثیت ہندوستان کے
چیف اسکاؤٹ کے ہوتی تھی (Imperial Head Quarter
London) سے ہوتا تھا۔ چنانچہ ۱۰ ستمبر ۱۹۳۵ء کو میرا Warrant of
appointment) جاری کیا گیا جو بحیثیت عالمی چیف اسکاؤٹ کے

لارڈ بیڈن پاؤل کا دستخطی ہے۔

فروری ۱۹۳۷ء میں پہلی (National Jamboree) ہوئی یہ اسکاؤٹ کا مجمع تھا جس میں ہر صوبہ کے نمایندہ اسکاؤٹ آئے تھے اس میں شرکت کی غرض سے لارڈ اور لیڈی بیڈن پاؤل خود ہندوستان آئے ایک ایسی عالم گیر تحریک کے بانی کہ جو تحریک تمام مہذب اور ترقی پسند دنیا پر چھا گئی ہو خود موجود ہونے سے اس موقعہ کی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا تھا۔ باوجود ضعیف العمر ہونے کے زندہ دل اور جوان ہمت تھے۔ مجھے انہوں نے اپنا رنگین فوٹو دستخط کر کے دیا تھا جو حیدرآباد کے مسلمانوں نے جب گھر جلایا تو وہ بھی نظر آتش ہو گیا مجھے اس کا بہت افسوس ہوا۔ جن چیزوں سے خوشگوار پرانی یاد تازہ ہوتی ہو ان کا تلف ہونا بہت تکلیف دہ ہوتا ہے یہ پھر نصیب نہیں ہوتیں۔

اس موقعہ پر چار ہزار اسکاؤٹ ہندوستان کے مختلف حصوں سے جمع ہوئے تھے اس میں دیسی ریاستوں اور برٹش انڈیا ہر جگہ کے نمائندے تھے۔

میں نے اس کا افتتاح یکم فروری ۱۹۳۷ء میں کیا تھا یہ ایک بہت ہی دلکش نظارہ تھا جس کی یاد ہمیشہ قائم رہے گی۔ ملک کے اتنے نوجوان مختلف زبانیں بولنے والے مختلف مذہب کے پیرو مگر حقیقی بھائیوں کی طرح ایک ہفتہ تک ساتھ رہے تھے کھیل اور تفریحات میں شریک ہوتے تھے اور کوئی تفریق مذہب و ملت کی بنا پر نہ تھی۔

۳ فروری کو لارڈ لنلتھگو بحیثیت چیف اسکاؤٹ ملے لارڈ اور لیڈی بیڈن پاؤل آئے میں نے اُن کا استقبال کیا اور چبوترے پر یہ حضرات کھڑے ہوئے اور چار ہزار اسکاؤٹ نے (مارچ پاسٹ) کے ساتھ سلامی دی۔ ویسرائے نے بادشاہ کی طرف سے ایک پیام بھی اپنی تقریر میں پڑھا۔ جس کا اقتباس حسب ذیل ہے۔

All India Boy Scouts Association.

"My personal connection with the Boy Scout Movement in England enables me to appreciate fully the keenness of both scouters and Scouts under the Leadership of the Chief Commissioner, Nawab Sir Mohammad Ahmad Said Khan (of Chhatari) in having brought the movement to its ever increasing high standing in numbers and efficiency throughout India. I would congratulate you all specially on the valuable Public services rendered by Scouts on various occasions."

All India Boy Scouts Association.

The Viceroy's House,
New Delhi.

I am glad to be with you today and as, Chief Scout for India, to see a Jamboree at which every Province and every State affiliated to the Boy Scout Movement is represented. I am particularly happy to have this opportunity to welcome, on behalf of all of you and India the Chief Scout himself. I know well what good work the Boy Scout Movement has done, and at Krokshetra and in the Quetta-earthquake—to take two outstanding examples only—you rendered to your country services of the greatest possible value. In every province I have visited I have been glad to see representative contingents of Boy Scouts, and to find them smart, well-disciplined, orderly and keen.

His Majesty the King-Emperor, in the gracious message which I have just read to you, emphasises the importance of the Movement as Training School in all the qualities of body, mind and spirit which tend to make good citizens for India. Those of us who have been fortunate enough to see the working of the Movement and the results it has achieved in this country, realise fully how well-earned has been the praise which His Majesty has bestowed on the Movement.

Let us see to it that we continue to grow in numbers and in efficiency : true to our motto and faithful to our Scout promise. (Sd.)

میری افتتاحی تقریر حسب ذیل تھی۔

"I offer you, Boy Scouts, Rover Scout and Scouters who have travelled long distance and come here to participate in this First All-India Jamboree, a most hearty welcome. Due to the very great demand on my time, it has not been possible for me to visit the differant Provinces and States as I had desired, but I am glad that this Jamboree has offered me the opportunity of meeting you all and also of seeing some thing of work you are doing. I am in the movement only for a year, or so and I perhaps claim on that account that I still retain the outlook of an outsider and am in a position to appreciate the attitude of outsiders. It is true that we are three lakhs strong in India, but we should remember that we have not yet touched the fringe of the work before us. We have still a great deal to do.

"I think that our greatest enemy is apathy and not opposition. Good causes in this world have suffered more from indifference than from downright opposition. In order to fight this two things are required, leadership and propaganda. As far as personal leadership is concerned I admit that leaders are born and not made. But if we have before us, the real ideals of the movement then our leadership is bound to succeed, the work of our men will be even more successful than it has been in the past years.

لارڈ بیڈن پاؤل کی آخری تقریر جمہوری کا ہفتہ ختم ہونے پر حسب ذیل ہوئی -

All India Boy Scouts Association.

"Scouts, we have had a glorious time this evening and I hope you will have had a happy time together during your stay in Camp. To me it was a wonderful spectacle to see boys drawn from all over the country living together as brothers and sharing each others difficulties and joys. Remember that you are members of a brotherhood which extends to all the countries of the world Carry with you to your home troops the lessons, happy experiences and memories of the First Indian Jamboree.

"I ask you to work now and later when you grow up, as men, for the good, happiness and prosperity of the country. You Scouts have a great heritage and your motto should always be "Honour", honour to yourselves and honour to your Country.

"I am not sure that I will be able to meet you again. Most of you, I may not. But I would ask you to be good scouts all your lives and to be of service to others.

"I thank you all once again for the splendid show tonight. I will carry away pleasant recollections of this great gathering and of your fine performances.

"Now, good-bye, and God bless you all."

اسکاؤٹس کے اس مجمع کا تصور مجھے ہمیشہ یاد رہے گا مادرِ ہند کے اتنے بچوں کا ایک جگہ جمع ہونا بھائیوں کی طرح ایک ہفتہ یکجا رہنا ساتھ کھیلنا۔ کھانا۔ ہنسنا۔ بولنا۔ ایک ایسی خوبصورت تصویر ہے جسے میں کبھی نہ بھولوں گا۔

برٹش حکومت کے خلاف بدگمانی بڑھ رہی تھی۔ ملک آزادی چاہتا تھا۔ جنگ آزادی کے ساتھ ہر اس چیز سے بدگمانی بڑھ رہی تھی جس کو کچھ بھی برٹش سے تعلق ہو۔ یہ میرا دردِ سر تھا۔ میں دورہ کرتا تھا۔ بمبئی بنگلور ٹراونکور۔ راجستھان۔ بنارس وغیرہ بہت جگہ گیا۔ اسکاؤٹ کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا۔ تعداد ۲۷۲۸۵۳ سے بڑھ کر ۳۴۹۰۸۴ ہو گئی تھی مگر مجھے اس کا احساس تھا کہ یہ بدگمانی بوائے اسکاؤٹ کی ترقی میں سدِّ راہ ہے۔ ہندوستان کے بوائے اسکاؤٹ کا تعلق اب تک لندن کے امپیریل ہیڈ کوارٹر سے تھا۔ ہر اس تحریک کو کہ جسے کچھ بھی لندن سے تعلق ہو اور ہر وہ تنظیم کہ جس میں لندن کی طرف رُخ کیا جائے بعض حضرات کو بدگمان کرتی تھی چنانچہ اسی وجہ سے ایک دوسری تحریک ہندوستان اسکاؤٹ کے نام سے شروع ہوئی۔ اس بدگمانی کو دور کرنے کی غرض سے

یہ طے کیا گیا کہ ہندوستان کے بوائے اسکاؤٹ کا الحاق امپیریل ہیڈ کوارٹر لندن کی بجائے (International Bureau) سے ایک آزاد قومی جماعت کی حیثیت سے کرا دیا جائے چنانچہ ۱۹۳۸ء میں اسکی تکمیل ہو گئی لیکن بدگمانی میں اس سے کوئی کمی نہ آئی گو یہ ظاہر تھا کہ (International Bureau) میں تمام آزاد ممالک کے بوائے اسکاؤٹ شریک تھے۔

اتحاد باہمی کے حصول کی غرض سے ۲۳ اپریل ۱۹۳۸ء کو الہ آباد میں ایک گول میز کانفرنس کی گئی تاکہ ہندوستان اسکاؤٹ اور بوائے اسکاؤٹ میں اتفاق اور اتحاد عمل کیا جائے۔ مادر ہند کے فرزند رشید سر تیج بہادر سپرو بھی اس کانفرنس میں شریک تھے لیکن کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ ہندوستان اسکاؤٹ کو اس پر اصرار تھا کہ بوائے اسکاؤٹ کے (Promise) میں سے بادشاہ کے ساتھ وفاداری کو نکال دیا جائے۔ سر تیج کی رائے یہ تھی کہ جب تک ہندوستان برٹش حکومت کا ایک حصہ ہے بادشاہ وقت حکومت کا ہیڈ ہے اور بوائے اسکاؤٹ چونکہ اچھے شہری بنانا چاہتی ہے لہذا قانون کے مطابق ملک کی جو حکومت ہوگی اس سے وفاداری ہر اچھے شہری کا فرض ہے اس لئے حکومت کے ہیڈ کی حیثیت سے بادشاہ کی وفاداری (Promise) کا ایک حصہ رہنا چاہیئے لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

۱۶ اپریل ۱۹۳۹ء کو مجھے (Silver Wolf) کا تمغہ دیا۔ یہ بین الاقوامی بوائے اسکاؤٹ کا سب سے بڑا تمغہ سمجھا جاتا ہے۔ میں ۱۹۴۱ء تک بوائے اسکاؤٹ کی خدمت کرتا رہا اور جب اگست ۱۹۴۱ء میں حیدر آباد کا صدر اعظم مقرر ہوا تو میں اس تحریک سے علیحدہ ہو گیا۔

انور سعید خاں کی پیدائش

۹ مئی ۱۹۳۷ء کو انور سعید خاں پیدا ہوا۔ یہ باری تعالیٰ کا انعام ہے۔ میں اجمیر گیا تھا وہاں سے واپس ہونے پر یہ خبر معلوم ہوئی۔

نیشنل ایگریکلچرل پارٹی

ہندوستان کو حکومت خود اختیاری مل کر رہے گی۔ اس میں کسی کو شک شبہ کی گنجائش نہ تھی زمیندار جو اب تک برسرِ اقتدار تھے یہ چاہتے تھے کہ جس طرح کونسل میں ان کی ایک جماعت (نیشنل ایگریکلچرل پارٹی) کے نام سے موسوم تھی اسی طرح صوبہ میں بھی کونسل کے باہر اس پارٹی کو منظم کیا جائے تاکہ انتخابات کے وقت اس سے کام لیا جائے۔

مختلف مقامات پر جلسے کئے گئے اور پارٹی کی شاخیں اضلاع میں قائم کی گئیں۔ اس کا مقصد صوبہ میں ایک ایسی جماعت بنانا تھا جو کنسرویٹو پارٹی کے مماثل ہو اور جس طرح انگلستان میں آج تک کنسرویٹو پارٹی برسرِ کار ہے ہندوستان میں بھی انہیں خطوط پر ایک جماعت کی تشکیل کی جائے۔ لیکن جب کام شروع کیا گیا تو طرح طرح کی دشواریاں سامنے آئیں۔

میرے نزدیک کنسرویٹو کے معنی یہ نہیں ہیں جیسا کہ بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ وہ اتنے قدامت پسند ہوں کہ ہر نئی تجویز اور تحریک کے مخالف ہوں۔ ایک جمہوری نظام میں ہر سیاسی جماعت کو اپنا پروگرام عوام کے رجحان اور خواہش کے مطابق تیار کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے ہر سیاسی جماعت کے لئے رائے عامہ کے ساتھ چلنا ناگزیر ہوتا ہے جو جماعت جنتا کا خیال نہ کرے گی وہ سیاسی میدان میں زندہ نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ انگلستان ہی کی مثال موجود

ہے۔ آج کنسرویٹو حکومت وہ سب کچھ کر رہی ہے جس کا آج سے پچاس برس قبل کوئی انتہا پسند حکومت تصور بھی نہ کر سکتی۔ سبب وہی ہے کہ عوام کی خواہش کا لحاظ ہر سیاسی جماعت پر لازم ہے۔ جو پارٹی اس کا خیال نہ کریگی انتخابات کے وقت اس کو مشکلات کا سامنا ہوگا۔ فرق کنسرویٹو اور انتہا پسند جماعت میں صرف اتنا ہی ہوتا ہے کہ اوّل الذکر معاشی اقتصادی تبدیلیاں بتدریج کرنا چاہتی ہے۔ موخرالذکر دفعتاً یا جلد سے جلد ردوبدل کرنے کے حق میں ہوتی ہے ورنہ آنے والے تغیرات سے کوئی پارٹی آنکھیں بند نہیں کر سکتی۔

مثلاً مجھے اس کا بہت عرصہ سے یقین تھا کہ زمینداری قائم نہیں رہ سکتی چنانچہ ۱۹۲۶ء میں (جبکہ زمینداروں کی کونسل میں اکثریت تھی) میں نے کہا تھا کہ زمینداروں کو چاہئے کہ وہ ایسا قانون بنائیں کہ حکومت ہر سال جو زمین نیلام ہو اُسے خریدے یا جو زمیندار فروخت کرے اُس کو لیکر اُس رقبہ کے کاشتکاروں کو مالک آراضی بنائے ۱۹۳۲ء میں دوبارہ اس تجویز کو ایک نوٹ کی شکل میں سر مالکم ہیلی کو بھیجا جس میں اس پر زور دیا تھا کہ ہر سال حکومت اپنے بجٹ میں ایک رقم رکھے اور جو زمیندار اپنی زمینداری فروخت کرنے پر راضی ہوں یا نیلام ہو تو حکومت اُسے خرید کر جو کاشتکار اسے کاشت کر رہے ہوں اُنہیں کو زمیندار بنا دے۔ میری تجویز کا ایک حصہ یہ بھی تھا کہ اُن کا لگان فوراً بقدر مالگذاری کر دیا جائے اور اس سے زیادہ کچھ ادا کریں وہ ادائیگی زمین کی قیمت میں محسوب ہو۔ مثلاً اگر کوئی کاشتکار سو روپیہ سالانہ لگان میں دیتا ہے اور اس زمین کی قیمت سولہ سو روپیہ گورنمنٹ نے ادا کی اور زمیندار سابق چالیس فیصدی مالگذاری دیتا تھا تو کاشتکار اس اسکیم کے تحت سو ہی روپیہ سالانہ ادا کرے گا لیکن چالیس روپیہ مالگذاری میں اور ساٹھ روپیہ سال انھی سولہ سو کے مطالبہ میں محسوب

ہوگا جو زمینداری کی قیمت ادا کی گئی۔

سنہ ۱۹۳۷ء میں چند روزہ حکومت کی ذمہ داری مجھ پر آئی تو میں نے اس تجویز سے متعلق تفصیلات مرتب کرنے کا اہتمام کیا۔

کام شروع کیا گیا تو طرح طرح کی مشکلات کا سامنا ہوا۔ سب سے پہلی دشواری یہ تھی کہ اس تحریک کو انگریز کے اقتدار کو قائم رکھنے کا وسیلہ سمجھا گیا۔

جتنے لوگ اس تحریک میں شامل تھے وہ سب تدریجی اصلاح کے قائل تھے وہ قانون شکنی یا سول نافرمانی سے متفق نہ تھے۔ ان کا مطالبہ یا احتجاج قانونی دائرے تک محدود ہوتا تھا وہ یکایک انگریزی حکومت کے مطلقاً چلے جانے سے متفق نہ تھے۔ اُن کا تصور ڈومینین Dominion کے درجے سے آگے نہ تھا وہ اس سے خائف تھے کہ اگر تدریجی طور پر اصلاحات نافذ نہ کی گئیں تو ملک میں بدامنی پھیل جائیگی دوسری طرف کانگریس خود مختارانہ حکومت کا مطالبہ اور آزادی کامل کے واسطے جدوجہد کر رہی تھی وہ انگریزی حکومت کا مقابلہ اور قانون شکنی کر رہی تھی۔ قدرتاً لوگ ہماری پارٹی کی طرف سے بدگمان تھے۔

دوسری بڑی کمزوری یہ تھی کہ اس پارٹی کے تمام تر قائدین زمیندار یا دوسرے کھاتے پیتے لوگ تھے ہر شخص اپنی رائے کو افضل خیال کرتا تھا اور یہ پارٹی اسپرٹ کا فقدان تھا۔ سیاسی شعور اور پیش بینی کی اس درجہ کمی تھی کہ ہر ایسی تجویز کو جس میں کچھ قربانی کرنا پڑے پارٹی بہت مشکل سے منظور کرتی تھی۔ ادھر جمہوری طرز حکومت کی بنیاد رکھی جا چکی تھی۔ بغیر رائے عامہ کی تائید کے کیسے کام چلتا اور عوام کیوں کر ساتھ آتے جب اُن کے واسطے آپ کوئی قربانی نہ کریں۔

سیاسی شعور کی کمی کا ایک نتیجہ یہ بھی تھا کہ ان میں فرقہ وارانہ ذہنیت تھوڑی ہی کوشش سے پیدا ہو گئی تھی۔ اگرچہ ہمیشہ سے نہ تھی۔ مختصر یہ کہ یہ ایک ایسی فوج تھی جس میں سپاہیوں سے زیادہ جنرل تھے۔ بہرحال ایک پارٹی کی بنیاد

ڈالی گئی جس میں سر جے۔ پی۔ سریواستوا۔ نواب محمد یوسف دونوں وزراء شریک تھے اور میں اس کا پریسیڈنٹ تھا اور کچھ تنظیم کا کام بھی شروع ہو گیا۔

آل انڈیا مسلم کانفرنس

انہیں دنوں آل انڈیا مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس میں کچھ اختلافات شروع ہو گئے۔ آل انڈیا مسلم کانفرنس کی بنیاد اس پر قائم تھی کہ گول میز کانفرنس کے سلسلہ میں مسلمانانِ ہند اپنی متفقہ آواز اٹھا سکیں۔ ہز ہائینس آغا خاں اس کے سرپرست اور مربی تھے۔ مسٹر محمد علی جناح اس کے مخالف تھے۔ اُن کا اصرار تھا کہ سوا مسلم لیگ کے اور کوئی جماعت مسلمانوں کی نمائندگی کا حق نہیں رکھتی۔ گول میز کانفرنس تک تو مسلم کانفرنس کا زور رہا مگر اب اس میں بھی تفرقہ شروع ہو گیا تھا۔

ہز ہائینس آغا خاں دہلی میں مقیم تھے۔ سر فضل حسین مرحوم نے مجھے دہلی میں بلایا۔ ان کی کوٹھی پر آغا خاں بھی موجود تھے۔ ہر دو حضرات کا یہ ارشاد ہوا کہ مسلم کانفرنس کی صدارت میں قبول کر لوں۔ میری جانب سے معذرت پیش ہوئی اس لئے کہ میں غیر فرقہ وارانہ پارٹی کا پریسیڈنٹ تھا جس میں ہر مذہب و ملت کے اصحاب شریک تھے اس لئے ایک ایسی جماعت کی صدارت کرنا جو فقط مسلمانوں کی جماعت ہو میرے لئے نامناسب تھا۔ میں نے اس عذر کو پیش کیا اور باوجود اس احترام کے کہ جو ہز ہائینس آغا خاں کا میری نظر میں تھا میں نے انکار کیا۔ اسی گفتگو کے دوران میں سر فضل حسین مرحوم نے یہ بھی فرمایا کہ میں سخت غلطی کر رہا ہوں۔ جداگانہ انتخاب کے ساتھ مشترکہ سیاسی جماعت نہیں چل سکتی۔ بہرحال طویل ردّ و قدح کے بعد ایک سال کے واسطے میں نے اسے قبول کر لیا اور یہ یک وقت مسلم کانفرنس و نیشنل

ایگریکلچرل پارٹی کا صدر ہو گیا۔
اس غلطی کا اثر یہ ہوا کہ سر مالکم نے مجھ سے کہا کہ سر جے۔ پی کو اس کی شکایت ہے۔ مسلم کانفرنس کی صدارت سے تو ہیں نے ایک سال کے بعد علیحدگی اختیار کر لی۔ لیکن بعض حضرت نے اس کو خوب اچھالا اور نیشنل ایگلچرل پارٹی میں فرقہ وارانہ ذہنیت پیدا ہو گئی۔ اس ذہنیت کو خوب خوب ہوا دی گئی۔ بھائی پرمانند آنجہانی نے بھی اس صوبہ میں دورہ کیا اور پریس کے ذریعہ سے ہندو مسلم تفرقے کے احساس کو پیدا کیا گیا۔
کچھ ہی روز بعد نینی تال میں پارٹی کی میٹنگ ہوئی۔ سر جے۔ پی سریواستوا نے یہ تجویز پیش کی کہ پارٹی کا نظم اس طرح سے ہو کہ میں تو پوری پارٹی کا پریسیڈنٹ رہوں لیکن اس کے دو بازو ہوں۔ ہندو بازو کے پریسیڈنٹ سر جے۔ پی اور مسلم بازو کے پریسیڈنٹ نواب محمد یوسف مرحوم ہوں اور اس طرح فرقہ وارانہ ذہنیت سے پارٹی میں کمزوری شروع ہو گئی۔
اب ۱۹۳۷ء کا انتخاب آ گیا۔ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے حصہ لینے کا ارادہ کر لیا۔ مسٹر جناح نے جو ایک عرصہ سے ولایت میں رہنے لگے تھے ہندوستان واپس آئے۔ مختلف لوگوں اور پارٹیوں سے گفت و شنید شروع کر دی۔ دہلی میں وہ امپیریل ہوٹل میں مقیم تھے۔ مجھے بھی بلایا اور لیگ میں شامل ہونے کی دعوت دی میں نے عذر کیا اور کہا کہ میں خود ایک مشترکہ پارٹی سے منسلک ہوں اسے کیسے چھوڑ دوں مگر وہ مصر رہے۔ مجھے اس سے یہ اندیشہ ہوا کہ اگر مسلم لیگ نے لبادۂ سیاست پر مذہب کے پھریرے آگے بڑھائے تو میری پارٹی کے مسلمان بازو کو بہت نقصان ہوگا۔ اسی وجہ سے میرے اور ان کے درمیان کچھ ایسی گفتگو بھی ہوئی کہ ہمارے پارٹی کے مسلمان دو نو ٹکٹ لیں۔ لیکن کوئی بات طے نہ ہو سکی اور میں یہ کہہ کر چلا آیا کہ رفقا کار سے مشورہ کر کے جواب دوں گا۔

جس روز دہلی میں مسٹر جناح سے گفتگو کر رہا تھا اُسی وزمہ وقت کی گفتگو جمعیتہ العلماء کے حضرات سے بھی تھی۔ تفصیلات تو مجھے معلوم نہیں لیکن نتیجہ یہ ضرور ہوا کہ ۱۹۳۷ء کے انتخاب میں جمعیتہ العلماء، مسلم لیگ اور کانگریس متفق ہو کر میدان میں آ گئے۔ یو۔پی میں مقابلہ نیشنل ایگریکلچرل پارٹی سے تھا۔

دوستوں سے مشاورت کے بعد میں نے مسٹر جناح سے معذوری کا اظہار کیا کہ میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کھڑا نہ ہوں گا۔ لیکن میری اس غلطی سے کہ میں نے فوراً انکار نہ کیا میری پارٹی کے ہندو ممبران پر بُرا اثر ہوا۔ لارڈ ہیلی نے مجھ سے کہا کہ سر جے۔ پی سریواستوا نے اُن سے اس کی شکایت کی اور آخرکار ہماری پارٹی کے دو حصے ہو گئے۔ ہندو حصہ کا لیڈر رہے جے۔ پی اور مسلمان حصہ کے لیڈر نواب یوسف۔ مگر میں پوری پارٹی کا پریسیڈنٹ۔

الکشن کی تیاریاں شروع ہو گئیں مگر ہماری پارٹی میں اب ہندو مسلم تفرقہ جو پہلے کبھی نہ تھی پیدا ہونے لگی۔ یہ محتاج بیان نہیں کہ اس تفرقے سے کتنی کمزوری پیدا ہو گئی۔

۱۹۳۷ء الکشن

الکشن نے زور پکڑا لیکن ہماری پارٹی میں کوئی جوش نہ تھا۔ اس لئے کہ ہمارے ممبروں میں سیاسی شعور کی بیحد کمی تھی۔ وہ اپنے پاؤں پر کھڑے نہ ہو سکے تھے۔ چنانچہ سب سے پہلے الکشن کے واسطے فنڈ جمع کرنے کا مسئلہ سامنے آیا تو اودھ کے تعلقداروں کی یہ خواہش ہوئی کہ اُن کا فنڈ الگ ہو۔ اس خواہش کا دل میں پیدا ہونا بجائے خود اس کا ثبوت ہے کہ زمینداروں میں سیاسی شعور کا فقدان تھا۔ اُن کی نظر فقط یہاں تک پہونچی کہ چونکہ وہ

ہیں بڑی بڑی ریاستیں تھیں تو وہ زیادہ روپیہ جمع کر سکیں گے لہذا وہ فنڈ اودھ کے واسطے مخصوص رکھا جائے لیکن اس طرف خیال نہ کیا کہ آگرہ میں نشستیں زیادہ ہیں۔ اس لئے الکشن میں فتح کا انحصار صوبہ آگرہ پر بمقابلہ اودھ کے زیادہ ہے۔

فنڈ کے جمع کرنے میں یہ صاف ظاہر ہوگیا کہ زمیندار یہ سمجھ ہی نہیں سکتا تھا کہ جمہوریت کیا چیز ہے اور پارلیمینٹ طرز کی گورنمنٹ کے کیا معنی ہیں۔ وہ اب بھی کلکٹر، کمشنر اور گورنر کی طرف دیکھتا تھا۔ کسی اور طرف توجہ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ یہ سمجھ ہی نہیں سکتا تھا کہ اصلی طاقت کا مرکز بدل گیا اور اب حکومت برٹش افسروں کی حکومت کے بجائے منتخب شدہ لوگوں کے ہاتھ میں ہوگی۔ چنانچہ صوبہ اودھ میں شاید پچاس ہزار روپیہ اور صوبہ آگرہ میں اونتیس ۲۹ ہزار روپیہ فنڈ میں جمع ہوسکا۔ اس اونتیس ہزار کی تفصیل یہ ہے کہ دس ہزار میرا تھا اور اسی قدر نواب سر فضل اللہ خاں مرحوم مغفور کی رقم تھی اور ڈھائی ہزار راجہ صاحب تروا آنجہانی نے دیا تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ زمینداروں میں کوئی جوش نہ تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے ایک صاحبِ دولت زمیندار کو خط لکھا اور خواہش کی کہ وہ چندہ دیکر پارٹی کی مدد کریں انہوں نے صرف پچاس روپیہ کی رقم بھیجی تھی۔ یہ اس وقت یاد نہیں کہ میں نے وہ رقم واپس کی یا نہیں۔ اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ زمیندار کی نظر میں اس انتخاب کی کیا اہمیت تھی۔

علاوہ ازیں زمیندار پارٹی کے رہنما اور لیڈر یہ تصور ہی نہیں کرتے تھے کہ وہ الکشن ہار بھی سکتے ہیں مجھے یاد ہے نواب یوسف مرحوم کا خیال تھا کہ کانگریس کو دس پندرہ فیصد سے زیادہ کامیابی الکشن میں نہ ہوگی سر جے پی سریواستوا اس سے کچھ زیادہ خیال کرتے تھے۔ میرا خیال تھا کہ چالیس فیصدی نشست کانگریس لے لے تو کوئی تعجب نہیں لیکن کانگریس کی اکثریت

ہونے کا گمان کسی کو نہ تھا۔ اس خود اعتمادی نے ایک عجیب خرابی زمیندارا پارٹی میں پیدا کر دی۔ بجائے اس کوشش کے کہ پارٹی کا ممبر کامیاب ہو اور جسے پارٹی نے ٹکٹ دیا اس کی مدد کی جائے لیڈر اس کی کوشش کرتے تھے کہ ٹکٹ ایسے شخص کو ملے کہ جو اُن کے گروپ کا ہو اور جہاں پارٹی نے کسی ایسے شخص کو کھڑا کیا جو اُن کے گروپ کا نہ تھا وہاں دوسرا اُمیدوار کھڑا کر دیا گیا اور در پردہ اس کی مدد شروع کر دی گئی۔

علی گڑھ میں زمیندار پارٹی کے اُمیدوار کے خلاف راجہ مان سنگھ رئیس لاکھنو کے صاحبزادے رام سنگھ کھڑے ہوئے اتفاق سے راجہ صاحب آنجہانی سے میری دوستی تھی میں نے اُنہیں بلا یا اور کہا کہ اگر تمہاری خواہش تھی تو تم نے کیوں نہ کہا۔ پارلیمنٹ بورڈ تم ہی کو ٹکٹ دیتا۔ تو اُنہوں نے مجھ سے کہا کہ اُن کی خواہش نہ تھی مگر ایک وزیر کے حکم سے یہ کھڑے ہو گئے۔ میں ممنون ہوں کہ میرے کہنے سے اُنہوں نے نام واپس لے لیا۔

ایسی مثالیں اور بھی ہیں۔ مثلاً رانی صاحبہ کرو ار کے مقابلہ میں ایک دوسرے تعلقدار کی بیوی کھڑی کر دی گئیں اور دونوں ناکامیاب رہیں۔

انہیں دنوں میں لکھنؤ گیا تھا۔ سر ہیری ھیگ گورنر تھے شام کو اُن سے ملاقات ہوئی۔ گورنر نے دریافت کیا کہ میری رائے میں اسمبلی کی نامزدگی کی تاریخ اور انتخاب کی تاریخ میں زیادہ فاصلہ رکھا جائے یا کم۔ گورنر نے یہ بھی کہا کہ اُن کے منسٹروں کی رائے یہ تھی کہ زیادہ زمانہ درمیان میں ہونا چاہیئے اس لئے کہ اُن کی پارٹی ایک نئی پارٹی ہے اس کو زیادہ وقت چاہیئے تا کہ رائے دہندگان کو منظم کر سکے اور پولنگ پر پہونچا سکے میں نے اس رائے سے بکسر اختلاف کیا۔ میں نے کہا کہ زمینداروں کے اثرات تو دیرینہ اور موروثی ہیں وہ اثرات ذاتی ہیں وہ آج بھی اتنے ہی ہیں جتنے چند ہفتوں بعد ہونگے۔ ہاں اگر نامزدگی اور انتخاب کے درمیان

زیادہ وقت دیا گیا تو اس کا امکان ہے کہ ایک منظم جماعت کو ہمارے ذاتی اور خاندانی اثرات کو مٹانے کا زیادہ موقعہ ملے۔ سرہیری ہیگ متذبذب ہو گئے۔ جب میں کمرے سے باہر آیا تو اے۔ ڈی۔ سی کے کمرے میں یو۔ پی کی پوری گورنمنٹ منتظر تھی۔ یعنی سر جے۔ پی سریواستوا۔ نواب یوسف۔ سر مہاراج سنگھ اور فنانس منسٹر جہاں تک مجھے یاد ہے سر جوزف کلے) کی میٹنگ ہونے والی تھی تاکہ انتخاب کی تاریخ کا تقرر کیا جائے۔ میں نے وزراء سے کہہ دیا کہ میرے خیال میں اُن کی رائے غلط ہے اور نامزدگی اور انتخاب کے درمیان زیادہ زمانہ زمیندار پارٹی کے واسطے مفید نہ ہوگا۔ لیکن اس کو قابل قبول نہ سمجھا گیا۔ جہاں تک یاد ہے نامزدگی اور انتخاب کے درمیان چھ سات ہفتے کا وقت رکھا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اور صوبوں کے نتائج اخباروں نے طبع کئے ہر جگہ سے کانگریس کی کامیابی کی خبریں آئیں۔ دوسرے صوبوں سے فارغ ہو کر وہاں کے کارکنان بھی سب یو۔ پی آ گئے جداگانہ انتخاب تھا مسلمانوں میں تو مسلم لیگ کو کامیابی نہ ہوئی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی کتاب (India wins freedom) میں لکھا ہے کہ چھبیس نشست مسلم لیگ کی ہوئیں۔ مجھے سولہ یاد تھیں بہرحال چھیاسٹھ مسلمانوں کی نشستیں تھیں۔ ان میں کثریت ہماری پارٹی کی رہی۔ لیکن ہندو ممبران میں آٹھ نو سے زیادہ ممبر ہماری پارٹی کے نہ آسکے اور ایک سو چھبیس یا ایک سو اٹھائیس کانگریس کے آئے۔ کانپور سے لیڈی سریواستوا کھڑی ہوئیں مگر کامیاب نہ ہوسکیں۔

یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ اگر زمینداروں میں اتفاق ہوتا اور پارٹی میں یکجہتی ہوتی تو زمیندار یہ انتخاب جیت جاتے البتہ اس کا یقین ہے کہ اس بُری طرح ہندو سیٹیں نہ ہارتے۔

اصل وجہ یہ ہے کہ زمیندار پارٹی کے پروگرام میں کاشتکار کے

واسطے اتنا نہ تھا جتنا کانگریس کے پروگرام ہیں۔ اور ہو بھی نہیں سکتا تھا اس وجہ سے کہ خود قربانی پر تیار ہونا مشکل ہے لیکن دوسرے کو قربان کر دینا آسان ہے۔

سر ہیری ہیگ

سر ہیری ہیگ۔ سر مالکم ہیلی کے بعد یو۔پی کے گورنر ہوئے۔ یہ گورنمنٹ آف انڈیا میں ہوم سیکرٹیری اور ہوم ممبر بھی رہے تھے۔ وہ سیکرٹیری یا ممبر گورنمنٹ کی حیثیت سے کتنے ہی کامیاب ہوں مگر گورنر کی حیثیت سے کچھ کامیاب نہ تھے گورنر اور سکرٹیری یا ممبر کابینہ کے نوعیت کار ذرا مختلف ہیں۔ اس زمانہ میں گورنر کو انتظامی اختیارات بہت تھے بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ جملہ اختیارات کا سرچشمہ گورنر ہی ہوتا تھا۔ سکرٹیری کا کام یہ ہے کہ وہ مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈال دے۔ ممبر گورنمنٹ جس حد تک اسے اختیار ہے فیصلہ کرے لیکن اہم مسائل تمام گورنر کے فیصلہ کے محتاج ہوتے تھے۔ لہذا گورنر میں قوت فیصلہ اور اصابت رائے کا ہونا ضروری تھا۔ سر ہیری میں ان چیزوں کی کمی تھی۔ سر سی۔ وائی چنتامنی کہا کرتے کہ

"When ever I went to see sir Melcom Hailiy I come out a wiser man, when ever I went to see Mr. Harry Haig I left him a wiser man."

راجہ سر مہاراج سنگھ

سر مہاراج سنگھ میرے بڑے پرانے دوست تھے۔ میرے چچا نواب یوسف علی خاں مرحوم اور ان کے والد راجہ ہرنام سنگھ کے بہت مخلصانہ تعلقات تھے۔ اسی وجہ سے جب سر مہاراج سنگھ آنجہانی ڈپٹی کلکٹر ہو کر علی گڑھ آئے تو میرے چچا کے پاس کوٹھی چندر نیاں میں رہے یہ اُن کا پہلا پوسٹنگ تھا اور یہیں پہلی بار میں اُن سے ملا تھا۔ ڈپٹی کلکٹری تو بس سلسلہ ملازمت شروع کرنے کے واسطے تھی وہ سکریٹری ہوئے کمشنر ہوئے۔ جنوبی افریقہ میں ہندوستان کی طرف سے ایجنٹ ہو کر گئے۔ یو۔پی میں ہوم ممبر ہوئے اور آزادی کے بعد بمبئی کے گورنر ہوئے۔

ہیرو میں اسکول کی تعلیم کے بعد آکسفورڈ میں تعلیم کی تکمیل کی تھی۔ بڑے دور اندیش مدبر تھے۔ تقریر بہت اچھی کرتے تھے۔ جس جلسہ میں بیٹھ کر باتیں کرتے تمام سامعین مسحور ہو جاتے۔ سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ راجہ سر مہاراج سنگھ میں ایک جانب یورپین تہذیب کے بہترین صفات موجود تھے اور دوسری طرف پرانی قدروں کا احترام کامل پایا جاتا تھا۔ ہندوستانی تہذیب و اخلاق۔ مروت و محبت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ ٹینس بہت اچھا کھیلتے تھے اور اپنے زمانہ میں اس ملک کے اچھے کھلاڑیوں میں سے تھے۔ ایک عجیب فن انہیں آتا تھا۔ جس کا مظاہرہ کبھی کبھی لطف و صحبت کے سلسلہ میں کرتے وہ گڑیا سے باتیں کرتے سوال اپنی قدرتی آواز میں کرتے اور جواب گڑیا دیتی اُس کے لبوں کو حرکت ہوتی اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ آواز گڑیا کے منہ سے آ رہی ہے۔ مجھ پر خاص طور سے عنایت فرماتے تھے اُن کی وفات سے ہندوستان کا ایک یگانہ فرزند گم ہو گیا۔

اس زمانہ میں دو عجیب واقعات پیش آئے (اس انتخاب میں نامزدگی کے روز میں بلند شہر جانے لگا تو میری رفیقۂ حیات نے کہا کہ تم منتخب ہو جاؤ گے میں اس یقین کی وجہ دریافت کی تو انہوں نے کہا کہ اسی شب انہوں نے خواب میں دیکھا کہ میں ہاتھی پر سوار ہوں اور چیل جیسے پرند جھپٹتے ہیں مگر جب میرے پاس آتے ہیں تو کٹ کر گر جاتے ہیں بلند شہر میں میرے مقابلہ میں ایک پٹھان صاحب کی نامزدگی مسلم لیگ کی طرف سے ہوئی مگر انہوں نے دوسرے روز اپنا نام واپس لے لیا۔ میں بغیر مقابلہ منتخب ہو گیا)۔

دوران انتخاب میں تحصیل کھیر کے رہنے والے ایک جیوتشی (جن کا انتقال ہو گیا) میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ اُن کے بچار سے تو پہلا چیف منسٹر یو۔پی کا مجھے ہونا چاہئے انتخاب کے نتائج نکلتے ہی وہ پھر آئے۔ میں نے دیکھتے ہی کہا کہ "واہ پنڈت جی" آپ کا بچار بھی خوب ہے آپ نے کہا تھا کہ میں چیف منسٹر ہونگا۔ ہماری پارٹی الکشن ہار گئی۔ وہ کہنے لگے کہ میں اسی وجہ سے آیا ہوں میرے بچار سے اب بھی پہلے چیف منسٹر آپ ہی ہونگے انتخاب کوئی جیتے۔ گو مجھے اس پر یقین نہ تھا مگر حالات نے ایسا مجبور کیا کہ ہوا ایسا ہی۔

ہمارے خاندان کے قبرستان میں ایک نابینا حافظ شبیر علی رہا کرتے تھے انتخاب کے نتائج ظاہر ہو چکے تھے حافظ جی مجھے ایک روز چھتاری میں ملے اور مبارکباد دینے لگے۔ میں نے ہنس کر کہا "حافظ جی خبر بھی ہے ہماری پارٹی انتخاب ہار گئی اور کانگریس کی اکثریت ہو گئی" انہوں نے ایک آیت پڑھی کہ خدا کے حکم سے اقلیت کبھی اکثریت پر غالب آجاتی ہے۔

کانگریس اور برٹش حکومت میں گفت وشنید

کانگریس کو گورنر کے خاص اختیارات سے کہ وہ انتہائی اہم صورت میں انتظام اپنے ہاتھ میں لے سکتا ہے اختلاف تھا۔ گورنر خلاف قانون کوئی وعدہ نہیں کر سکتے تھے۔ لہذا گفتگو گورنمنٹ آف انڈیا اور کانگریس کے درمیان شروع ہوئی اور وایسرائے نے کانگریس کو یقین دلایا کہ گورنر روزانہ انتظام میں مداخلت نہ کریں گے۔ اس کے بعد کانگریس نے حکومت ہاتھ میں لی۔ مگر اس دوران میں کافی عرصہ لگا تقریباً تین ساڑھے تین ماہ صرف ہوئے۔

یو۔پی کی پہلی وزارت کی دعوت

چھتاری میں تار ملا کہ گورنر ملنا چاہتے ہیں اس لئے کانپور پہنچوں۔ میں کانپور گیا۔ اسٹیشن پر کلکٹر کانپور (کوئی یورپین تھا) مجھے ملا۔ موٹر تیار تھا۔ لکھنؤ کی سڑک پر روانہ ہوگیا۔ پروگرام عجیب تھا۔ بعد ڈنر گورنر لکھنؤ سے چلیں گے اور میں اجگین کے اسٹیشن کے سامنے جہاں اسٹیشن کی سڑک ملتی ہے۔ وہاں انتظار کروں اور ان کے ساتھ کانپور آؤں۔ چنانچہ گورنر کا موٹر آیا میں ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔

معلوم ہوا کہ کانگریس نے گورنمنٹ بنانے سے انکار کیا اور اس واسطے سرچیری ہیگ نے مجھے بلایا تھا۔ میں نے جواباً غور کیا کہ بغیر اکثریت کے میں کیسے گورنمنٹ بناؤں۔ سرچیری ہیگ اس پر زور دیتے تھے کہ گورنر کی حکومت سے یہ بہتر ہے کہ منتخب شدہ لوگوں کی حکومت ہو۔ لیکن میرا خیال یہ ہے کہ وہ گورنمنٹ ہند کے حکم کی تعمیل کر رہے تھے اور منشاء یہ تھا

کہ اس طرح کانگریس پر زور پڑ رہا کہ وہ حکومت قبول کر لے۔ میں اس صورت سے متفق نہ تھا۔ آخر یہ طے پایا کہ میں اپنی پارٹی کے لوگوں اور جو اس وقت وزراء تھے یعنی سر جے۔ پی سریواستوا اور نواب یوسف سے مشورہ کر کے جواب دوں۔ واپس آکر وہی ایک روز بعد لکھنؤ گیا۔ پارٹی کے لوگ اور وزراء سے مشاورت شروع ہوئی۔ یاد نہیں کہ پارٹی کے ممبروں نے کوئی خاص رہنمائی کی ہو۔ مگر بائیس تئیس برس بعد کچھ ایسا یاد ہے کہ پارٹی کے ممبروں کا یہ خیال تھا کہ کانگریس حکومت بنانا منظور نہیں کرے گی اور گورنر کی حکومت ہوگی اس لئے اپنی حکومت بنائی جائے وزراء سے برابر مشاورت ہوئی۔ وہ حضرات بھی کوئی رائے قائم نہ کر سکے۔ میرے سامنے اصل سوال یہ تھا کہ اگر اکثریت اسمبلی میں کسی گورنمنٹ کی نہ ہو تو پھر وہ کوئی قانون کیسے بنائے گی نتیجہ یہ ہوگا کہ یا کانگریس غیر اعتماد کا ووٹ پاس کریگی یا یہ بھی ممکن ہے کہ وہ غیر اعتماد کی تحریک پھر روز نہ لائیں لیکن جو تجویز بھی قانون ساز جماعت میں حکومت پیش کرے اُسے اپنی اکثریت سے مسخ اور مہمل کر دیں۔ قیصر باغ بارہ دری میں اپنی پارٹی کے ممبروں کی ایک میٹنگ بھی ہوئی مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

وزراء میں نواب محمد یوسف کسی ایک جانب اپنے خیالات کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ گورنر برابر مصر تھے کہ میں حکومت بناؤں۔ اسی خلجان میں ایک روز میں سر جے۔ پی سریواستوا کے مکان پر جو بنارسی باغ کے قریب تھا گیا فقط میں اور وہ تھے اسی مسئلہ پر گفتگو ہوئی۔ میں نے اس خیال کا اظہار کیا ایسے حالات میں ہمیں حکومت نہیں بنانا چاہئے۔ میں اس یقین کے ساتھ واپس آیا کہ انہیں میری رائے سے اتفاق ہے جہاں تک مجھے یاد ہے دوسرے روز شام تک مجھے سر ہیری ہیگ کو قطعی جواب دینا تھا۔ جس روز شام کو مجھے سر ہیری کو جواب دینا تھا۔ چار بجے

کے قریب شملہ سے ایک ٹیلیفون آیا۔ سر جگدیش پرشاد اس طرف ٹیلیفون
پر تھے۔ انہوں نے کہا کہ تم کیوں پس و پیش کر رہے ہو۔ تم حکومت بننے کو
روک نہیں سکتے۔ اسی روز لنچ کے بعد سر جے۔ پی اور نواب محمد یوسف نے
گورنر سے کہا کہ اگر میں انکار کرتا ہوں تو وہ حکومت بنائیں گے۔ مجھے اس
سے تکلیف ہوئی اور شاید اسی کا ردِ عمل تھا کہ میں نے تمام کو اسے قبول
کر لیا کہ عارضی حکومت بنائی جائے۔ میں نے گورنر سے کہہ دیا کہ میں تیار ہوں
اب حکومت بنانے کی تیاری شروع ہوئی۔

دورانِ الکشن میں ایک روز عثمانی صاحب جو لکھنؤ میں وکالت
کرتے تھے بہت بااثر اور دوست نواز تھے۔ ملنے آئے تھے اور کہا تھا کہ
چودھری خلیق الزماں صاحب جو میرے بھی دوست تھے مجھ سے ملنا چاہتے
تھے۔ ملاقات ہوئی اور میں نے اُن سے وعدہ کیا کہ اگر نیشنل ایگریکلچرل
پارٹی کامیاب ہوتی ہے تو میں کوشش کرونگا کہ مسلم لیگ اور میری پارٹی
ملکر حکومت بنائیں۔ گو مجھے یقین تھا کہ ان حالات میں جبکہ میری پارٹی
انتخاب ہار گئی تھی چودھری خلیق الزماں صاحب حکومت میں شرکت
نہ کریں گے لیکن کچھ تو اس خیال سے کہ مجھے وعدہ پورا کرنا تھا اور کچھ اس
وجہ سے کہ اگر وہ راضی ہوگئے تو مسلم لیگ کے ممبر بھی شریک ہوجائیں گے
میں اُن سے ملا۔ میرے خیال کے مطابق اُنہوں نے حکومت میں شرکت
قبول نہ کی۔

سنہ ۱۹۳۶ء کی یو۔پی کی گورنمنٹ کے ممبر

اب میں نے خود گورنمنٹ بنانے کی کوشش کی۔ سر جے۔ پی سریواستوا
اور نواب سر محمد یوسف تو پہلے ہی سے موجود تھے۔ جدید ممبران کی تلاش

میں بڑی دقت یہ تھی کہ میری پارٹی میں انتخاب کے نتائج کی بدولت ہندو ممبران بہت کم تھے۔ سات آٹھ سے زیادہ اُن کی تعداد نہ تھی باقی تمام مسلمان ممبر تھے۔ صوبہ میں ہندو اکثریت کا لحاظ رکھتے ہوئے میں نے سات آدمیوں کا کابینہ بنایا۔ میں نے راجہ سلیم پور کو جو مسلم لیگ یو۔پی کے پریزیڈنٹ تھے دعوت دی وہ شریک ہو گئے۔ ممبران حکومت حسب ذیل تھے۔

احمد سعید۔ سرجے۔ پی سریواستوا۔ نواب محمد یوسف۔ راجہ مہیشر دیال سیٹھ۔ راجہ صاحب سلیم پور۔ راجہ نرووا۔ مہاراج کنوار وزیا نگرم۔

راجہ درگا نرائن نرووا کے لینے میں ایک واقعہ ہوا۔ جب میں حکومت بنا رہا تھا تو سہ پہر کو فون آیا راجہ نرووا میرے پاس بیٹھے تھے۔ سرجے۔ پی سریواستوا دوسری طرف سے باتیں کر رہے تھے۔ اُنہوں نے پوچھا کیا میں راجہ نرووا کو گورنمنٹ میں لے رہا ہوں۔ میں نے کہا جی ہاں۔ سرجے۔ پی نے کہا کہ اگر آپ اُنہیں لیں گے تو پھر میں شریک نہ ہو سکوں گا۔ میں نے کہا کہ میں تو چاہتا ہوں کہ آپ اور وہ دونوں شریک ہوں میں راجہ سے کہہ چکا ہوں اُنہیں تو لینا ہی ہے مگر پھر سرجے۔ پی راضی ہو گئے۔ مگر راجہ نرووا نے یہ گفتگو چونکہ خود سنی تھی وہ بہت برہم ہوئے۔

عارضی حکومت یو۔پی

یو۔پی میں عارضی حکومت میں نے بنائی۔ یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ ایسی حکومت کا بنانا درست تھا یا نہیں۔ اس میں اختلاف رائے ممکن ہے۔ لیکن اس سے انکار مشکل ہے کہ ایک ایسی حکومت سے جو تمام تر ملازمین سرکار کے اختیار میں ہو خاص کر ایسی صورت میں کہ ملازمین حکومت

کا فعال حصہ بدلیشی ہو وہ حکومت بہتر ہے جس میں جنتا کے نمایندے برسر اقتدار ہوں ظاہر ہے ان کو عوام الناس یا جنتا سے وہ تعلق اور قلبی لگاؤ نہیں ہو سکتا جو یو۔پی کے اُس باشندے کو ہوگا جو انتخاب کے ذریعے آیا ہو۔

تین اپریل ۱۹۳۷ء کو ہم لوگوں نے وزارت اور راز داری کا حلف لیا۔ میں نے حسب ذیل بیان شائع کیا۔

Statement Issued by the Nawab of Chhatari, Chief Minister, U. P.

"Unforeseen and very unusual circumstances have placed me in a most difficult position. The majority party in the legislature, whose natural right according to the verdict of the people was to run administration of the province, having declined to do so, it has fallen to the lot of those who belong to the minority to try to run the administration. I believe in working the constitution for what it is worth and in securing the maximum benefit out of it for our people who are looking forward to the betterment of their present condition."

"The other alternative was the suspension of the Constitution and a complete bureaucratic Government. I know that situated as we are, we cannot do much; still I think something can be done for the masses. For this reason I took this responsibility."

"I wish, however, to assure the people of these provinces that till such time as some solution is found for the present impasse my colleagues and I will try and run the administration impartially without fear or favour in the interest of all."

اس طرف ہم نے اُن لوگوں کو جو کانگریس اور مسلم لیگ میں نہ تھے قیصر باغ بارہ دری میں بلا کر یونائیٹڈ پارٹی کی بنیاد ڈالی۔ دوسری جانب کانگریس نے اپنی پارٹی اور غیر پارٹی کے لوگوں کو بلا کر ایک میٹنگ کی۔ شری گوبند بلبھ پنتھ نے مجھے بھی اس میں مدعو کیا۔ میں نے جواب میں پنتھ جی کو یہ لکھا کہ میں اپنے بیانات میں یہ کہہ چکا ہوں کہ حکومت بنانا آپ کا حق بھی ہے اور فرض بھی۔ جس وقت آپ یہ فیصلہ کر لیں کہ کانگریس حکومت چلانے کو تیار ہے۔ میں استعفیٰ دیدونگا۔

دس مئی کو پرشوتم داس ٹنڈن نے جو کانگریس کی میٹنگ کے پریسیڈنٹ تھے مجھے اس قرارداد کی نقل بھیجی جس میں کانگریس اور مسلم لیگ کے ممبروں نے ملکر یہ کہا تھا کہ میری وزارت پر اکثریت کو بھروسہ نہیں ہے۔ یہ پرستاؤ یا قرارداد پنڈت گوبند بلبھ پنتھ نے پیش کی اور چودھری خلیق الزماں نے اس کی تائید کی۔ میں نے اسے وضاحت سے اس واسطے بیان کیا ہے کہ اس وقت تک مسلم لیگ اور کانگریس بالکل ایک تھے۔

ہمارا جواب ظاہر ہے یہ تھا کہ ہمیں اس کا دعویٰ نہیں ہے کہ کونسل میں اکثریت ہماری ہے کانگریس آئے اور حکومت کو ہاتھ میں لے۔

اب مجھے اور دوسرے وزراء کو یہ فکر ہوئی کہ اس سے قبل کہ نئی کونسل طلب کی جائے۔ اصلاحات کی تجاویز مرتب کر لی جائیں۔ ظاہر ہے کہ کونسل میں اکثریت نہ ہونے کی وجہ سے بڑی اصلاحات نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن ایک اصلاحی پروگرام بنا سکتے تھے اور انتظامی احکامات کی رو سے چھوٹی موٹی اصلاحات کر سکتے تھے۔ چنانچہ گورنمنٹ نے یہ طے کیا کہ گرمیوں میں حکومت پہاڑ پر نہ جائے۔

راجہ جیشور دیال آسنہانی نے جو وزیر مالگذاری و زراعت تھے ایک نوٹ پیش کیا جس میں کاشتکاروں کو حق موروثی اور دوسرے حقوق

مثلاً مکان بنانے کا حق دینے کی تجاویز ہیں۔ میں نے اس میں یہ بھی اضافہ کیا کہ گورنمنٹ کاشتکار کو اس میں مدد دے کہ یہ رضامندی وہ زمیندار سے زمین خرید کر مالک بن سکے۔ میرے نوٹ کا اقتباس حسب ذیل ہے اس سے قبل ۱۹۳۲ء میں بھی میں نے سر مالکم ہیلی کو ایک نوٹ لکھ کر دیا تھا جس میں یہی تجویز تھی۔

I may repeat what I said before, that if the conditions prevailing in the Province are to be regarded as normal, then I do not think there is any need of introducing a policy of radical change, as my proposal about land purchase is; but if we come to the conclusion that the conditions are not normal, that great and tremendous changes are taking place in the mind of the masses and in other countries when such conditions begin to work up the mind of the people minor changes never satisfied them, then I think we should make up our mind for a big change and should try to surmount such difficulties as may be in our way. It has often struck many of us that we should be given minor concessions to the tenantry in the form of hereditary rights, rights to build houses, etc. etc. Nobody will be happier than myself if by giving such concessions we shall be able to keep our tenants away from the revolutionary mentality which is being created. The real question, however, is: shall we be able to achieve that object by giving these minor concessions? Those who are in favour of such changes will say "Yes" Those who are sceptical will express their doubts, because nobody can be certain about the future; but there is one test which will decide once

for all." Are the tenants who enjoy these rights in the Province fully satisfied." This makes the position quite clear. It is human nature—the more you give the more you are asked for, unless you give all. Therefore, we shall have to give full satisfaction to the tenantry. Any tinkering with the grave question may create dissatisfied Zamindars but will not create satisfied tenantry.

میرے اس نوٹ پر سر ہیری ہیگ نے جو گورنر تھے حسب ذیل نوٹ لکھکر وزراء میں گشت کرایا۔

Note by His Excellency on Land Purchase

I have read these papers with great interest. I have no wish at the present stage to express any opinion on the merits of a problem which obviously involves the most complicated considerations. But with regard to the general outlook on tenancy problems, discussed in the Hon'ble Premier's note of 2nd June, I should like to make certain observations for the consideration of Hon'ble Ministers, and should be glad therefore if this note of mine could be circulated together with other papers.

2. When this proposal for land purchase was placed before Lord Hailey in 1932, supported by arguments very similar to those used by the Hon'ble Premier in his note of 2nd June, Lord Hailey noted as follows: –

"It is true, as was reperesented to us in the course of our interviews with the Taluqdars in the winter, that the grant of occupancy rights has not necessarily brought such contentment to tenants as to remove them from a desire for agitations against

landowners. Some of the Taluqdars took this point in arguing against a further extension of the occupancy rights. But I myself would ask rather whether the tenants have genuine complaint on which outsiders can seize as an excuse of promoting political agitation against the landowners ? If so. then probably it would be wiser to attempt to remove this cause of trouble than to allow it to subsist as a potential source of danger to the landlords and to the peace of the Province. It is a comparison of disadvantages. If the cause of complaint is real, the danger of allowing it to exist would probably outweigh in the long run any disadvantages derived from weakening the authority of landlords over tenants."

My own outlook on these tenancy problems is precisely the same as that of Lord Hailey. We can not expect any Legislative measures to produce universal contentment and loyalty among the agricultural population. But I suggest that it is a matter of great importance, particulary at the present time, not to allow patent and obvious grievances to continue, for I regard it as certain that if they do continue, they will before long be made the basis of a really dangerous agitation. If we could avoid serious grounds for discontent among the agricultural population, we shall, in my judgment, have achieved a great deal.

3. There is one another point which I feel ought to be brought out. It is, I think, assumed by the Hon'ble Premier that the policy which he advocates

will give full satisfaction to the tenants, and that on becoming proprietors they will become contented and loyal. I think the history of recent years shows clearly that assumption cannot be made. If I were to ask myself what is the area in which in the last ten years the most serious agrarian agitation has developed and the most extreme disloyalty has been shown, I should have no hesitation in answering that it was Bardoli and in the Bombay presidency, and Bardoli is an area of peasant proprietors. The Government in such cases is dealing directly with the peasant proprietors, and some would hold that the likelihood of a serious conflict is greater under those conditions than it is under the Zamindari with which we are familiar.

سر ہیری ہیگ کے نوٹ میں جس ۱۹۳۲ء کی تجویز کی طرف اشارہ ہے وہ بھی میرا ہی نوٹ تھا۔ اس تجویز کے متعلق مسٹر بم فورڈ (سینیئر ممبر بورڈ مالگذاری) اور مسٹر وا (جو سر آرتھر وا ہوئے) اُن کے نوٹ ہیں۔ جس میں اس تجویز کو عملی جامہ دینے کی دشواریاں بیان کی گئی ہیں۔

گورنر کے اس نوٹ کے بعد میری تجویز کی کامیابی نہایت دشوار ہوگئی تاہم ہم لوگوں نے زمینداروں کی ایک میٹنگ کی۔ یہ میٹنگ میرے گھر پر ہوئی۔ نواب سر مزمل اللہ خاں مرحوم مہاراجہ جہانگیرآباد مرحوم اور دوسرے بہت سے زمیندار اور تعلقدار جمع ہوئے۔ انہیں حق موروثی بھی دینے سے اتفاق نہ تھا۔ کاشتکار کو زمیندار بنانے کا تو ذکر ہی کیا ہے۔

مجھے افسوس ضرور ہوا مگر تعجب ذرا بھی نہیں ہوا۔ دوسروں کو قربانی کا مشورہ دینا آسان ہے مگر خود قربانی دینا بہت مشکل ہے۔ اس واسطے زمیندار صاحبان کے طرز پر مجھے تعجب نہیں ہوا لیکن افسوس ضرور تھا اس

لئے کہ اُن کا مستقبل خود اس پر منحصر تھا کہ کاشتکار مطمئن ہے یا نہیں جمہوری طرز حکومت قدرتاً سوشلزم کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور جمہوریت تسلیم کرنے کے بعد یہ ضروری ہے کہ بڑے اور چھوٹے۔ امیر و غریب کاشتکار اور زمیندار۔ مزدور اور مالکان کارخانہ جات کے درمیان اقتصادی فرق کو کم کیا جائے۔ کوئی سیاسی پارٹی کیسے کامیاب ہو سکتی ہے۔ اگر پچھتر فیصدی دیہاتی رقبہ کے رائے دینے والے اس کے ساتھ نہ ہوں۔

برٹش افسران کو اس تجویز سے قلباً اتفاق نہ تھا۔ جس کی وجہ گورنر کے نوٹ کے آخری حصے سے صاف ظاہر ہے۔ اس لئے کہ پھر کاشتکار سے حکومت کا معاملہ براہِ راست ہوتا اور ایک بدیشی حکومت اس سے ہمیشہ بچنا چاہے گی۔ آج اپنی حکومت ہونے کے باوجود یہ دشواری ہمارے سامنے ہے۔ حال میں یو۔پی میں پچیس فیصدی لگان میں اضافہ کیا گیا لیکن کاشتکاروں میں بے چینی کا خیال کر کے اُسے چھوڑنا پڑا۔

بہرحال ایک کمیٹی بنائی گئی جو اس پر غور کرے کہ کاشتکار کو کیا مزید حقوق دئے جائیں نیز یہ کہ قرضہ کے بارے اُسے کس طرح سبکدوش کیا جائے۔

یہ ظاہر تھا کہ ایسی وزارت جس کو قانون ساز جماعت کو یعنی اسمبلی کی تائید حاصل نہ ہو ایسے دوررس اصلاحات کیسے کر سکتی تھی لیکن مجھے اس تجویز پر اصرار اس وجہ سے تھا کہ یہ تجویز زمیندار اور کاشتکار دونوں کے واسطے اس کے مقابلہ میں کہ جو آخر کار ہوا) کہیں زیادہ مفید تھی۔

اوّل کاشتکار کو لیجئے۔ میری تجویز سے کاشتکار معہ جملہ حقوق کے زمیندار ہو جاتا۔ اور جس وقت تک خریداری کا روپیہ ادا نہ ہوتا وہ اُتنا روپیہ گورنمنٹ کو دیتا جتنا کہ زمیندار کو دے رہا تھا لیکن مالگذاری کے حساب میں اُتنی ہی رقم لی جاتی جتنی کہ گاؤں کے پرتہ سے اُس کی زمین پر آتی اور باقی رقم گورنمنٹ کے قرضے میں منسوب ہوتی جو چند برس میں بیباق ہو جاتا

موجودہ قانون کے تحت ہوا کہ فرد کے بجائے حکومت زمیندار بن گئی زمیندار کے زمانہ میں لاکھوں روپیہ کی بقایا رہ جاتی تھی اب ایک پیسہ بقایا نہیں رہتی۔

بجائے ایک کمزور زمیندار کے ایک ایسا طاقتور زمیندار پیدا ہو گیا جس کے ہاتھ میں تمام قسم کی طاقتیں ہیں انتظامی طاقت۔ قانون سازی کی طاقت کلیتاً اس کے قبضہ میں اور عدالتیں اس کی ماتحت ہیں۔

دوسرے زمیندار کے نقطۂ نظر سے۔ میری تجویز سے تبدیلی تدریجی ہوتی ممکن ہے چار یا پانچ برس لگتے۔ زمینداروں کو نقد قیمت ملتی اور نئے حالات سے مطابقت کرنے اور نیا ذریعہ معاش بنانے کا موقعہ ملتا۔

ایسی بنیادی تبدیلی کو یک لخت دفعتاً کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیہات کے سماج کا انتظام تہ و بالا ہو گیا جرائم کی کثرت ہو گئی اور دیہاتی رقبہ میں ایسے عناصر پیدا ہو گئے جو سماج اور حکومت دونوں میں سے کسی کا احترام نہیں کرتے۔ یو۔ پی پولیس کمیشن کے سامنے افسران پولیس کا متفقہ خیال تھا کہ دیہاتی رقبے میں جرائم کی کثرت کی وجہ سب سے بڑی یہ ہے کہ زمینداری کے یکایک ختم ہو جانے سے جو خلا پیدا ہو گیا وہ پھر انہ جا سکا۔

دوسری عالمی جنگ سے پہلے کاشتکار بہت مقروض تھا۔ ہم نے ۱۱ر جولائی ۱۹۳۷ء میں غیر معمولی گزٹ کے ذریعہ ایک قانون کا مسودہ شائع کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ مصالحت باہمی کے واسطے افسران مقرر کئے جائیں جو سود کی شرح کو کم کرائیں اور کاشتکار کے لئے آسان قسطیں مقرر کرائیں۔

میں نے ایک دشواری اور محسوس کی۔ یہ پہلی گورنمنٹ جس میں تمام ممبر ہندوستانی تھے لیکن ہم سب یہ محسوس کرتے تھے کہ گورنر کے اختیارات ویسے ہی تھے جیسے ۱۹۳۵ء کے قانون سے پہلے ہوا کرتے تھے۔ اکثر گورنر خود گورنمنٹ کی میٹنگ کی صدارت کرتے اور میرے شرکائے کار اور ممبران کو

گورنر کی رائے کا خیال اور لحاظ اپنی طے شدہ پالیسی کے مقابلہ میں کہیں زیادہ کرتے تھے۔

میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ نئے قوانین تو وہی حکومت بنا سکتی ہے جس کی کونسل میں اکثریت ہو لیکن انتظامی اختیارات کا استعمال کر کے جو کچھ خدمت کیجا سکے کرنی چاہیئے۔ چنانچہ ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کی کیبنٹ کی میٹنگ میں یہ مسئلہ میں نے پیش کیا کہ آبیاشی کی شرح کو کم کر دیا جائے مالگذاری کے وزیر راجہ مہیشر دیال نے اس رائے سے اتفاق کیا۔ اس زمانہ میں اناج کے نرخ میں ارزانی تھی اور کاشتکار کو مدد کی ضرورت تھی۔

دوسری میری تجویز یہ تھی کہ جب ایک ہندوستانی حکومت قائم ہوگئی ہے تو جتنے سیاسی قیدی تھے یعنی جن کا فعل اخلاقی اعتبار سے جرم نہیں تھا اُن کو رہا کر دیا جائے۔ اگر وہ پھر قانون شکنی کے مرتکب ہونگے تو حکومت دوبارہ گرفتار کر سکتی ہے۔ منشاء یہ تھا کہ سیاسی طبقہ کے لوگوں کو اس کا احساس ہو کہ حکومت کی پالیسی میں اُمید افزا تبدیلی آئی اور گورنر کو میری تجویز سے غالباً اتفاق نہ تھا۔ مجھے اس کا اندازہ مہاراج کنوار وزیا نگرم (وزیر حکومت) کے خط مورخہ ۲۸ جون سے ہوا۔ جس خط میں انہوں نے لکھا تھا کہ گورنر سے اُن کی گفتگو ان دونوں تجاویز پر ہوئی۔ پھر اپنی رائے تحریر کی کہ وہ ان دونوں تجاویز کے خلاف تھے۔ چنانچہ جب گورنمنٹ کی میٹنگ میں یہ تجاویز پیش ہوئیں تو سر میری ہیگ کو تو اختلاف تھا ہی۔ دوسرے وزراء بھی سوا راجہ تروا اور سلیم پور کے علاوہ سب نے مخالفت کی اور یہ دونوں تجاویز ختم ہوگئیں۔

اخبار نویسی کا معیار

میں نینی تال گیا اور حسب عادت پنڈت گوبند بلبھ پنتھ آنجہانی سے بھی ملنے گیا۔ میں نے کبھی سیاسی اختلافات سے ذاتی تعلقات کو متاثر نہیں ہونے دیا۔ جمہوری حکومت کو کامیاب بنانے کے لئے ایسا کرنا ازبس ضروری ہے۔ ورنہ سیاسی اختلافات دشمنی کی حد تک پہنچ جاتے ہیں اور زندگی تلخ ہو جاتی ہے۔ ذاتی ناگواری اور مخالفت کے گرد و غبار کی وجہ سے بجا اور بے جا کی تمیز نہیں رہتی۔ دوسرے کی اچھی بات بھی بری معلوم ہونے لگتی ہے۔

لیڈر اخبار کے نمائندے کو یہ خبر ملی تو اس نے فوراً ایک کارٹون ۲۵ جون ۱۹۳۷ء کے اخبار میں شائع کیا جس میں مجھے زنانے کپڑوں میں دکھایا۔ گوبند بلبھ پنتھ آنجہانی سامنے بیٹھے ہیں اور سر ہیری ہیگ گورنر پس منظر میں حیرت سے مجھے دیکھ رہے ہیں۔ میں شراب کا جام لئے ہوئے رقص کناں پنتھ جی کی طرف جا رہا ہوں۔ مگر دوسرے ہی روز مسٹر سی۔ وائی چنتامنی نے حسب ذیل نوٹ لیڈر میں شائع کیا اور مجھے معافی کا خط بھی لکھا۔

We deeply regret the publication by inadvertance of the Cartoon that inserted in yesterday's Leader It did the grossest injustice to the Nawab of Chhatari. Most courteous among men and uncommonly tolerant of political differences, the Nawab Saheb has made it a rule of life never to fail in the social obligation of courtesy calls on friends, be they as poles as-under in matters political, and he himslef explained to a press interviewer there was no manner of political significance in his visit

to Mr. Pant at Nainital. That after this he should have been lampooned as he was in the said cartoon, and in the columns of the Leader, fills us with sadness and shame. we apologize to the Nawab Saheb for this unfairness and discourtesy to him never contemplated by us.

اخبار نویسی میں تنقید یا تعریف ہوتی ہی ہے لیکن اگر یہ یقین ہو جائے کہ اعتراض غلط تھا تو پھر اُسے تسلیم کرنے میں پس و پیش نہیں ہونا چاہئے۔ سر سی۔ وائی چنتامنی اب اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن اخبار نویسی اور سیاسی زندگی میں جو روایات اور جو اصول انہوں نے چھوڑے ہیں وہ یقیناً قابل تقلید ہیں وہ کبھی کسی مخالف کی کمزوری سے بیجا فائدہ نہیں اٹھاتے تھے اگر کوئی بات یہ صیغۂ راز آپ انہیں بتا دیں تو کبھی اس علم کو اپنی کسی تحریر یا تقریر میں آپ کے خلاف استعمال نہ کرتے تھے۔

اسی دوران میں کانگریس اور برٹش گورنمنٹ کے درمیان گفت و شنید کا سلسلہ جاری رہا۔ آخر جون میں ایک خط میں نے گورنر کو لکھا جس میں یہ بیان کرتے ہوئے کہ میرا حکومت بنانے پر راضی ہونا فقط اس وجہ سے تھا کہ کانگریس باوجود کونسل میں اکثریت کے حکومت بنانے سے انکار کر رہی تھی جس کا نتیجہ غیر ذمہ دار ملازمین سرکار کی حکومت ہوتی۔ میں نے گورنر کو مشورہ دیا کہ اب پھر ایک بار کانگریس کو دعوت دی جائے کہ وہ حکومت بنائیں۔ یہ خط جون ۱۹۳۷ء کی ۳۰ تاریخ کا ہے۔ جس کا اقتباس حسب ذیل ہے۔

Since then several statements have been issued by the Secretary of State and by the Governor's of the Provinces clarifying the constitutional position and explaining it to the majority party. On the other

side, Mahatma Gandhi has also issued several statements. In his last statement, according to the papers, he has said that the Congress is "being talked at instead of being talked to". The implication of this, to my mind, was that the Congress, on whose behalf he speaks, wished even then for another offer of office. Since then His Excellency the Viceroy has made a statement which, to my mind, makes the constitutional position absolutely clear, and there can be no valid ground now for the Congress to refuse office. I feel that the natural sequel to my statements about making room for the Congress is that I should now request your Excellency to give the majority party another chance to come in if they wish to do so. I hope, therefore, that your Excellency give them the opportunity now, and that in doing so your Excellency will assure them that the present Cabinet will make way for a majority party Ministry as soon as the latter is willing to function."

کچھ روز بعد واردھا میں ۵ جولائی کو کانگریس کی ورکنگ کمیٹی (عاملہ) کی میٹنگ ہوئی۔ اور اس میں یہ طے پایا کہ کانگریس کو حکومت بنانی چاہیے چنانچہ ہم لوگوں نے استعفے دیدیئے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے ۱۶ جولائی کو ہم لوگ سبکدوش ہوگئے اور کانگریس کی حکومت بن گئی۔

اس زمانہ میں ابن سعید خاں میرا بیٹا نصیب دشمناں علیل تھا اور میں نے پنتھ جی کو لکھا کہ ایک ہفتہ میں اسی مکان میں رہنا چاہتا ہوں انہوں نے خوشی سے اجازت دی۔ میں اُن کا شکریہ ادا کرنے ان کے پاس گیا اور میں نے اُن سے یہ بھی کہا کہ میں سُن رہا ہوں کہ کانگریس اور

مسلم لیگ ملکر حکومت بنائیں گے۔ میں اس پر آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔ آپکا یہ اقدام ملک کے واسطے فال نیک ہوگا۔ اور فرقہ وارانہ جھگڑوں کو ختم کردیگا میری پارٹی نے انتخاب میں مقابلہ کیا اور اب اسمبلی میں رہ کر میں مخالف پارٹی کے فرائض انجام دونگا۔ چنانچہ پہلا مخالف پارٹی کا لیڈر (Leader of apposition) میں ہوا۔

مسلم لیگ اور کانگریس میں کیوں اختلاف ہوا اور الکشن میں دوش بدوش رہنے کے باوجود حکومت بنانے میں کیوں یکجا نہ ہو سکے انکی تفصیلات کا علم براہ راست مجھے نہیں ہے مجھے نہ لیگ اور کانگریس دونوں مخالف خیال کرتے تھے اور راز و نیاز کے دائرہ سے میں اور میرے ساتھی بہت دور تھے۔

شعر:۔ زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں

میں چودہری خلیق الزماں کی کتاب (Pathway to Pakistan) اور مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی کتاب (India wins freedom) سے مدد لیکر اپنی یادداشت کو تازہ کررہا ہوں۔ ان دونوں حضرات کے بیان میں واقعات کی حد تک کوئی بڑا اختلاف نہیں ہے۔ ہاں اسباب و احوال مقصد و منشا کے متعلق اختلاف ہے۔ اور وہ لازمی تھا۔ مولانا مرحوم کانگریس کے چوٹی کے رہنما تھے اور ہندوستان میں کتاب لکھ رہے تھے۔ چودہری صاحب مسلم لیگ کے رہبر تھے اور پاکستان میں بیٹھ کر کتاب تصنیف کررہے تھے اور وہاں کے حالات سے متاثر تھے۔ لیکن یہ بات ہر دو حضرات کے بیان سے ثابت ہے کہ مسلم لیگ اپنے دو وزیر چاہتی تھی اور کانگریس ایک وزیر کی جگہ دینے پر راضی تھی۔ مولانا مرحوم کی کتاب (India wins freedom) کے صفحہ ۱۶۰ اور ۱۶۱ پر جو عبارت تھی اس کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

"چودہری خلیق الزماں اور نواب اسمٰعیل خاں اُس زمانہ میں مسلم لیگ

کے یو۔ پی میں لیڈر تھے جب میں گورنمنٹ بنانے لکھنؤ پہونچا تو میں نے ان دونوں سے گفتگو کی انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ وہ نہ صرف کانگریس کے ساتھ تعاون کریں گے بلکہ کانگریس کے پروگرام کی پوری تابعداری بھی کریں گے۔ وہ قدرتاً یہ امید کرتے تھے کہ نئی حکومت میں مسلم لیگ کا بھی کچھ حصہ ہو۔ مقامی حالت ایسی تھی کہ ان میں سے کوئی تنہا حکومت میں شریک نہیں ہو سکتا تھا یا دونوں ہوں یا ایک بھی نہ ہو۔ لہذا میں نے انہیں یہ امید دلائی کہ دونوں حکومت میں لے لئے جائیں گے اگر سات آدمیوں کی حکومت بنی تو دو مسلم لیگ اور باقی کانگریس کے ممبر ہوں گے اگر نو کا کابینہ بنا تو کانگریس کی اکثریت اور واضح ہوگی۔ بحث کے بعد ایک نوٹ لکھا گیا جس کا منشاء یہ تھا کہ مسلم لیگ پارٹی کانگریس کے ساتھ تعاون کرے گی اور کانگریس کا پروگرام منظور کرے گی۔ نواب اسماعیل خاں اور چودہری خلیق الزماں دونوں نے اس پر دستخط کئے"

اس کے بعد صفحہ ۱۶۱ پر مولانا نے لکھا ہے کہ بہار کی واپسی پر جب وہ الہ آباد آئے تو انہیں یہ معلوم ہو کر افسوس ہوا کہ پنڈت جواہر لال نے خلیق الزماں اور اسماعیل خاں کو یہ لکھ دیا کہ فقط ایک شخص مسلم لیگ کی طرف سے حکومت کی کابینہ میں لیا جائے گا۔ اور مسلم لیگ اسے طے کرے کہ وہ کون ہو اس پر مسلم لیگ نے شرکت سے انکار کر دیا خلیق الزماں صاحب نے اپنی نوشتہ کتاب میں یہ لکھا ہے کہ وہ ایک تہائی جگہ مانگتے تھے یعنی "چھ میں دو" بہر حال مسلم لیگ دو نشست کابینہ میں مانگتی تھی اور کانگریس ایک دینے کو تیار تھی۔

اس کے علاوہ دوسری وجہ اختلاف یہ ہوئی کہ کانگریس نے ایک پیمان مسلم لیگ کو دیا اس پر مسلم لیگ والوں کے دستخط درکار تھے خلیق الزماں نے اپنی نوشتہ کتاب میں دیا ہے جو حسب ذیل ہے۔

'The Muslim League group in the United Province's legislature shall cease to function as a separate group.

The existing members of the Muslim League Party in the United Provinces Assembly shall become part of the Congress Party and will fully sharewith other members of the Party their privileges and obligation as members of the Congress Party. They will similarly be empowered to participate in the deliberation of the party. They will likewise be subject to the control and discipline of Congress Party in equal measure with other members and decisions of the Congress Party, as regards work in the Legislature and general behaviour of its members, shall be binding on t hem. All matters shall be decided by a majority vote of the Party, each individual member having one vote.

The Policy laid down by the Congress Working Committee for their members In the Legislature along with instructions issued by the competent congress bodies pertaining to their work in such Legislatures shall be faithfully carried out by all members of the Congress Party including these members.

The Muslim League Parliamentary Board in the United Provinces will be dissolved, and no candidates thereafter be set up by the said Board at any bye-election. All members of the Party shall actively support any candidate that may be nominated by the Congress to fill up any vacancy occuring hereafter.

All members of the Congress Party shall abide by the rules of the Congress and offer their full and genuine co-operation with a view of promoting the interest and the prestige of the Congress.

In the event of the Congress Party deciding on resignation from the Ministry or from the Legislature the members of the above mentioned group will also be bound by that decision.

مجھے مولانا مرحوم کے اس بیان سے کامل اتفاق ہے۔ جو صفحہ ۱۶۱ پر درج ہے کہ یہ بڑی بدقسمتی کی صورت ہوئی۔ اگر یو۔ پی میں لیگ کے تعاون کو منظور کر لیا گیا ہوتا تو مسلم لیگ پارٹی عملاً کانگریس کا ایک جزو بن گئی ہوتی"۔

مسلم لیگ کا مقصد اس زمانہ میں ڈومنین اسٹیٹس "DOMINION STATUS" تھا لیکن کانگریس کی ہم آہنگی کیواسطے ایسے یکبارگی آزادی کامل اپنا مقصد بنایا۔ اس سے ظاہر ہے کہ لیگ تعاون کے واسطے تیار تھی اس لئے اس نے اپنا سیاسی موقف بدلا تاکہ کانگریس پارٹی کو مسلم لیگ سے ملنے میں کوئی پس و پیش نہ ہو۔ اس کے بعد ناکامی کا اثر جو لیگ والوں پہ ہوا وہ ظاہر ہے۔

ہم سے ملنا تجھے اے چرخ گوارا نہ ہوا
لاکھ ہم تیرے ہوئے تو ہی ہمارا نہ ہوا

مجھے یقین ہے کہ کانگریس نے غلطی کی کوئی چھوٹا دریا کسی بڑے دریا میں مل جاتا ہے تو وہ اسی کا ایک حصہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح لیگ کانگریس میں ضم ہو جاتی اور اس کی علیحدہ حیثیت باقی نہ رہتی اور ہندوستان کی تقسیم کا خیال اور اس کے خوں ریز نتائج پیدا نہ ہوتے تو ملکر کام کرنے سے باہمی اعتماد پیدا ہو جاتا اور شکوک و بدگمانی کے غبار سے فریقین کی نگاہیں محفوظ رہتیں۔

وزارت سے استعفیٰ کے بعد

میں مخالف پارٹی کے لیڈر کی حیثیت سے اسمبلی میں کام کرتا تھا۔ کانگریس نے اس قدر وعدے کر ڈالے تھے کہ ان کا پورا کرنا مشکل تھا۔ میں پرانی تقریریں اور وعدے یاد دلا کر تنقید کرتا تھا مثلاً انتظامی اختیارات (EXECUTIVE FUNCTION) اور عدالتی اختیارات (JUDICIAL FUNCTIONS) کو الگ کرنا۔ عنانِ حکومت ہاتھ میں آنے کے بعد کانگریس کو گوارہ نہ تھا کہ عدالتوں کو بالکل آزاد کر دیا جائے۔ چنانچہ آج تک جوڈیشنل مجسٹریٹ کلکٹر اور کمشنر ہی کے ماتحت ہیں۔ حالانکہ انگریز کے زمانہ میں یہ کانگریس کا بنیادی اصول تھا۔ اس سلسلہ میں میں نے ایک ناکام کوشش کی مگر ڈاکٹر کاٹجو نے فقط ٹالا نہ اقرار کیا نہ انکار۔

میرے علم میں یہ آیا کہ حکومت نے افسران کو ایک گشتی مراسلہ روانہ کیا ہے جس میں انہیں بتایا گیا ہے کہ کانگریس کے ممبران کے ساتھ ان کا طرزِ عمل کیا ہونا چاہئیے اس کی نقل حسب ذیل ہے۔ جو سات مارچ ۱۹۳۸ء میں اسمبلی میں پیش کی گئی۔

Circular referred to in Answer to starred question No. 7 for 7th March 1938, asked by Nawab Dr. Sir Mohammad Ahmad Said Khan.

D O. No. 712/III)

United Provinces Civil Secretariat,
Lucknow.
November 10, 1937.

Dear Sir,

In the course of last three months since the present Government assumed office frequent reports have been received from Government servants in

which Congress Supporters are stated to have adopted an embarrasing attitude towards the District Authorities, and a very large number of complaints have similarly reached Government from Congress workers against the behaviour specially of the lower grades of Government officials. The Government are of opinion that such complaints and counter-complaints only tend to engander and crystallize an attitude of mutual suspicion, which is in every way opposed to the public-interest. They feel therefore, that the time has come when determined efforts should be made by the officers of the Government to establish relations of mutual confidence with the District Leaders of the Congress Organization.

A letter will be addressed to you shortly on the position of the Government servants vis a vis the general public, and the second letter on the measures contemplated by Government to check corruption in the public services. All these letters read together will give a synoptic view of the Government policy in regard to the position of of services generally. In this letter I am to amphasize the importance of the establishment of relations of mutual confidence between the district authorities and the leaders of Congress Organization., Government officials, whether Revenue or Police are the executive of Government. They have certain statutory powers and responsibilities and various other functions to perform They are the agents through whom the orders or the policy of the Government is given a concrete shape and there is no question of substituting any other

agency for this purpose. The Congress on the other hand represents a large body of public opinion and is the party on the support of which the present Government rests. The Congress is naturally anxious to secure the maximum benefit for the members of the public out of the public institutions and functionaries. It is also interested in seeking all relevant information and bringing to the notice of the authorities appropriate cases and facts of redress and relief and in seeing that malpractices and neglect of duty on the part of public servants should be enquired into and corrected It is the duty of Government servants concerned to deal with complaints of this nature which are brought to their notice, and to make it clear that they are giving due attention to them. Object of the Government and the Congress alike must be that the official agency functions with the maximum of efficiency and with the full confidence of the public, and this result will be faciliated if relation of mutual confidence and harmony are established between the district authorities and the leaders of the Congress Organization in the districts How best to set about establishing more friendly and co-operative relations in each district is a matter primarily for the district officers themselves to consider, but I am to point out that any successful mathod in this direction pre-supposes tact, sympathy, accessibility and impartiality, and that is important that the district authorities should be in touch with the representatives of the Congress

organization in their respective areas. The Congress Committees are being addressed in a similar sense by the United Provinces Congress Committee.

Yours faithfully.
C.N. Gwynne
Chief Secretary

To—All District Magistrate,
United Provinces.

مجھے ایسے اقدام پر اعتراض نہ ہوتا اگر اس گشتی میں کانگریس کے بجائے "پبلک یا شہری" کا لفظ استعمال کیا گیا ہوتا۔ لیکن حکومت کا اپنی سیاسی جماعت کا نام لیکر ملازمان سرکار کو تعاون کی ہدایت کرنا نامناسب تھا۔ گو طرز تحریر میں احتیاط برتی ہے۔ اور پبلک کی شکایات اور ملازمان سرکار کی بدعنوانی کا ذکر بھی ہے۔ لیکن اصل منشا اس گشتی کا یہ تھا کہ ملازمین سرکار مقامی کانگریسی لیڈروں کے اثر سے متاثر ہوں اور ایسا ہی ہوا۔

ملازمین سرکار کو سیاست سے تعلق نہیں ہونا چاہیئے۔ ان کے نزدیک ہر شہری کی حیثیت یکساں ہے اور ہونی چاہیئے۔ اس گشتی میں انہیں ہدایت کی گئی تھی کہ وہ ایک سیاسی پارٹی کے ممبروں کے ساتھ ترجیحی برتاؤ کریں اور افسران کی فراموشی اور غلطیوں کا حوالہ دیکر انہیں ڈرا بھی دیا کہ اگر ان کی شکایت ہمارے کان تک آئے گی تو بازپرس کی جائے گی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ضلع کے افسران مرعوب ہوگئے۔ وہ بجا طور پر یہ سمجھے کہ اگر کانگریس کے ممبر ناخوش ہوں گے تو ان کی شکایتیں کریں گے اور انہیں جواب دہی کرنا پڑے گی۔ ان کا مرعوب ہوجانا قدرتی تھا۔

جمہوری نظام حکومت میں ملازمین سرکار کا آزاد اور غیر جانب دار رہنا نہایت ضروری ہے ورنہ انصاف نہیں ہو سکتا۔ ملازمین سرکار کا فرض قانون کی پابندی ہے۔ انہیں اس سے بحث نہیں ہونی چاہیئے کہ جو شخص قانون کی زد میں آتا ہے اس کے سیاسی عقائد کیا ہیں اس کا مذہب کیا ہے اور وہ کس سیاسی جماعت سے متعلق ہے۔

اُردو مقام اسمبلی

۱۹۳۸ء کی اسمبلی کی روئیداد میں ایک اور چیز نظر سے گذری - گو کانگریس کی گورنمنٹ تھی پنڈت جی آنجہانی وزیر اعظم تھے مسٹر پرشوتم داس ٹنڈن اسپیکر تھے لیکن اُردو کو یو۔پی کی ایک زبان تسلیم کرنے میں کوئی دقت نہ تھی یکم اپریل ۱۹۳۸ء کی اسمبلی کی روئیداد میں حسب ذیل بیان ٹنڈن جی آنجہانی کا بحیثیت اسپیکر درج ہے - یہ بیان اُردو اور ہندی میں دیا گیا۔

آنریبل اسپیکر

ان ممبر صاحبان کو جنہوں نے بار بار مجھے لکھا تھا اور زبانی بھی اس ہاؤس میں جنہوں نے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ ان کو اسمبلی کی کارروائی کے کاغذ اُردو اور ہندی میں ملا کریں یہ جان کر خوشی ہوگی کہ آج سے میرا ایسا انتظام ہو گیا ہے کہ آج اور قریب قریب برابر آئندہ میں کل کاغذات جن پر یہاں کام ہوتا ہے - ہندی اور اُردو میں دے سکوں گا - چنانچہ آج کے سوالوں کا ترجمہ اور کارروائی کے دوسرے کاغذوں کا بھی ترجمہ یہاں میز پر موجود ہے - میرے دفتر کے لوگوں کو یہ معلوم نہیں ہے کہ کن لوگوں کو اس ترجمہ کی ضرورت ہے - اگر وہ ذرا کھڑے ہو جائیں تو دفتر کے لوگ وہاں پر فوراً ہندی اور اُردو میں یہ چیزیں پہنچا دیں ۔"

اس وقت تک اُردو اور ہندی کا کوئی اختلاف نہ تھا اور حقیقتاً ہونا بھی نہیں چاہئے دونوں اس ملک کی زبانیں ہیں۔ اور دہلی و یو۔پی تو اُردو کا گھر ہے۔ ہندو اور مسلمان تہذیب کے سنگم اور ملنے سے پیدا ہوئی ہندو و مسلمانوں میں برادرانہ محبت کی تصویر اُردو زبان ہے جیسے وہ پہلے کیوں تھی اور اب یہ کیوں ہے۔ اس کا جواب میری فہم و فراست سے باہر ہے۔ آزادی کامل کے حصول سے بہت سی امیدیں وابستہ تھیں۔ توقع یہ تھی کہ ہر شخص کی زبان اور کلچر کی حفاظت حکومت خود کرے گی اور اُردو تو خاص کر اس کی مستحق تھی جو ہند و مسلم اتحاد سے پیدا ہوئی تھی پھر اس کے ساتھ یہ عمل کہ اُردو کوئی زبان ہی نہیں۔ بہت دل شکن ہے۔ آزادی کامل کا یہ تصور کبھی خیال میں نہ تھا۔

یہ داغ داغ اُجالا۔ یہ شب گزیدہ سحر
وہ۔ انتظار تھا جس کا۔ یہ وہ سحر تو نہیں

یو۔پی کی اسمبلی میں کام ہوتا رہا۔ جو کانگریس میں نہ تھے وہ مخالف پارٹی کے فرائض انجام دیتے رہے مجھے اس کی تاریخ لکھنے کی ضرورت نہیں اسمبلی کی کارروائی کی رپورٹ میں وہ سب درج ہیں۔

زمینداروں کی تباہ کن غلطی

گورنمنٹ کی طرف سے ایک بل قانون لگان کے متعلق پیش ہوا۔ جس میں کاشتکاروں کو حق موروثی دینے کے علاوہ بہت سی دوسری تجاویز ایسی تھیں جو غیر منصفانہ طریقہ سے زمیندار کے لئے نقصان رساں تھیں۔ زمینداروں کی پریشانی قدرتی تھی۔ مگر اس کا علاج کیا ہو۔ اس کا فیصلہ نہیں کر سکتے تھے یہ پہلی جمہوری حکومت تھی۔ زمینداروں کو اسمبلی میں اکثریت کی طاقت کا اندازہ نہ تھا۔ اُن کے خیال میں دو ہی علاج تھے۔ یا تو گورنر کے پاس ڈپوٹیشن جائے۔ یا عدالت میں مقدمہ دائر کیا جائے جمہوری طرزِ حکومت سے جو دشواریاں پیدا ہوں اُن کا علاج جمہوری طریقہ سے کرنا نہیں آتا تھا۔ چنانچہ ایک روز ٹیلیفون آیا کہ مہاراجہ جہانگیر آباد کی کوٹھی پر میٹنگ ہے فوراً آئیے۔ حضرت گنج کی سڑک پر یہ کوٹھی ہے۔ میں فوراً حاضر ہوا۔ مہاراجہ سر اعجاز رسول مرحوم برٹش انڈین ایسوسی ایشن کے پریسیڈنٹ تھے۔ وہ اور چند تعلقدار صاحبان موجود تھے۔ سر تیج بہادر سپرو آنجہانی۔ چودھری نعمت اللہ صاحب۔ سر وزیر حسن سر سلطان احمد (پٹنہ) یہ سب تشریف فرما تھے اور قانونی چارہ جوئی پر بحث ہو رہی تھی۔ قانون پیشہ حضرات کی رائے متفقہ نہ تھی۔ سر سلطان احمد اور سر وزیر حسن مرحوم کا یہ خیال تھا کہ کم از کم تعلقداران اودھ کا معاملہ ایسا تھا کہ عدالت سے دادرسی کی اُمید کیجا سکتی تھی۔ لیکن سر تیج بہادر سپرو اور چودھری نعمت اللہ مرحوم کو اس سے اتفاق نہ تھا۔ سر تیج کے دو فقرے میں حقیقت تدبر اور فراست کی روح کام کر رہی تھی۔ سر تیج کے الفاظ آج تک کانوں میں گونج رہے ہیں۔ فرمایا تھا۔

(Gentlemen you have lost your battle

in political field by loosing election you cant win it through Judicial fields.

اس کے بعد عدالتی کارروائی کا خیال ختم ہوگیا۔ اسی جلسہ میں یہ تجویز بھی ہوئی کہ ایک ڈپوٹیشن گورنر کے پاس جائے اور میں اس کی قیادت کروں لیکن میں نے اس سے اختلاف کیا۔ میں جانتا تھا کہ گورنر کوئی مداخلت نہ کریں گے۔

زمینداروں کے سامنے سوال یہ تھا۔

چیست یاران طریقت بعد ازیں تدبیر ما

سر جگدیش پرشاد آنجہانی نے جو اس زمانہ میں وائسرائے کی مجلس عاملہ (ایگزیکٹو کونسل) کے ممبر تھے ہم لوگوں کی رہبری کی۔ وہ مجھ سے اور دوسرے تعلقداروں و زمینداروں سے ملے۔ اُن کا مشورہ یہ تھا کہ کانگریس ہائی کمان کے سامنے اس مسئلہ کو رکھا جائے۔

مجھے اُن کی اس رائے سے حرف بہ حرف اتفاق تھا۔ الکشن کے نتیجہ سے یہ ظاہر ہوگیا تھا کہ دیہاتی رقبہ کانگریس کے زیر اثر تھا اور کاشتکار کانگریس کے پروپگنڈے اور وعدوں کی وجہ سے زمینداروں کی حمایت تیار نہ تھا۔ پھر زمینداروں میں اتحاد عمل نہ تھا۔ وہ کسی قربانی کے لئے تیار نہ تھے۔ الکشن کے واسطے روپیہ جتنا چاہئے جمع نہیں کر سکتے تھے تو پھر جنگ کیسی صلح کے سوا کیا چارہ تھا۔

چنانچہ سر جگدیش پرشاد کی مدد سے کانگریس کے ہائی کمانڈ سے خط و کتابت شروع کی گئی اور ۲۱ ستمبر ۱۹۳۸ء کو زمیندار اور تعلقداروں کا ڈپوٹیشن دہلی میں کانگریس کے ہائی کمانڈ سے ملا اور ۲۲ ستمبر کو میں نے سردار پٹیل کو خط لکھا۔ جس کا جواب حسب ذیل آیا۔

All India Congress Parliamentary Sub Committee

Chairman
Sardar Vallabhbhai Patel

Birla House,
New Delhi
28th September, 1938

My dear Nawab Saheb,

I have received your letter of the 22nd inst. With reference to the objections to the provisions of the U.P. Tenancy Bill raised by your deputation, viz. those relating to Sir, ejectment & tree, when you saw us on the 21st inst. we are prepared to look further into the matter and consider what you may have to say in this connection, provided you are in a position to assure us that our decision will be accepted by the Landlords.

Yours sincerely
Vallabh Bhai Patel

اس کے بعد ۱۱ اکتوبر کو میں نے اور ایک خط خواجہ عبد المجید صاحب مرحوم نے پھر سردار پٹیل کو لکھا جس میں یہ خواہش کی کہ جب تک زمیندار اور گورنمنٹ یو۔پی کے درمیان اختلافی مسائل طے نہ ہو جائیں اس وقت تک یہ قانون اسمبلی میں پیش نہ کیا جائے۔

کانگریس ہائی کمانڈ نے یو۔پی کے قانون لگان کے مسئلہ کو سردار پٹیل مولانا ابوالکلام آزاد اور بھولا بھائی ڈیسائی کے سپرد کیا تھا۔ میں نے مولانا کو بھی خط لکھا۔ جس کے جواب کی نقل حسب ذیل ہے۔ مولانا کا خط اردو میں انہیں کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔

نقل خط

۳۰ستمبر ۱۹۲۸ء

دہلی

مکرمی والا نامہ پہونچا۔ میں منتظر تھا کہ اس معاملہ پر غور کرنیکی
نوبت آئے تو نتیجہ سے آپ کو مطلع کروں۔ امید ہے دفتر سے باقاعدہ خط
آپ کو مل گیا ہوگا۔ جو طرز عمل ہم نے بہار میں اختیار کیا تھا یہاں بھی اختیار
کر سکتے ہیں بشرطیکہ آپ حضرات ہمارا فیصلہ منظور کر لینے کے لئے تیار
ہوں۔ آپ یقیناً اس سے اتفاق کریں گے کہ بغیر کسی ایسی بنیادی مفاہمت
کے معاملہ کو آگے بڑھانا عملاً سودمند نہیں ہو سکتا۔ پارلیمنٹری کمیٹی اس بارے
میں جو کر سکتی تھی اس کے لئے وہ آمادہ ہو گئی ہے بشرطیکہ آپ کو بھی جو
کچھ کرنا چاہئے اس کے لئے آمادہ ہو جائیں۔ والسلام علیکم

ابوالکلام

جناب نواب سر احمد سعید خاں صاحب رئیس چھتاری
راحت منزل۔ علی گڑھ

ان خطوط سے یہ ظاہر ہے کہ کانگریس ہائی کمانڈ مداخلت کرنے کو فقط
اسی شرط سے تیار تھی کہ زمینداران یو۔پی مع تعلقداران اودھ اس پر راضی
ہوں کہ اُن کے اس فیصلہ کو وہ قبول کر لیں گے۔
چنانچہ ۱۶ اکتوبر کو الہ آباد میں زمیندار ایسوسی ایشن کی میٹنگ کی
گئی اور میں نے مظفر نگر کی ایسوسی ایشن کو بھی لکھا۔ دونوں جگہ سے زمینداران
صوبہ آگرہ نے اپنی رضامندی کی قرارداد منظور کیں یعنی کانگریس ہائی کمانڈ
کا فیصلہ ہمیں قبول ہوگا۔ لیکن تعلقداران اودھ اس میں شریک نہیں ہوئے
اور اُن کی ایسوسی ایشن کی طرف سے حسب ذیل تار پریسیڈنٹ نے بھیج دیا

Your letter of the 12th. Held Executive committee meeting on 14th unanimous opinion against arbitration but postpond final decision. Imposible for me or any other to attend Allahabad conference today. To avoid conflict of openion please post-pone decision or decide against arbira-tion. *President, of Birtish Indian association.*

یہ زمینداروں کی بدنصیبی تھی کہ تعلقداران اودھ اپنے طبقہ کو اس وجہ سے زمینداروں سے الگ خیال کرتے تھے کہ اُن کے پاس برٹش حکومت کی دی ہوئی اسناد تھیں جو انہیں واجد علی شاہ کو کلکتہ میں قید کرنے کے بعد بشرط وفاداری دی گئی تھیں۔

میں نے سردار پٹیل کو ۱۸ اکتوبر کے خط میں زمینداران صوبہ آگرہ کے فیصلے سے مطلع کر دیا۔ اور یہ بھی لکھ دیا کہ تعلقداران کی جنرل میٹنگ ۲۷ اکتوبر کو ہوگی۔ جس میں اس کا فیصلہ ہوگا۔ سردار نے ۲۱ اکتوبر کو مجھے لکھا کہ چونکہ ۲۷ اکتوبر کو تعلقداران کی میٹنگ ہو رہی ہے اس کا انتظار کیا جائے "ہماری کمیٹی کے فیصلہ کی روشنی میں میرے لئے یہ نامناسب ہوگا کہ اس معاملہ میں قدم اٹھاؤں جب تک کہ تعلقدار بھی اس پر راضی نہ ہوں کہ ہمارا تصفیہ انہیں قبول ہوگا۔"

ایک جانب میں یہ کوشش کر رہا تھا۔ دوسری جانب ایک تعلقدار صاحب نے اخبارات میں اس کی مخالفت شروع کر دی۔ مجھ پر بھی الزام لگایا کہ کانگریس کی خوشنودی مدنظر ہے اور کانگریس پر بھی حملے کئے گئے۔ مجھے سردار پٹیل نے ایک خط لکھا جو حسب ذیل ہے۔

VALLABH BHAI PATEL

Phone : 30588
Purshottam Building
BOMBAY-4

My dear Nawab Sahab,

Many thanks for your letter of the 21st of Oct., with the interesting enclousure.

I am sorry for the attitude of Raja Maheswar Dayal & for those who are responsible for the propaganda in the press against your well-meaning efforts in the interest of the province. I appreciate the motives under lying your efforts. but if the Zimindars like Raja Maheswar Dayal Seth desire to taste the fruits of strife and struggle and have a war to the knife with the tenants, no one can prevent them and you can not but leave them to reap the fruits of what they wish to sow. I have no doubt that the future will prove to them and to all that youc sain attitude was the only correct one.

I am too thick skinned and thoroughly seasoned to take any notice of such unpleasant attacks in the press or on the platform.

I am sorry that your own colleague have misunderstood you in your efforts to serve them.

Yours sincerly,
Vallabh Bhai Patel

To

Nawab of Chhatari,
22 Out-ram Road Lucknow.

آخرکار ۲۷ اکتوبر کو تعلقداران اودھ کی کانفرنس ہوئی۔ اس میں یہ طے
پایا کہ وہ فیصلہ باہمی اتفاق سے کرنے کو تیار ہیں لیکن کانگریس کے ہائی کمانڈ
کو کسی فیصلے کے نافذ کرنے کا حق دینے پر راضی نہیں ہیں۔ اس قرارداد کا
وہ حصہ جسے "جانِ سخن" کہا جائے۔ حسب ذیل ہے۔

This conference, however, feels that a permanent and satisfactory solution of such diverse and important problems upon a proper solution of which the peace and prosperity of the province depend, can only be achieved by goodwill and mutual agreement and that the imposition of any decision arrived at without the concurrance of those vitaly effected by it is not likely to establish that healthy atmosphere which is essential for a peaceful solution of the problem.

میں نے تعلقداران کا ریزولیشن سردار پٹیل کو بھیجا۔ اور گو مجھے کسی فیصلہ
کی امید نہ تھی مگر پھر بھی خواہش کی کہ وہ یو۔پی کی گورنمنٹ اور زمینداروں کے
درمیان فیصلہ کریں مگر وہ راضی نہ ہوئے اور حسب ذیل جواب آیا۔

2, November 1938

My Dear Nawab Saheb,

I have now received your letter for the 28th of October enclosing a copy of the resolution passed by the Land Lords of Oudh. This resolution makes it clear that the Land Lords of Oudh are not willing to accept the decision of the Parliamentary Sub-Committee in the matter of the disputes between tenants and the Land-Lords arising out of the tenancy Legislation. After the propagendas that

was made in the Pioneer by some of the Land-Lords I had no hopes of their accepting our offer. Although the tone of the resolution is conciliatary there is no mistake about the fact that our offer is courteously set asides. It would be useless to carry on negotiation unless both the parties are agreed to accept our decision. The arbitration by the Parliamentary Sub-Committee would necessarily bind the Congress Party in the ASSEMBLY and the Congress organization in the Province in spite of what may be said or done by a few Congressmen to the contrary as the Congress discipline and prestage require that the decision given by authorities of the Congress would be binding and acceptable to Congressmen and subordinate Congress organizations concerned. The Land Lord's organisation is not prepared to give a similar undertaking on behalf of the Landlords to accept our decision would be accepted by the Landlords. It is unfortunate that the Landlords of Oudh have been actuated by a spirit of distrust and have not appreciated the spirit in which the offer was made by us. I regret to inform you that it is not possible for us, under the circumstances. to do any thing in the matter,

Yours sincerely,
Sd/- Vallabhbhai J. Patel
Chairman

Sir Ahmad Said,
Nawab of Chhatari,
22, Outram Road,
Lucknow.

میرے خیال میں تعلقداران نے یہ نہایت سنگین غلطی کی تھی۔ زمینداری
خاتمہ کا بنیادی پتھر اسی روز رکھا گیا جب کانگریس ہائی کمانڈ کو پنچ بنایا

سے تعلقداران نے انکار کیا۔ میرا منشاء اس کوشش سے اُس قانون میں اتنا ترمیم کرانا نہ تھا جتنا یہ تھا کہ زمینداروں کے ساتھ کانگریس کو کوئی عناد اور مخالفت نہ رہے۔ لیکن جب تعلقداروں نے کانگریس ہائی کمانڈ کو پنچ بنانے سے انکار کر دیا تو باہمی بے اعتمادی میں اضافہ ہو گیا۔ جس کا نتیجہ آزادی ملنے کے بعد زمینداروں کو اٹھانا پڑا۔ زمینداری کا خاتمہ ہوا۔ معاوضہ اتنا کم ملا کہ اگر وہ دفعات یعنی کونسٹی ٹیوشن میں ترمیم نہ کی ہوتی تو کوئی عدالت اس معاوضہ کو قیمت یا معاوضہ ماننے کو تیار نہ تھی۔

اقتصادی اعتبار سے زمینداری کے خاتمہ کی ضرورت نہ تھی کاشتکار کا لگان و آبپاشی وہی ہے حق موروثی پہلے ہی مل گیا تھا کسان کو بجائے فائدہ کے نقصان رہا۔ پہلے زمیندار ایک کمزور ایجنسی تھی کہ جو اکثر پورا لگان اور آبپاشی بھی وصول نہیں کر سکتی تھی۔ عدالت اور حکومت کی ہمدردی ہمیشہ کاشتکار کو ملتی تھی۔ اب گورنمنٹ خود زمیندار ہو گئی۔ ملازمین سرکار جو کچھ بھی کریں مشکل ہی سے اس کے خلاف سنوائی ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ دیہات میں زمیندار کا اثر تھا لہذا اس کا مٹانا سیاسی ضرورت تھی تاکہ وہ اثر کانگریس کے خلاف نہ استعمال ہو۔

اس دوران میں جرائم بہت زیادہ ہو گئے تھے۔ سنگین جرائم میں اتنا اضافہ ہو گیا تھا کہ ۱۳ مئی ۱۹۴۷ء کو سردار پٹیل نے مجھے ایک خط لکھا جس کو میں نقل کر رہا ہوں۔ ہندو مسلمان۔ شیعہ سنی۔ کاشتکار اور زمیندار اچھوت اور اونچی ذات والے سب میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا تھا۔ جس کی وجہ سے بلوے۔ ڈکیتی اور قتل اور دوسرے سنگین جرائم بڑھ گئے تھے میں سردار پٹیل کا خط اور اپنے جواب کا اقتباس شامل کر رہا ہوں۔

VALLABH BHAI PATEL

Purshottam Mansion,
Opp. Opera House,
BOMBAY-4
13th May, 1939.

My dear Nawab Sahab,

I thank you for your kind letter of the 9th may appreciating my speech deliverd at a big mass meeting of peasants assembled at Brindawan, I am distressed about the condition in U. P. Province which appears to be surcharged with communal bitterness. The whole atmosphere is so full of voilence that there is hardly much scope for any effective good work. The Shia-Sunni tension has added fuel to the fire. The relations between the Zamindars and the Kisans were already strained; can nothing be done by responsible leaders of all groups to put their heads together and bring about a peaceful atmospere in which honest defference of opinion can be discussed and settled in a friendly way ? The unfortunate communal bitterness in U. P. fitters down to the rest of the country as U. P. is the centre of Muslim culture-and other Provinces naturally look to them for guidence. The recent riots in U. P. have disgraced the fair name of both the communities and the poison is now speading in Bihar. Neither community is going to be benefitted by this kind of mad atrocitiss and the poar innocent people of both communities suffer. I am sure be equally distressed if not more about the sad state of affairs in your Province.

With kind regards,

Yonr sincerely,
Vallabh Bhai Patel.

The Nawab of Chhatari,
Rahat Manzil,
Aligarh. (U. P.)

My dear Sardar Sahib,

Many thanks for your letter of the 13th. I most sincerely appreciate the spirit which prompted you to write to me so frankly about the general political conditions prevailing in the country at present, and particularly as things are developing in the U. P.

You are right. I am equally distressed at the growing communal tension in these provinces. The spirit of class war between the zamindar and the tenant, the growing tendency towards violence and the general lack of respect for law is becoming most alarming. From time to time I raised my feeble voice inside the House as well as outside to check these tendencies but without any tangible effect, except, perhaps this that influential people have begun to realise where all this will lead to.

I should like to say a few words, first of all, about the maintenance of law and order as I feel that this is one of main eauses of various evils you have mentioned in your letter. I have a feeling, which is shared by many in this province, that respect for law is fast going down. This is borne out very clearly by the figures supplied to me by the Government, which show a tremendous rise in the number of violent crimes such as dacoities, burgalaries, murders and riots and an alarming and steady decrease in the number of prosecutions and convictions.

In my opinion this is the accumulative effect of several things, the mest prominent among them being the activities of some irresponsible people who preach class war, They are trying to rouse class consciousness and have created an atmosphere which has destroyed the authority of all those who used to help the Government in maintaning law and order.

As to the communal tension, it is on the increase without any shadow of doubt. It is not confined only to Hindus and Muslims, but it is between Muslims and Muslims also (Like Shias and Sunnis) and between Hindus and Hindus (Like the depressed classes and high caste Hindus).

You have asked me whether it is not possible for "responsible leaders of all groups to put their heads together and bring about a peaceful atmosphere in which honest differences can be discussed in a friendly way"

I think it is possible, because I can not believe that people can possibly go on living in this excited mood for all time to come. It is difficult to discuss all these matters within the scope of a letter as they need a good deal of discussion but as an illustration I may remind you that if the Zamindar Kisan question had been settled as suggest by me and agreed by you by the Parliamentary Sub-committee last November, much of the bitterness in the rural area might have disappeared. It would have also shown to the people that the Congress stands not for any one class but for all. Of course, the strong must bear the burden of providing relief to the

weak, and since the Congress happens to be in power in these provinces it is but natural that people [illegible] should look to it for justice to all, without discriminating between this class or that. Now that unfortunate tussel is still going on and the Tenancy Bill is before the Upper House.

In the end I may say that I entirely agree with you that the conditions in the country, and particularly in these provinces, are far from satisfactory; it is the duty of every Indian to discover some remedy for the trouble before it is too late, because it will weaken the country as a whole. So far as I am concernld, I have made it clear in my utterances both in the House and outside, that I stand for unity and mutual understanding between all sections of the people in province, and nothing will give me greater pleasure than to do my humble bit in that direction.

اس زمانہ میں یکایک سنگین واردات میں اتنا اضافہ کیوں ہوا
یہ ایک سوال ہے جو ہر اس ملک کے شہری کے واسطے قابل غور ہے
اس میں اختلاف رائے ہو سکتا ہے۔ میں اپنے نقطہ نظر سے ایک چیز
کو دیکھ رہا ہوں۔ دوسرا زاویۂ نظر مختلف ہو سکتا ہے۔ میرے خیال
میں حالات کی خرابی کے بنیادی اسباب یہ تھے۔

مثلاً ۲۱ء کانگریس جو اب تک انگریزی حکومت کے خلاف تھی
خود برسرِ حکومت ہو گئی عام لوگوں پر اس کا اثر یہ ہوا کہ انگریزی حکومت
کا اقتدار ختم ہوا اور آزادی کا غلط تصور لوگوں کو ہو گیا۔
۲۱ء کانگریس انگریزی حکومت کے خلاف قانون شکنی کی ترغیب

دیتی تھی اب قانون کی پابندی کا وعظ اُن کی زبان سے بے اثر ثابت ہوتا تھا۔ قانون کی عظمت اور اس کا خوف لوگوں کے دل سے جاتا رہا۔ ملازمین سرکار کہ جو امن و امان قائم رکھنے کے ذمہ دار تھے وہ خود مرعوب ہو گئے۔

۳۔ بہت سے غیر ذمہ دار نیتا لوگوں نے مختلف جماعتوں میں خلاف کی آگ کو ہوا دینی شروع کر دی مثلاً کاشتکار اور زمیندار میں کشمکش شروع ہو گئی اور دیہاتی رقبہ کا امن و امان جو زمیندار کی مدد سے پولیس قائم رکھتی تھی درہم برہم ہونے لگا۔

۴۔ فرقہ وارانہ ذہنیت میں یکایک ترقی ہو گئی۔ لکھنؤ میں شیعہ سنی کے جھگڑے۔ اونچی ذات اور اچھوت کے جھگڑے جابجا شروع ہو گئے۔

۵۔ کانگریس اور مسلم لیگ نے یہ الکشن ساتھ ملکر لڑا یا تھا۔ لیگی حضرات کانگریس کے نمایندوں کی مدد کر رہے تھے اور کانگریس کے قائدین (لیڈر) مسلم لیگ کے ممبروں کی تائید کرتے تھے۔ لڑائی فقط نیشنل اگریکلچر پارٹی تھی۔ مسلم لیگ کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ آیندہ کانگریس کی حکومت میں ہماری بھی حصہ ہوگا۔ لیکن جیسا کہ مولانا ابوالکلام مرحوم نے اپنی کتاب میں لکھا ہے اور میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں مسلم لیگ کی یہ اُمید پوری نہیں ہوئی۔ قدرتاً اس کا اثر نہ صرف مسلم لیگ کے لوگوں پر بلکہ عام مسلمانوں پر بہت بُرا پڑا۔ مسلمانوں کی اکثریت میری پارٹی میں تھی جو آہستہ آہستہ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے اور بجائے میرے خلیق الزماں صاحب مخالف پارٹی کے لیڈر ہو گئے۔ دوست جب ناامید ہو کر مخالف ہو جاتا ہے تو پھر کینہ کی انتہا نہیں رہتی۔ میرے خیال میں یہ اسباب تھے جن سے یو۔ پی کے امن و امان میں اختلال آیا اور پاکستان کا بنیادی پتھر رکھا گیا۔ بہر نوع کانگریس کی حکومت چلتی رہی یہاں تک کہ دوسری عالمگیر

جنگ نے کانگریس حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ کانگریس یہ چاہتی تھی کہ برٹش حکومت نہ صرف آزادی کامل کا وعدہ کرے بلکہ عملاً اسی وقت قومی حکومت بنائی جائے برٹش حکومت اس پر تیار نہ تھی۔

مہاتما جی اور وائسرائے کی خط و کتابت اور تقاریر سے مفصل حال کا پتہ چلتا ہے مسلم لیگ کو نہ تعاون سے انکار تھا نہ اقرار۔ مجھے مسٹر جناح کی پالیسی سے اتفاق نہ تھا میں یہ چاہتا تھا کہ جنگ کے موقعہ پر کھل کر مدد دینی چاہیے۔ بہرحال ہندوستان کی سیاسی تاریخ تو ہیں لکھنا نہیں چاہتا مورخین اس پر روشنی ڈالیں گے۔ میں لڑائی کے کاموں میں مدد دیتا رہا اور بحیثیت پریسیڈنٹ انتخابی کمیٹی دفاعی محکمہ کے افسران کی بھرتی میں کام کرتا رہا۔

تزئین فاطمہ کی پیدائش

۳ اگست ۱۹۴۰ء کو تزئین پیدا ہوئی یہ لڑکی مجھے بہت پیاری ہے خدا تعالیٰ نے اسے صوری و معنوی سب خوبیاں عطا فرمائیں مسلم یونیورسٹی سے بی۔ اے کیا خدا اسے ہمیشہ خوش رکھے۔

حیدرآباد

فروری ۱۹۴۱ء میں حضور نظام کا ایک مراسلہ ملا جس میں اعلیٰ حضرت نے مجھے حیدرآباد کی صدارت عظمیٰ کی تجویز سے نوازا تھا اور دریافت کیا تھا کہ آیا میں منظور کروں گا۔ حیدرآباد میں "وزیر اعظم" کو "صدر اعظم" پریسیڈنٹ آف دی کونسل کہتے تھے۔ صدر اعظم کا تقرر نظام کرتے

تھے، مگر وائسرائے یا (CROWN REPRESENTATIVE) کے مشورہ سے۔

اس واسطے صدر اعظم حیدرآباد گورنمنٹ برطانیہ کے اثر سے بے نیاز نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ بہت پرانا طریقہ چلا آرہا تھا لیکن لارڈ ریڈنگ کے زمانہ میں کسی ناسمجھ مشیر کے مشورہ سے حضور نظام نے ایک خط وائسرائے کو لکھدیا جس میں معاہدے جات کی بناء پر حضور نظام نے برٹش حکومت کے ساتھ مساوات اور برابری کا مرتبہ تسلیم کرنا چاہا۔ یہ بات انگریزی حکومت کو گراں گذری اور ستم یہ کیا کہ اس خط کو اخبارات کو دیدیا اس سے ناگواری ہوئی۔ لارڈ ریڈنگ نے ایک سخت خط نظام کو لکھا جس کا منشاء یہ تھا کہ اُن کی حیثیت بالکل اور والیان ملک کی حیثیت کے برابر ہے برٹش حکومت سے کوئی سوال مساوات کا پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے بعد نظام کے اختیارات پر مزید قیود لگائے گئے۔ ایک انگریز آئی۔ سی۔ ایس وزیر جو حکومت ہند کا تجویز کردہ ہوتا تھا حضور نظام مقرر کرتے تھے اور ہمیشہ پولیس، مالگزاری اور جنرل ایڈمنسٹریشن کے محکمہ جات اس کے حوالہ کئے جاتے تھے۔ اس طرح برٹش حکومت کا ایک افسر حکومت حیدرآباد کے دروبست پر اثر انداز ہوتا تھا۔ اس واقعہ سے پہلے فقط وزیر اعظم کا تقرر وائسرائے کے مشورے سے ہوتا تھا اب دوسرے وزراء کے تقرر میں بھی ریزیڈنٹ سے مشورہ لازمی ہوگیا۔

میں نے وہ معاہدے دیکھے ہیں جو زمانہ سابق میں برٹش اور حیدرآباد کے درمیان ہوئے ہیں اُن کی عبارت ایسی ہی ہے جیسی دو برابر کی حکومتوں میں ہوتی چاہئے لیکن ("MIGHT IS RIGHT.") یا ہماری زبان میں "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" پہلے بھی صحیح تھا آج بھی ہے اور ہمیشہ صحیح رہے گا۔

زبردست ناانصافی کے واسطے سینکڑوں بہانے بناتا ہے اور زبردست
منہ تکتا رہ جاتا ہے۔

میں نے حضور نظام کی تجویز کو منظور کر لیا لیکن حیدرآباد جانے میں ذہنی
خلجان تھا۔ میں نے برٹش حکومت میں کام کیا تھا۔ آئی۔سی۔ایس۔افسران
کی قابلیت اور کارگذاری عام طور پر مسلمہ تھی۔ اور آزادی کے بعد اب
تک مسلمہ ہے۔ برے بھلے ہر جماعت میں ہوتے ہیں مگر آئی۔سی۔ایس
افسران کی تربیت۔ تعلیم اور انتظامی تجربہ قابل قدر تھا۔

علاوہ ازیں برٹش حکومت کی انتظامی مشین صحت مند اور محنت کش
تھی۔ درباری سازشوں اور چال بازیوں سے پاک۔ حکومت کے ارباب
حل و عقد۔ گورنر سے لیکر ادنیٰ ملازم تک ایک آئین اور قانون کے تحت
کام کرتے تھے۔ لیکن حیدرآباد کے متعلق عجیب خبریں مشہور تھیں۔ درباری
سازشیں۔ جو شخص حکومت میں ہوتا لازمی ہیں حکمراں کی مداخلت۔
ملازمین میں گروہ بندی وغیرہ جس کی وجہ سے انتظامی مشین کی کارگذاری
اور (DISCIPLINE) پر برا اثر پڑتا تھا۔ یہ تمام خیالات میرے واسطے
پریشانی کا باعث تھے۔ مگر میں قبول کر چکا تھا اور اس نئے تجربہ کے
واسطے تیار ہو گیا۔

۱۹۴۱ء کی جولائی میں حضور نظام کی طرف سے میرے تقرر کا اعلان
ہو گیا۔ میں حضور نظام کو سلام کی غرض سے حیدرآباد کو روانہ ہوا۔ دہلی
میں وائسرائے کے سیاسی مشیر (POLITICAL ADVISER) سے
بھی ملا جہاں تک مجھے یاد ہے۔ (SIR FRANCIS VAELLIE)
اس عہدہ پر تھے۔ میں اپنے حیدرآباد جانے کے ارادہ کا ذکر کیا اور یہ
بھی کہا کہ میرا خیال ہے کہ میں نظام سے یہ کہدوں گا کہ سرکاری طور پر
میرا تقرر چاہے جتنے عرصہ کے واسطے ہو۔ مگر میرے اور نظام کے درمیان

یہ قرارداد رہے گی کہ جب حضور نظام یہ خیال کریں کہ میری موجودگی حکومت حیدرآباد کے واسطے مفید نہیں ہے تو فرما دیں میں استعفیٰ پیش کردونگا۔ اور یہی حق مجھے بھی حاصل رہے گا۔ حکومت ہند کے سیاسی مشیر کو اس سے اختلاف تھا وہ کہنے لگے کہ اگر نظام نے چند ماہ بعد ہی یہ کہا تو کیا ہوگا۔ میں نے کہا کہ میں چلا آؤں گا۔ میں بار خاطر بنکر رہنا نہیں چاہتا تھا۔

۲۸ جولائی ۱۹۴۱ء کے روزنامچے میں میرا حیدرآباد پہونچنا درج ہے۔ میں اور میرے سکریٹری صغیر احمد عباسی صاحب حیدرآباد پہونچے (ROCK LAND) مہمان خانہ میں مقیم ہوئے۔ ساڑھے دس بجے صبح حضور نظام سے ملاقات ہوئی۔ یہ ملاقات نذری باغ کے دفتر میں ہوئی پانچ اشرفیاں بطور نذر پیش کیں۔ پہلی ہی ملاقات میں یہ عرض کردیا کہ میں ملازمت کی وجہ سے یہاں نہیں رہوں گا۔ میرے تقرر کا زمانہ کتنا ہی ہو اگر کسی وجہ سے حضور تبدیلی چاہیں گے تو میں جس وقت ارشاد ہوگا استعفیٰ پیش کردوں گا وہ یہ سن کر خاموش ہوگئے۔ پھر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد میں مہمان خانہ واپس آگیا۔

میری بدقسمتی سے جناح صاحب بھی یہاں ٹھہرے ہوئے تھے جب میں اُن سے ملا تو انہیں اس پر اصرار تھا کہ نہ صرف (DEFENCE COUNCIL) بلکہ صدارت عظمیٰ سے بھی مجھے استعفیٰ دینا چاہیئے۔ میں نے جنگ کے زمانہ میں ڈفنس کونسل بنائی تھی میں اس کا بھی ممبر تھا۔ میں نے کہا کہ مسلم لیگ ڈفنس کونسل کی ممبری کے خلاف ہے مگر کیا ریاست میں ملازمت کرنے کے بھی مسلم لیگ خلاف ہے۔ جس کے جواب میں انکی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ تمہیں ملازمت کی کیا ضرورت ہے مسلم لیگ میں آکر قومی کام کرو۔ ظاہر ہے کہ میں اُنکی اس رائے سے متفق نہ تھا۔

چونکہ چارج لینے کی کوئی تاریخ مقرر نہیں ہوئی تھی۔ میں دوسرے روز واپس ہوگیا۔ جناح صاحب نے اخبار میں ایک بیان دیا کہ اگر مجھے مبارکباد دینے کے واسطے جلسے ہوں تو مسلم لیگ کے مسلمان اس میں شریک نہ ہوں۔ لیکن حسب دستور ایٹ ہوم ہوئے اور مجھے خاص طور پر نواب اسماعیل خاں صاحب مرحوم کی یاد آ رہی ہے کہ وہ باوجود مسلم لیگ کے منتظمہ کمیٹی کی ممبری کے شریک ہوئے۔ جناح صاحب کی خواہش یہ تھی کہ مولوی عبدالعزیز صاحب ساکن پٹنہ کو جو وزیر عدالت تھے۔ نظام صدر اعظم بنائیں اس وجہ سے وہ چاہتے تھے کہ میں اس عہدہ کو قبول نہ کروں۔ میں نے اپنے عہدے کا جائزہ پہلی ستمبر ۱۹۴۱ء کو لیا۔ اگست کے مہینہ میں روزانہ اجنبی حضرات کے خطوط حیدر آباد سے آتے تھے۔ جو متضاد پند نصائح اور مشوروں سے پُر ہوتے۔ درباری سازشوں کے قصہ گروہ بندی کی کہانیاں بڑی آب و تاب سے بیان کی جاتی تھیں۔ درباری سازشوں کا سرچشمہ نواب کاظم یار جنگ کو بتایا جاتا تھا۔ وہ معین انصاری (جو کیبنٹ کے سکریٹری تھے) کے طرفدار تھے۔ یہ بعد کو معین نواز جنگ کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ یہ دونوں حضرات "ملکی" گروہ کے قائدین میں سے تھے۔ غیر ملکی حضرات میں بلگرامی خاندان کے لوگوں کو خاص طور پر نشانہ بنایا جاتا تھا۔ یہ خاندان تین پشت سے حیدر آباد میں رہتا چلا آ رہا تھا۔ نواب عمادالملک مرحوم سے لیکر اس زمانہ تک جب میں گیا حیدر آباد کی قابل قدر وفادارانہ خدمات اس خاندان نے کی تھیں مگر غیر ملکی دھبہ نہیں مٹا تھا۔ اس خاندان کے لوگوں میں نواب علی یاور جنگ کے ساتھ خاص طور پر حسد اور بدگمانی تھی۔ بہرحال یہ خطوط آتے رہے اور بجائے اس کے کہ حیدر آباد کی تصویر کچھ صاف ہوتی اور بھی غبار آلودہ ہوگئی۔ سلجھنا تو درکنار۔ الجھاؤ میں کچھ اضافہ ہوگیا۔

پہلی ستمبر ۱۹۴۱ء کی صبح حیدرآباد پہونچا۔ سر اکبر حیدری مرحوم کے دونوں A.D.C کیپٹن صادق اور کرنل سعید بھی پلیٹ فارم پر بہت سے عمائدین اور افسران حکومت کے ساتھ موجود تھے حسب دستور میرا استقبال ہوا اسٹیشن سے سید ہا کنگ کوٹھی گیا اور اعلیٰ حضرت کی کتاب پہ اپنا نام لکھا اور "شاہ منزل" آگیا۔ جو صدر اعظم کا سرکاری قیام گاہ تھی جس میں اب گورنر رہتے ہیں دوسرے روز حضور نظام نے ایک فرمان فارسی میں جاری فرمایا جو حسب ذیل تھا۔

نقل فرمان ذی شان شاہ حضور دکن خلد اللہ ملکہٗ

جدید صدر اعظم باب حکومت

ما ایں امر را بہ مسرت محسوس کردیم کہ دیروزہ نواب صاحب چھتاری از علی گڑھ اینجا آمدہ جائزہ خدمت خود بدست گرفت و امید ہست کہ انتخاب ما در نظر اہل ملک بروقت کامرگار ثابت خواہد شد کہ صاحب موصوف علاوہ بودن حامل کردار نیک صفات حسنہ ہم میدارند۔ ما او را خوب میدانیم و ہم اطمینان در انجام دہی خدمات وفادارانہ او می داریم۔ بہرحال دور جدید آغاز شد ہمراہ نتائج خوشگوار برائے سود و بہبود ملک لہٰذا ایں فال خوش است۔

(صبح دکن ۹ شعبان المعظم ۱۳۶۰ھ)

جائزہ یعنی چارج لینے کے بعد انتظامی مشین سے ذاتی تعلقات اور واقفیت پیدا کرنا ضروری تھا۔ میں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ دوسرے وزراء میں سے ایک ایک کو لنچ یا ڈنر پر بلاتا اور تنہا باتیں کرتا۔ اسی طرح معتمدین (سکریٹریز) کو بلاتا۔ نائب معتمدین (ڈپٹی سکریٹریز) اور نظما یعنی (ہیڈ ڈپارٹمنٹ) کو چار پانچ کو ایک ساتھ چاء پر بلاتا اور اُن کے صیغوں کے متعلق باتیں

کرتا۔ مجھے باوجود برٹش انڈیا میں تجربہ کے ایسا محسوس ہوتا جیسے کوئی مسافر اجنبی راستہ پر غروب آفتاب کے بعد چل رہا ہو۔ اس سلسلہ میں ایک قصہ یاد آ گیا سر تھیوڈور ٹاسکر کو جو حکومت ہند کی طرف سے ایک وزیر تھے اور جو تیرہ چودہ برس سے مختلف عہدوں پر حیدرآباد رہے تھے۔ میں نے لنچ پر بلایا تھا۔ لنچ کے بعد حسب ذیل گفتگو ہوئی۔

میں۔ سر تھیوڈور۔ برٹش حکومت کے انتظامی امور کا مجھے کم و بیش تجربہ ہے مگر کسی ریاست اور خاص کر حیدرآباد کا مجھے کوئی تجربہ نہیں۔ آپ کی ملازمت کا بڑا عرصہ یہاں گذرا ہے آپ کے تجربہ سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں۔

سر تھیوڈور ٹاسکر۔ سر احمد آپ میرے چیف ہیں۔ آپ کی پالیسی کو وفاداری کے ساتھ کامیاب بنانا میرا فرض ہے۔ اس میں کبھی کسی قسم کی کوتاہی نہ ہوگی میری رائے اور میرا مشورہ ہمیشہ آپ کے واسطے موجود ہے حیدرآباد کی حالت میں مختصراً دو باتیں فقروں میں بیان کر دوں ہم سب وزیر ہیں مگر ہماری مثال ایسی نرسوں کی ہے کہ جو ایک ایسے بچہ کی حفاظت کے واسطے مقرر کی گئی ہیں جس کا دل خودکشی کرنے کو چاہتا ہے ہمارا کام ہے کہ اُسے خودکشی نہ کرنے دیں۔

سر تھیوڈور ٹاسکر کے اس مختصر تجربہ سے مجھے حیدرآباد میں اپنی دشواریوں کا احساس بہت بڑھ گیا گو اُن کے حل میں کوئی مدد نہ ملی۔

حیدرآباد کے افسران و ملازمین اپنی اہلیت اور قابلیت کے لحاظ سے کسی دوسری حکومت کے افسران سے کم نہ تھے۔ بہت سے ایسے تھے کہ جو یورپ سے امتحانات پاس کر کے آئے تھے۔ آزادی کے بعد ان میں سے بہت سے افسران کو حکومت ہند میں بڑی ذمہ داری کے کاموں کے کرنے کا موقعہ ملا مثلاً نواب علی یاور جنگ۔ سید علی نقی۔ نرندر بہادر۔

مگر حیدرآباد کی فضا درباری سازشوں اور گروہ بندی کی وجہ سے کچھ ایسی تھی کہ ہوشمند اور قابل افسران کی اہلیت اور صلاحیت ایک حد تک مفلوج ہو جاتی تھی۔

حیدرآباد کی ایک خصوصیت میں نے یہ دیکھی۔ حیدرآباد میں کسی حیثیت یا کسی مذہب کا شخص ہو۔ تہذیب و تمیز۔ آداب مجلس اور عام کلچر ہمارے اطراف سے بہتر تھا۔ یہ فرق اتنا ظاہر ہے کہ مجھ سے بہت سے افسران حکومت نے جو دوسرے مقامات سے بدل کر وہاں گئے اس کا ذکر کیا۔ یہ اس پرانی تہذیب کا اثر ہے کہ جو صدیوں۔ بلا تفریق مذہب و ملت بلا تفریق مرتبہ اس حصہ ملک میں رہی مگر اب ختم ہوتی جاتی ہے۔

مالی اعتبار سے وہاں کے باشندوں کی حالت یقیناً بہتر تھی۔ جو عورتیں مزدور پیشہ تھیں اور انہیں "کماٹنی" کہتے تھے وہ بھی سونے کے زیور پہنتی تھیں۔ معیار زندگی نسبتاً ہمارے یہاں سے اونچا تھا حیدرآباد کی ضیافت اور مہماں نوازی مشہور تھی۔ امراء کا معیار زندگی تو اس قدر بلند تھا کہ اُن کی بیگمات سادہ سونے کا زیور اگر جڑاؤ نہ ہو تو استعمال کرنا ناپسند کرتی تھیں زیادہ تر جواہرات کا زیور کافی خیال کیا جاتا تھا۔

رعایا پر زمین کا لگان نسبتاً بہت کم تھا اور انکم ٹیکس کا تو وجود ہی نہ تھا اس لئے عام لوگ مرفہ الحال تھے۔

حکومت حیدرآباد کی کابینہ میں حسب ذیل حضرات تھے۔

احمد سعید۔ پریسیڈنٹ کونسل۔

نواب سر عقیل جنگ وائس پریسیڈنٹ۔

نواب مہدی یار جنگ۔

سید عبدالعزیز صاحب۔

راجہ دہرم کرن۔

سر تھیوڈور ٹاسکر۔

نواب خسرو جنگ۔

نواب سر عقیل جنگ مرحوم۔

یہ نواب عماد الملک صاحبزادے تھے۔ نظام کے بڑے سچے وفادار اور حیدرآباد کی ریاست کے صحیح معنوں میں خیر طلب۔ عقل عام (COMMAN SENSE) کے حامل تھے اُن کا مشورہ دور بینی۔ حیدرآباد کے خاص حالات۔ حضور نظام کے رجحانات اور حکومت ہند کی پالیسی۔ سب امور پر خیال کرتے ہوئے ہوتا تھا۔ مجھے اُن سے بہت مدد ملی۔ مرحوم صحیح معنوں میں "اسم با مسمّیٰ" تھے۔ اُن کا کردار قابل اعتماد تھا۔

نواب مہدی یار جنگ مرحوم

یہ سر عقیل جنگ کے چھوٹے بھائی تھے۔ بے مثل علمی قابلیت کے حامل تھے۔ مشرقی اور مغربی علوم کے ماہر۔ حضور نظام کو اُن پر بڑا اعتماد تھا۔ راز کے کاغذات کا ترجمہ یہی کرتے تھے۔ شرافت مزاج اعلیٰ کردار اُن کی خاص خصوصیت تھی مجھے ان دونوں حضرات سے بڑی تقویت ملتی تھی۔ نواب صاحب مرحوم میں (SENSE OF HUMEOUR ظرافت) بہت لطیف اور نازک تھا مجھے دو واقعات یاد آرہے ہیں۔ ہٹی میں سونے کی ایک کان تھی مگر اُس کے اجزا اتنے کم تھے کہ سونا نکالنے میں کوئی نفع نہیں ہوتا تھا۔ ایک روز اُس کے بجٹ پر گفتگو کرتے ہوئے کہنے لگے یہ (REVERSE GO-D MINE) ہے اس میں سے سونا نکالنے کے بجائے سونا ڈالنا پڑتا ہے"۔ ایک دفعہ مجھ سے حضور نظام کے متعلق فرمانے لگے "ہمارے سرکار اپنی گورنمنٹ کے مستقل لیڈر آف اپوزیشن ہیں" میں نے ہنس کر کہا کہ نواب صاحب لطف یہ ہے کہ حکومت کے اختیارات تو انہی کے ہیں جتنے انہیں دیدیئے گئے مگر

لیڈر آف اپوزیشن کے اختیارات قدرتی اور کامل ہیں بحیثیت حکمراں نظام کے اختیارات قدرتی اور حکومت کے اختیارات جتنے قانونًا دیدیے گئے۔

سید عبدالعزیز صاحب مرحوم۔
یہ بہار کے ایک وکیل تھے قانونی قابلیت بہت اچھی تھی بہت موقعہ شناس اور زمانے کے ساتھ چلنے والے تھے۔

راجہ دہرم کرن۔
یہ ایک بڑے جاگیردار تھے۔ پرانے امراء میں جو سیر چشمی اور وسیع الخیال اُس زمانہ میں پائی جاتی تھی وہ اُن میں پوری طرح موجود تھی نہایت شریف مزاج تھے۔

سر تھیوڈور ٹاسکر۔
نہایت تجربہ کار برٹش I.C.S آفیسر تھے۔ بیحد فرض شناس تھے اور ریزیڈنٹ اور نظام کی حکومت کے درمیان رابطہ قائم رکھتے تھے۔

نواب خسرو جنگ۔
نہایت شریف مزاج اور بھولے تھے۔ کبھی کوئی فعل شرافت سے گرا ہوا نہیں کرتے تھے۔

میرا روزنامہ مورخہ ۱۲ جنوری ۱۹۴۲ء میں حسب ذیل حیدرآباد کے مطالبات درج ہیں۔ نواب کاظم یار جنگ مرحوم سرکار کی طرف سے پیام لائے کہ ان مطالبات کو حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔

(۱) نظام کے اختیارات پر جو قیود عائد ہیں وہ ہٹائے جائیں۔

(۲) جو اضلاع کہ نظام سے لے لئے گئے تھے (CEDED DISTT.) ان میں نظام کی ملکیت تسلیم ہو اور معظم جاہ کو ان کا پرنس سمجھا جائے۔

(۳) نظام کو ہز مجسٹی کا خطاب دیا جائے۔ میں نے جواباً یہ عرض کر دیا کہ
ابھی اس کا موقعہ نہیں ہے۔ اس وقت تو میں اس کی کوشش کر رہا ہوں کہ
ریل کی لائن پر جو حصہ سوہیل نظام کی ریلوے ہے اس میں پولیس کے اختیارات
جو اس وقت تک برٹش کے قبضہ میں تھے وہ حکومت حیدرآباد کو واپس
مل جائیں۔ میرے نزدیک یہ ممکن تھا۔ لیکن جو اضلاع کہ برٹش کے قبضہ
میں چلے گئے ان کی واپسی ممکن نہ تھی۔ اس سلسلہ میں مجھے یاد آرہا ہے کہ جب
واپسی اضلاع کے مسئلہ کو ۱۹۴۶ء اور ۱۹۴۷ء میں سر والٹن مانکٹن سے مشاورت
کے واسطے رکھا گیا تو انہوں نے تمام معاہدے (TREATIES)
کو پڑھنے کے بعد یہ کہا کہ معاہدوں کی رو سے اضلاع نظام کے ہیں۔ مگر
وہ کونسی عدالت ہے جس کے سامنے یہ مقدمہ پیش کیا جائے اور وہ فیصلہ
نافذ کرے۔ منشا یہ تھا کہ یہ امور سیاسی انقلابات کا نتیجہ ہیں جو ڈیل
نہیں ہیں۔

سر والٹن مانکٹن (لارڈ مانکٹن) غیر معمولی لیاقت علمی اور سیاسی تدبر
رکھتے ہیں یہ مسٹر چرچل کی وزارت میں وزیر رہے۔ برٹش شاہی خاندان
کے بھی مشیر قانون رہے ہیں۔ میں نے ایسے صاف دماغ کے لوگ بہت
کم دیکھے ہیں۔ تفصیلات کے خس و خاشاک اور غیر ضروری مسائل سے
بچکر معاملے کی تہ تک فوراً پہونچتے تھے۔ یہ اس زمانہ میں حیدرآباد کے
مشیر قانون تھے اور نظام کے سچے خیر طلب۔

ہز مجسٹی کے خطاب کے متعلق بھی میں نے دہلی میں بعض اکابرین
سے گفتگو کی اس وقت نام یاد نہیں آتا مگر ذیل فقرہ دہلی میں کسی نے
کہا۔ بات پتہ کی ہے۔ اور میرے پاس اس کا جواب نہ تھا۔ "ہز مجسٹی
کا خطاب دیا نہیں جاتا۔ حاصل کیا جاتا ہے۔ جسے ہز مجسٹی کسی دوسرے
نے بنایا وہ تو ماتحت ہی رہا۔"

نظام کے اختیارات پر قیود کے متعلق میری کوشش بارآور نہیں ہوئی۔ وہ قیود اس وقت تک قائم رہے جب تک انگریز نے ہندوستان سے چلے جانے کا پختہ ارادہ نہ کرلیا۔

نواب کاظم یار جنگ مرحوم۔

حیدرآباد کی اُس زمانہ کی تصویر نامکمل رہے گی اگر نواب کاظم یار جنگ کا ذکر نہ ہو۔ یوں تو یہ سکریٹری پیشی تھے اور بعد کو وزیر پیشی ہو گئے ان کے فرائض وہی تھے جو آج گورنر کے سکریٹری کے ہوتے ہیں لیکن حیدرآباد میں جب گورنمنٹ کی تجاویز نظام کے حکم کے واسطے جاتی تھیں تو یہ پرائیویٹ طور پر نظام کی رائے کو متاثر کرتے تھے۔ یہ سب سے بڑی دشواری تھی۔ نظام کو ان پر اعتماد تھا۔ برٹش حکومت ان کے اثر کو بجا طور پر ناپسند کرتی تھی جس سے انتظام میں وہ علیحدہ ہوتی تھی۔ گو یہ وزیر نہ تھے مگر صدر اعظم کو بعض اوقات اُن سے مشورہ کرنا پڑتا تھا۔ نواب کاظم یار جنگ بہت فہیم تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ حکومت ہند انہیں ناپسند کرتی ہے اور اس وجہ سے سوچ سمجھ کر مداخلت کرتے تھے۔ لیکن حکمران کے مزاج میں ایک ایسے شخص کو دخل ہونا کہ انتظام سلطنت کا ذمہ دار نہ ہو سیاسی اور انتظامی پیچیدگیاں پیدا کر دیتا ہے۔ طاقت بغیر ذمہ داری کے خطرناک ہوتی ہے۔ اور ذمہ داری بغیر طاقت کے مفلوج ہو جاتی ہے۔

حیدرآباد میں سازشیں ایک فن بن گئی تھیں مثلاً ایک واقعہ روزنامچے کا درج کرتا ہوں۔ ۱۴ر جولائی ۱۹۴۲ء کو ڈاکٹر مرزا ضیاء الدین اتحاد المسلمین کے چند لوگوں کے ساتھ میرے پاس آئے اور اُن سے کہا کہ نواب صاحب سے جو کچھ کہنا ہو کہئے اور جو کام لینا ہو لیجئے ان لوگوں کی یہ خواہش تھی کہ ممبران کابینہ کو توسیعات نہ دیجائیں

یہ لوگ سر عقیل جنگ مرحوم اور نواب مہدی یار جنگ کی توسیعات کے خلاف تھے۔ وہ اکبر علی خاں کے خلاف تھے اس لئے کہ وہ اتحاد المسلمین کے ممبر نہ تھے اور چاہتے تھے کہ اکبر علی خاں کی پرستش حکومت کی طرف سے نہ ہو۔ میں نے مہر خاں کو کابینہ کا سکریٹری کیا تھا یہ لوگ اسے پسند کرتے تھے۔ لیکن کاظم یار جنگ اس کے خلاف تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ معین انصاری (جو پھر معین یار جنگ ہوئے) کابینہ کے سکریٹری رہیں اور کوئی تبدیلی نہ ہو۔ چنانچہ سر محمد یعقوب مرحوم کو کاظم یار جنگ نے میرے پاس بھجوایا کہ وہ مجھ پر زور ڈالیں کہ مہر خاں کو نہ کیا جائے۔ یہ فقط اس خیال سے بھیجے گئے تھے کہ یو۔پی کے رہنے والے تھے اور میں بھی یو۔پی کا رہنے والا تھا۔

۱۶ فروری ۱۹۴۲ء کے روز نامچے میں درج ہے کہ ہوش مرحوم جو حضور نظام کے مصاحبین میں سے ایک تھے میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ جب تک برٹش گورنمنٹ اور ریذیڈنٹ سے نظام پر دباؤ نہ ڈلوایا جائے۔ یہاں کام نہیں چل سکتا۔ میں نے اُن سے تو جواب یہی کہا کہ ایسا کرنے سے مجھے حق نمک یاد رکھے گا۔ مگر میں یہ سوچتا رہا کہ جب خود اعلیٰ حضرت کے مصاحب ایسا مشورہ دیں تو اس کے دو ہی معنی ہو سکتے ہیں یا ہوش خود اپنے آقا کے وفادار نہ تھے یا میری وفاداری کا امتحان مقصود تھا۔

پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ اور ریذیڈنٹ برابر متوقع رہتے تھے کہ اگر صدر اعظم کو دشواری ہو تو وہ اُسے مدد دیں اور یہ طریقہ وہاں جاری تھا کہ صدر اعظم ایسی مدد لیتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں پہلی بار چارج لینے کے بعد دہلی گیا اور برٹش گورنمنٹ کے پولیٹیکل ایڈوائزر سے ملا تو پہلا سوال ایک نامناسب لفظ کے ساتھ یہ تھا۔ ("HOW IS YOUR RULER")

میں نے اُن سے کہا کہ اگر مجھے کوئی نظام سے دشواری ہو گی تو اس کا علاج کروں گا مگر آپ کے پاس شکایت لیکر نہ آؤں گا۔ اور مجھے اس کی مسرت ہے کہ ایسا ہی ہوا۔ باوجود مشکلات کے۔

وہاں کے افسران کسی طرح قابلیت کے لحاظ سے کسی گورنمنٹ کے عام افسران سے کم نہ تھے۔ خاص کر معتمدین (سکریٹری) اپنے کام پر عبور رکھتے تھے۔ ان حضرات میں۔

(۱) نواب علی یاور جنگ کی بہت ممتاز شخصیت تھی۔ اُن کی علمی قابلیت معاملہ فہمی۔ دور اندیشی اور زمانہ شناسی حیدرآباد میں بے مثل تھی۔ یہ وہاں وزیر بھی رہے اور حیدرآباد کی تباہی کے بعد حکومت ہند نے انہیں U.N.O میں ہندوستان کے نمائندے کی حیثیت سے بھیجا اور سفیر کی حیثیت سے ہندوستان کے نمائندے فرانس امریکہ میں ہیں مجھے ان سے بہت مدد ملی۔ اب گورنر بمبئی ہیں۔

معین نواز جنگ۔ نہایت مستور محنتی کارگزار معتمد تھے۔ انگریزی قابلیت بھی اچھی تھی لیکن دور اندیش نہ تھے۔ اتحاد المسلمین کے طرفدار تھے۔ لائق علی صاحب سے جو آخری صدر اعظم میرے بعد ہوئے اُن سے قرابت تھی۔ حیدرآباد میں یہ بھی وزارت کے عہدے تک پہونچے۔ جب انقلاب ہوا تو اس کی تاب نہ لاسکے۔ توازن دماغ کھو بیٹھے۔ اور اب پاکستان میں ہیں

میرے اسٹاف کے لوگوں میں اشفاق صاحب بہت اچھے افسر تھے۔ محنتی۔ فرض شناس اور وفادار مجھے ان سے بہت مدد ملی اور میرے ہی زمانہ میں یہ A.D.C سے ترقی کر کے ڈپٹی ہوم سکریٹری اور پھر کیبنٹ سکریٹری ہوئے۔

والیان ملک میں حیدرآباد کو ایک خصوصیت حاصل تھی۔ رقبہ اور مردم شماری کے اعتبار سے یہ ایک سلطنت تھی۔ یورپ اور ایشیا کے

بہت سے ملک اس سے چھوٹے ہیں۔ اس کا رقبہ جہاں تک مجھے یاد ہے ۸۴۰۰۰ میل مربع تھا اور مردم شماری تقریباً ۱۳۰۰۰۰۰۰ ایک کروڑ تیس لاکھ تھی ریاست کا اپنا سکہ تھا۔ اپنا ڈاکخانہ اور اسٹیمپ ہوتے تھے اپنی ریلوے تھی اور میرے ہی زمانہ میں ہوائی جہاز کی سروس بھی ہو گئی تھی۔ جس کا نام دکن ایرویز تھا۔ اس کے جہاز مدراس بنگلور اور دہلی سے حیدرآباد کو ملاتے تھے۔ ٹاٹا کی شرکت سے یہ ہوائی سروس جاری ہوئی تھی اور غلام محمد صاحب مرحوم نے ٹاٹا سے بات چیت کر کے اسے جاری کیا۔

وہاں کی مالی حالت اور ہندوستان کی حکومتوں سے زیادہ مضبوط تھی جتنے نوٹ ملک میں ہوتے تھے کم از کم اس کا ایک تہائی چاندی اور سونے کی شکل میں خزانہ ریاست میں رہتا تھا۔

سر اکبر حیدری مرحوم

وہاں کے فائننس کے اصلاع میں سر اکبر حیدری مرحوم کا بہت بڑا حصہ تھا۔ سر اکبر نے اپنے زمانہ میں بہت سی اصلاحیں کیں جس میں عثمانیہ یونیورسٹی ان کا شاہکار رہے اور ان کی بہترین یادگار رہے گی۔ حیدرآباد بنک کا قیام بھی انہیں کے زمانہ میں ہو گیا تھا۔ گو اس کی ترقی اور توسیع میرے زمانہ میں ہوئی۔ سر اکبر نے بہت سے تعمیری کام حیدرآباد میں کئے مگر اہل حیدرآباد نے کبھی قدر نہ کی اور وہ ہمیشہ ملامت کا نشانہ بنے رہے۔

عثمانیہ یونیورسٹی اردو کی یونیورسٹی بنائی گئی تھی۔ یہ پہلی یونیورسٹی تھی جو ہندوستان کی زبان میں تعلیم دے رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک صیغہ دارالترجمہ قائم کیا گیا جو علوم فنون کی کتابوں کا ترجمہ انگریزی سے اردو میں کرتا تھا مجھے یاد ہے کہ ایک بار بحیثیت چانسلر کے ایک نوٹ دارالترجمہ کی ہدایت کے واسطے لکھا تھا کہ اردو کے ترجمہ ایسی زبان میں کریں کہ جو عام فہم ہو۔ جو غلطی کہ آج ہندوستان میں ہندی کے ترجموں میں

کی جا رہی ہے۔ وہی غلطی حیدرآباد میں اُردو ترجموں میں کیجاتی تھی۔ مجھے افسوس ہے کہ اب عثمانیہ کی یہ حیثیت باقی نہیں رہی اب تعلیم انگریزی میں ہوتی ہے۔

ایک بار سری راجگوپال آچاری کو یونیورسٹی نے مدعو کیا اور انہیں ڈاکٹری کی ڈگری دی۔ اپنی تقریر میں انہوں نے یہ کہا کہ اس کی کوشش کی جائے کہ ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی یونیورسٹیاں کھلیں لیکن اُردو کی یونیورسٹی کی مخالفت کرنا غلطی ہے۔ جب راجہ جی بحیثیت گورنر جنرل مسلم یونیورسٹی میں تشریف لائے اور یونیورسٹی نے انہیں ڈاکٹر آف لاء کی ڈگری دی تو مجھ سے یہ فرمانے لگے کہ مجھے سب سے زیادہ خوشی اُس پہلی ڈاکٹریٹ کی ہوئی جو آپ نے عثمانیہ یونیورسٹی کے چانسلر کی حیثیت سے دی تھی۔ اُن کا قیام علی گڑھ میں راحت منزل میں ہوا تھا۔

حیدرآباد کے انجینئر کسی طرح برٹش انڈیا کے انجینیروں سے علمی قابلیت اور عملی کارگذاری میں کم نہ تھے۔ نظام ساگر، حمایت ساگر، عثمان ساگر اور عثمانیہ یونیورسٹی کا آرٹ کالج اُن کی قابلیت کی ناقابل تردید شہادت ہیں

میری مختصراً رائے یہ ہے کہ حیدرآباد کی انتظامی مشین بُری نہ تھی لیکن درباری سازشیں دشواریاں پیدا کرتی تھیں۔

وہاں کے انتظامی دروبست میں جمہوریت نہ تھی۔ وہاں کی رعایا بالخصوص ہندو رعایا میں اس کا احساس اچھی طرح شروع ہو گیا تھا۔ سر اکبر حیدری مرحوم نے اپنے زمانہ میں اصلاحات کو نافذ کرنا چاہا تھا لیکن جنگ کے شروع ہو جانے کی وجہ سے انہیں سر اکبر حیدری نے ملتوی کر دیا۔

لہٰذا یہ تجویز خیال میں آئی کہ انتخاب کے ذریعہ کونسل تو جنگ کے بعد بنے لیکن نامزدگی کے ذریعہ سے مختلف محکموں میں کمیٹیاں بنا دی جائیں تاکہ حکومت عوام کے نقطہ نظر سے بے خبر نہ رہے اور حیدرآباد کے شہری

بھی یہ سمجھیں کہ انتظام ریاست میں وہ بھی شریک ہیں۔ اس کے متعلق مختلف جماعتوں سے بات چیت ہوئی۔ لیکن اس میں بھی ایک دشواری پیدا ہو گئی۔

۱۹ جنوری ۱۹۴۲ء کے روز نامچے میں لکھا ہے کہ اس مسئلہ پر گفتگو وزراء کی میٹنگ میں ہوئی۔ علی یاور جنگ کا بیان تھا کہ طے یہ ہوا تھا کہ ہندو اور مسلمانوں کی تعداد برابر ہو۔ انصاری (معین نواز جنگ) کہتے تھے کہ مسلم اور غیر مسلم کی تعداد برابر ہو۔ میں نے عبدالعزیز صاحب وزیر عدالت سے کہا کہ آپ اتحاد المسلمین اور ہندو حضرات سے مل کر طے کیجئے۔

مسلمانوں کا یہ مطالبہ خلاف انصاف بھی تھا اور خلاف مصلحت بھی۔ ہندو اکثریت اس پر راضی تھی کہ مسلمان اقلیت کو برابر کا حصہ دیدیا جائے لیکن عیسائی، سکھ وغیرہ کے نمائندے الگ ہوں۔ مسلمان پورے ہاؤس میں برابری چاہتے تھے۔ مجھے افسوس ہے کہ مسلمانان حیدرآباد کو اس کا احساس نہ تھا کہ باہم فیصلہ سے جو کچھ طے ہو جاتا ہے۔ اس میں اخلاقی طاقت بہت ہوتی ہے اور قانوناً بھی ایک معاہدہ کی شکل ہو جاتی ہے۔ اسی زمانے میں یہ خبر مشہور ہو گئی کہ میدان جنگ میں حیدرآباد کی فوج کو اتنے اچھے ہتھیار نہیں دیئے جاتے جیسے کہ دینے چاہئیں۔ میں ۲۳ جنوری ۱۹۴۲ء کو خسرو جنگ (وزیر فوج) اور راز روس (کمانڈر فوج) کو ساتھ لیکر ریزیڈنٹ سے ملا اول تو ریزیڈنٹ بہت چراغ پا ہوئے اور کہنے لگے کہ ایسی شہرت دینے والوں پر فوراً مقدمہ چلانا چاہیئے میں نے اس سے اختلاف کیا اس واسطے کہ اگر یہ ہوا تو فوج میں بھرتی بند ہو جائے گی۔ اس کا علاج یہ ہے کہ حیدرآباد کی فوج کو اچھے ہتھیار نہیں دیئے جائیں تاکہ ان سے وہ مشق کر سکیں اور لوگوں کو معلوم ہو کہ بہترین ہتھیاروں سے یہ مسلح ہیں۔

آج مجھے ریزیڈنٹ سے یہ معلوم ہوا کہ حکومت ہند نے اسے منظور

کر لیا کہ نظام کے روزِ پیدائش پر جیسا حیدرآباد میں ہوتا ہے۔ برابر ہمیں بھی تعطیل ہوا کرے۔ اعلیٰ حضرت نے اس خبر پر ۲۴ جنوری کو اظہارِ مسرت کیا اور تغیر زمانہ کو فالِ نیک قرار دیا۔ نیم سرکاری خط سے مبارکباد دی۔

۲ فروری ۴۲ء کو میں دہلی ڈیفنس کونسل کی میٹنگ کی غرض سے گیا تھا۔ حضور نظام کا تار آیا کہ بڑے پرنس کو G.C.I.E اور چھوٹے کو ہز ہائینس کا خطاب ملنا چاہیئے۔ اس کے متعلق زبانی بھی کئی بار فرما چکے تھے۔ میں یہ چاہتا تھا کہ سب سے پہلے ریلوے لائن پر جو برٹش حکومت کو اپنی پولیس رکھنے کا اختیار رہے وہ ختم ہو۔ کسی ایک حصہ ملک میں دو حکومتوں کی پولیس ہونا ایک طرف تو انتظامی خرابی کا باعث اور دوسری جانب ریاست کے اندرونی خود مختاری میں مداخلت تھی۔ حیدرآباد میں چھ سو میل کی ریلوے لائن اور اسٹیشنوں پر برٹش پولیس تھی۔ گویا یہ حصے برٹش انڈیا کا ایک حصہ تھے۔ میں نے اس کے متعلق پولیٹیکل سکریٹری سر کنفلڈ اور وبسر سے بات چیت کی اور شہزادوں کے خطابات کا بھی ذکر کیا۔

حیدرآباد کی واپسی پر ۱۱ فروری ۴۲ء کو اعلیٰ حضرت کے پاس حاضر ہوا۔ دریافت کرنے لگے کہ دہلی میں کیا گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا برٹش گورنمنٹ نے اسے مان لیا کہ پولیس کے جو اختیارات ریلوے لائن اور اسٹیشنوں پر انہیں حاصل ہیں وہ واپس کر دیئے جائیں۔ جس پر فرمایا کہ یہ تو چھوٹی موٹی باتیں ہیں ہوتی رہیں گی۔ مجھے یہ عرض کرنا پڑا کہ یہ چیزیں زیادہ اہم ہیں۔ اس میں ہماری آزادی اور حقوقِ ملکیت کا سوال ہے پھر پرنس اعظم جاہ اور معظم جاہ کے خطابات کے متعلق فرماتے رہے میں نے عرض کیا کہ پرنس اعظم جاہ کو G.C.I.E مل جائے گا۔

اعلیٰ حضرت کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جنگی ضروریات کے واسطے برٹش حکومت اُن کا ذاتی روپیہ نہ چھین لے۔

میں نے عرض کیا کہ اگر اس مسئلہ کو میں دہلی میں چھیڑوں تو وہ یہ دریافت کر سکتے ہیں کہ یہ "تمہارا خیال ہے یا حضور نظام کا" پھر میں نے عرض کیا کہ نظام کی دولت ایک فرد واحد کے واسطے بہت بڑی چیز ہے مگر ایک سلطنت کے واسطے جو بیس کروڑ روزانہ جنگ پر خرچ کر رہی ہو یہ کوئی بڑی چیز نہیں ہے فرمانے لگے کہ فرض کرو ہمارے پاس پچاس لاکھ روپیہ ہے۔ میں نے عرض کیا کہ سرکار کا منشا پچاس کروڑ ہے فرمانے لگے "ہاں تو یہ لڑائی کا چار پانچ روز کا خرچ ہوگا" میں نے کہا "کہ فقط ڈہائی دن کا" پھر کچھ ایسی باتیں ہوتی رہیں کہ یہ خبر گشت کر رہی ہے کہ مجھے شاید دہلی بلالیا جائے۔ میں نے عرض کیا کہ مجھے اس کے متعلق کوئی علم نہیں۔

ایک مسئلہ کے متعلق میں نے توجہ دلائی۔ وہ مسئلہ یہ تھا کہ امرائے پائیگاہ کو اپنی فوجیں رکھنے کا حق تھا۔ امرائے پائیگاہ کا مرتبہ جاگیرداروں سے بڑا سمجھا جاتا تھا۔ یہ وہ خاندان تھے جن سابق حکمراں حضرات کی صاحبزادیاں کی شادیاں کی گئی تھیں۔ انہیں اپنی فوجیں۔ اپنی پولیس اپنے قید خانہ رکھنے کا حق حاصل تھا تاکہ جس وقت نظام کو ضرورت ہو تو ان کی فوجیں بھی حاضر ہو جائیں انہیں جاگیریں دی گئی تھیں جن پر کوئی مالگذاری نہ تھی نہ کوئی اور ٹیکس حکومت لیتی تھی۔ یہ طریقہ زمانہ سابقہ میں کتنا ہی درست ہو مگر اس زمانہ میں نہ اس کی ضرورت تھی۔ میں چاہتا تھا کہ یہ فوجیں ریاست کی فوجوں کے ساتھ ملا دی جائیں تاکہ انہیں اچھے ہتھیار اور مناسب حال تربیت دیجائے۔ جاپان برابر بڑہتا آرہا تھا اور یہ اندیشہ بھی سرکاری طور بتایا گیا کہ ممکن ہے جاپانی جنگی جہاز مدراس پر فوجیں اتار دیں۔ دوسرا مسئلہ کیبنٹ سکریٹری کے تقرر کا تھا۔ میرا معروضہ میر خاں کے متعلق عرصہ سے گیا تھا مگر حکم صادر نہیں ہوا تھا۔ مجھے افسوس ہوا جب اعلیٰ حضرت نے یہ فرمایا مجھے ان باتوں سے دلچسپی نہیں کاظم یار جنگ سے بات کر لیجئے۔ ۱۱ فروری کے

روزنامچہ میں اس واقعہ کو "میں نے ریاست کی بدنصیبی" لکھا ہے۔

۱۳ر فروری سر اکبر حیدری کے چہلم میں "دلکشا" مکان میں شریک ہوا مرحوم کو حیدرآباد اور اس مکان سے اس قدر محبت تھی کہ گو انتقال دہلی میں ہوا تھا مگر اُن کا جنازہ حیدرآباد لایا گیا اور اُس مکان میں جہاں وہ رہا کرتے تھے رکھا گیا۔ اسی روز اعلیٰ حضرت بھی یہاں آئے تھے۔ میں مرحوم کے دفن میں شریک تھا مجھے یہ دیکھ کر بہت افسوس ہوا تھا کہ جب مرحوم صدر اعظم تھے تو حیدرآباد کے لوگ آنکھیں بچھاتے تھے۔ مگر جنازہ میں بہت کم لوگوں نے شرکت کی جس کی وجہ یہ تھی کہ نظام اُن سے ناخوش تھے۔ اس میں اہل حیدرآباد کی کیا شکایت۔ عروج و زوال سے لوگ متاثر ہوتے ہیں یہ انسانی سیرت کی کمزوری اور کردار کا تاریک پہلو ہے۔

۱۴ر فروری کو میں نے ریزیڈنٹ سے گفتگو کی کہ غلام محمد صاحب مرحوم کو یہاں لایا جائے ریزیڈنٹ نے زاہد صاحب مرحوم کا نام لیا۔ میں ان سے بھی واقف تھا اور اب یہ خیال کرتا ہوں کہ اُن کا انتخاب بہتر ہوتا۔ مگر میری رائے اس وقت غلام محمد صاحب مرحوم کے واسطے قائم رہی اور میں نے نظام کو یہ تجویز بذریعہ عریضہ بھیجدی۔ تجربہ نے بتایا کہ شاید زاہد صاحب مرحوم کا آنا بہتر ہوتا۔

(غلام محمد صاحب مرحوم)

یہ بیحد ذہین اور معاملہ فہم تھے۔ یہ گورنمنٹ میں ریلوے صیغہ میں فنانس کے سکریٹری تھے۔ میں انہیں حیدرآباد فنانس منسٹر کی حیثیت سے لے گیا تھا۔ طبیعت رسا پائی تھی۔ مسئلہ کیسا ہی مشکل اور لاینحل ہو۔ مرحوم کوئی نہ کوئی حل ضرور نکال لیتے تھے۔ تقسیم ملک کے بعد وہ پاکستان کے فنانس منسٹر اور پھر گورنر جنرل ہوئے جس چیز کے حاصل کرنے کا خیال کرلیتے تھے اس کے حصول میں کسی کوشش سے دریغ نہیں کرتے تھے حصول

مقصد کے لئے انتخاب ذرائع میں مناسب اور نامناسب کا خیال نہیں کرتے
تھے۔ مرحوم علی گڑھ کے تعلیم یافتہ تھے۔ تین سال حیدرآباد میں رہے۔ ٹاٹا
کی شرکت میں "دکن ایئرویز" انہیں کی کوشش کا نتیجہ تھی جس سے حیدر
آباد، دہلی، بنگلور اور مدراس میں ہوائی سروس شروع ہوئی۔ مجھے اس
دوران میں اُن سے کچھ شکوہ ہو گیا تھا مگر وہ سب ۱۹۵۵ء کے اس واقعہ
کے بعد ختم ہو گیا۔ میں فنلینڈ ایک پارلیمنٹ کے ڈیپوٹیشن میں گیا تھا۔ واپسی
کا سفر سمندری جہاز سے کیا۔ جہاز بارہ گھنٹے کے واسطے کراچی ٹھہرا۔ راحت
میاں سلمہٗ نے وہاں ایک لنچ کا انتظام اپنے مکان پر کیا تھا جس میں گورنر
جنرل۔ اسکندر مرزا۔ سر ناظم الدین مرحوم شہید سہروردی مرحوم اور وزراء
اور عمائدین شریک تھے۔ غلام محمد صاحب مرحوم مفلوج ہو چکے تھے اور
شریک نہ ہونے کی معافی چاہی تھی اور سلام کہا تھا۔ میں نے راحت میاں
سے کہا کہ میں خود اُن سے ملنے جاؤں گا۔

لنچ کے بعد گیا۔ ایک علی گڑھ کے بھائی پر اپنے دوست اور شریک
کار کو جس حال میں دیکھا۔ اس سے یوں ہی متاثر تھا۔ ایک باغ و بہار
شخص۔ کام کرنے کا دھنی۔ جارحانہ پالیسی کا قائل۔ گورنر جنرل ہونے
کے بعد یوں مفلوج و معذور ہو جائے۔ یہ سین بہت ہی افسردہ کرنے
والا تھا۔ میں کمرے میں داخل ہوا۔ مرحوم نے اپنی کرسی سے اٹھنے کی کوشش
کی مگر میں نے لپک کر انہیں پکڑ لیا اور جھک کر سینے سے لگا لیا۔ پاس بیٹھ
گیا۔ زبان میں لکنت ہو گئی تھی اور گفتگو مشکل سے سمجھ میں آتی تھی۔ مجھے
انہیں اس حال میں دیکھ کر بہت تکلیف اور صدمہ ہوا۔ جب ملاقات ختم
ہونے کے بعد میں رخصت ہونے لگا۔ مرحوم نے پھر اٹھنے کی کوشش کی
میں نے روکا۔ مگر مرحوم نے راحت سلمہٗ کو ڈانٹ کر کہا "مجھے اٹھاؤ مجھے
اٹھاؤ" راحت میاں نے بغلوں میں ہاتھ ڈال کر انہیں اٹھایا۔ مرحوم نے

رخصتی مصافحہ کرتے ہوئے کہا" نواب صاحب اگر آپ میرے جنازہ پر بھی
آ گئے اور مجھے اس کا احساس ہوا تو میں کھڑا ہو جاؤں گا" دل تڑپ گیا۔
آنسو بھر آئے۔ اس فقرے کو سنکر میرے دل کی کیا کیفیت ہوئی۔

دل من داند و من دانم و داند دل من

سر تھیوڈور ٹاسکر کے ریٹائر ہونے کا وقت آ گیا تھا۔ ریذیڈنٹ
یہ چاہتے تھے کہ انہیں کچھ روز رکھا جائے اور مسٹر گرگس کو ایک زائد ممبر
بحیثیت وزیر کے کر لیا جائے اس پر نہ مجھے اتفاق تھا نہ اعلیٰ حضرت کو۔
میں نے صاف کہدیا کہ وزارت میں ایک سے زیادہ انگریز نظام ہرگز
منظور نہ کرینگے۔ آخر یہ ہی طے ہوا کہ ایک ہی انگریز وزیر ہوگا۔
۲۴ مارچ ۱۹۴۲ء کو میر خاں معتمد باب حکومت (کیبنٹ سکریٹری)
ہوگئے پھر کچھ روز کے بعد میر نواز جنگ کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔
۷ مارچ ۱۹۴۲ء کو میں کنگ کوٹھی حاضر ہوا۔ اعلیٰ حضرت اس سے
مطمئن تھے کہ ریذیڈنٹ نے اسے مان لیا کہ ایک ہی انگریز وزیر رہے
اور دوسرا جیسا کہ اب تک ہو رہا تھا۔
(DIRECTOR OF REVENUE) رہے۔ اس کے بعد فرمانے
لگے کہ" جنگ کے بعد میں یہ پانچ پوئنٹ اٹھاؤنگا۔

(۱) اور والیان ملک سے علیحدہ ہماری بادشاہت تسلیم کی جائے۔
ایک خودمختار ریاست مانا جائے۔

(۲) برار، سیلی پٹم اور دوسرے اضلاع جو انگریزوں کو معاہدے
کی بنا پر دیدیئے تھے واپس ہوں۔

(۳) سکندرآباد سے فوج ہٹالی جائے۔

(۴) ہم جتنی چاہیں فوج رکھ سکیں۔

(۵) ہم اپنے ہتھیار آپ بنا سکیں۔

میں اب یہ سوچا کرتا ہوں "ما درچہ خیالیم و فلک درچہ خیال" کیا غلط تصورِ مستقبل کے متعلق تھا۔

۱۳ مارچ ۱۹۴۷ء کو غلام محمد مرحوم حیدرآباد پہونچے۔ اُن سے یہ معلوم ہوا کہ سید عبدالعزیز صاحب مرحوم نے دہلی میں یہ مشہور کیا ہے کہ حیدرآباد میں۔ میں بہت غیر ہر دلعزیز ہوں۔ میں غلام محمد صاحب کو وہاں کے حالات کے متعلق بتاتا رہا اور غلام محمد صاحب کے تقرر کے لئے حضور نظام کو عرضداشت لکھ کر بھیجدی۔

۱۶ مارچ ۱۹۴۷ء کو پھر کاظم یار جنگ آئے۔ منجملہ بہت سے احکامات کے یہ بھی حکم تھا کہ حیدرآباد کے حقوق کے متعلق ایک نوٹ تیار کیا جائے اور اس وقت موقعہ ہے آزادی کے حصول کی کوشش کی جائے اور اس سلسلہ میں نواب بہادر یار جنگ مرحوم کے ذریعہ سے پبلک میں ایجیٹیشن کرایا جاسکتا ہے میں نے اس سے اختلاف کیا اور کاظم یار جنگ سے کہا کہ ایسا کرنا خلاف مصلحت ہوگا۔

نواب بہادر یار جنگ مرحوم

یہ ایک جاگیردار بھی تھے اور پبلک لیڈر بھی۔ ان کا نام بہادر خاں تھا۔ اردو کی تقریر بہت اچھی ہوتی تھی۔ حیدرآباد کی ریاست میں ان سے بہتر اُردو مقرر نہ تھا۔ یہ اتحاد المسلمین کے صدر بلکہ اس کے بانی تھے حیدرآباد میں عام طور پر اور خاص کر مسلمانوں پر ان کا بہت اثر تھا گو زمانہ حال کے معیار سے ان کی علمی قابلیت کچھ زیادہ نہ تھی۔ مگر باری تعالےٰ نے انہیں عقل عام (COMMON SENSE) سے نوازا تھا جس کے بغیر علمی قابلیت بیکار رہتی ہے بلکہ علمی قابلیت بغیر عقل عام بعض وقات خطرناک ہو جاتی ہے۔

ایک بار دوران گفتگو میں مجھ سے فرمایا کہ سر اکبر حیدری مرحوم کے

زمانہ میں اس کی ابتدا ہوئی۔ ممکن ہے اس زمانہ میں آریہ سماج نے ایجیٹیشن کیا تھا اور یہ اُس کا ردِ عمل ہو بہادر یار جنگ نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ سر اکبر مرحوم نے اُنہیں کسی دوسرے نام سے چالیس یا پچاس ہزار روپیہ بھی اس کام کے واسطے دیا تھا۔ میرے خیال میں یہ غلطی تھی۔ حکمراں جماعت کے واسطے جداگانہ تنظیم مفید نہیں ہو سکتی۔ اس کی وجہ سے لوگوں کی وفاداری پر اثر پڑتا ہے اور ہر گورنمنٹ کو کوشش کرنی چاہیئے کہ اُسے ہر جماعت کا اعتماد حاصل ہو سکے۔ معترض ہونا دوسری بات ہے اعتراض کرنے کا حق سب کو ہے لیکن وفاداری متاثر ہونا بالکل اور چیز ہے۔

مجھے نواب صدر یار جنگ سے یہ معلوم ہوا کہ جاپان کے بڑھتے ہوئے سیلاب کی وجہ سے برٹش گورنمنٹ کو بڑا اندیشہ ہے کہ برما پر تو جاپان کا قبضہ ہو گیا اور ممکن ہے کہ جنگی جہازوں کے ذریعہ مدراس کے ساحل پر جاپانی فوجیں آجائیں۔ اس لئے برٹش گورنمنٹ کو یہ اختیار ہونا چاہیئے کہ جب چاہے "مارشل لاء" لگا دے۔

مجھے اس کے متعلق کوئی علم نہ تھا۔ صرف اتنا معلوم تھا کہ اس روز ایک میٹنگ ریزیڈنٹ کے ہاں تھی تاکہ اگر حملہ ہو تو عوام کو بچاؤ کے واسطے کیا کرنا چاہیئے اس پر غور کیا جائے وہاں دورانِ گفتگو میں یہ معلوم ہوا کہ مدراس کے کنارے پر ایسے لوگ مامور کئے گئے ہیں کہ جو سائیکل لئے یہ دیکھتے ہیں کہ اگر کوئی ہوائی یا سمندری جہاز دشمن کا نظر آئے تو فوراً اطلاع دیں بعض لوگوں کو دس یا پندرہ میل سائیکل پر سفر کرنا ہو گا تب وہ فون کر سکیں گے۔ میں نے کہا کہ اس سے کیا فائدہ ہو گا یہ خبریں تو "بم باری" کے بعد پہنچیں گی۔ طے پایا کہ انہیں ٹرانسمیٹر دیئے جائیں تاکہ فوراً خبر کر سکیں پھر یکایک ریزیڈنٹ نے کہا کہ برٹش حکومت کو یہ اختیار ہونا چاہیئے کہ جب چاہیں ریاست کے رقبہ میں مارشل لاء جاری کر دیں اور اختیارات

جنوبی کمانڈ کو دیدیں میں نے کہا جب آپ کہیں گے "مارشل لاء" جاری کر دینگے آپ یہ اختیار کیوں لینا چاہتے ہیں وہ کہنے لگے کہ حملہ ہو جانے پر صلاح مشورہ ناممکن ہے میں نے کہا کہ حملہ کے بعد تو ایک مختلف ذہنیت پیدا ہو جائے گی لیکن اگر آج ایسا کیا جائے گا تو لوگوں میں پریشانی بڑھیگی اور گھبرا جائیں گے۔ انہوں نے مان لیا۔ کسی فوجی جنرل کو "مارشل لاء" لگانے کا اختیار دینا غلطی ہے۔

گھر آکر مجھے خاص وحشت ہوگئی کہ اگر جاپانی فوجیں مدراس پہ آگئیں تو پورا جنوبی ہندوستان خطرے میں آجائیگا۔

۱۸ مارچ کو ملاقات کے موقعہ پر میں نے اعلیٰ حضرت سے عرض کیا کہ اس زمانہ میں کوئی شورش بہادر یار جنگ کے ذریعہ سے کرانا مناسب نہ ہوگا۔ اول تو انگریز یہ سمجھے گا کہ میری پریشانی سے بیجا نفع اٹھانا چاہتے ہیں اور چونکہ شورش فقط مسلمان کر رہے ہونگے تو سارے ملک کی تحریک نہیں سمجھی جائے گی اور ممکن ہے کہ ہندو صاحبان اس کے خلاف شورش کریں۔ مگر نظام یہ ہی کہتے رہے کہ انگریز بغیر شورش کے کچھ نہ دیں گے۔

دوسرے روز جو میں حاضر ہوا تو حضور نظام نے یہ فرمایا کہ ابوالحسن سید علی (جو اتحاد کے ایک رکن تھے) نے یہ لکھا ہے کہ مسلمانان حیدر آباد کو میری گورنمنٹ پر اعتماد نہیں ہے اس لئے کہ اہم امور میں میری گورنمنٹ کچھ نہیں کرتی۔ اہم امور سے مثلاً ہز ہائینس کا خطاب ، برار کی واپسی وغیرہ تھا۔ اس حالت میں وہ شورش کرنے پر آمادہ ہیں اسے جب سرکار نے بار بار فرمایا تو مجھے کہنا پڑا کہ فدوی نے تو جس روز تقرر ہوا تھا عرض کر دیا تھا کہ تقرر کتنے ہی روز کے واسطے ہو لیکن حضور جس روز چاہیں گے میں چلا جاؤں گا یہ بات نہیں ختم ہوگئی۔

۲۰ مارچ ۱۹۴۲ء کو بہادر یار جنگ میرے پاس آئے میں نے اُن

سے شکوہ کیا کہ ابو الحسن سید علی نے اتحاد المسلمین کی طرف سے اس قسم کا خط سرکار کو بھیجا ان سے معلوم ہوا کہ سرکار کا ایک فرمان ابو الحسن کے پاس آیا تھا جس میں حیدر آباد کے حقوق کے متعلق ذکر تھا۔ہم نے جواباً یہ عرض کیا کہ سرکار ان چیزوں سے ہمیں الگ رکھیں ورنہ دشواریاں پیدا ہونگی ہم اپنا فرض ادا کریں گے جس طرح بہتر ہوگا۔

سر اسٹیفورڈ کرپس کی آمد

ان کی آمد نے نہ صرف والیان ملک میں بلکہ کانگریس۔لیگ اور مختلف سیاسی جماعتوں میں ہیجان پیدا کر دیا میں ان سے پہلے بھی سر تیج بہادر سپرو کے گھر شاید ۲۳ء یا ۲۴ء میں ملا تھا۔ یہ ہندوستان کی آزادی کے طرفدار تھے مزدور پارٹی کے قائدین میں سے ایک تھے۔نہایت ذہین معاملہ فہم اور مردم شناس شخصیت کے حامل تھے۔اسی کے ساتھ بہت اچھے ڈپلومیٹ تھے جتنی تجاویز لائے تھے وہ سب ایسی تھیں کہ ہر فریق اس کے معنیٰ اپنے حسب منشاء سمجھتا تھا۔والیان ملک اور ان کے وزراء عجیب کش مکش میں تھے۔ایک جانب تو یہ اس سے خوش تھے کہ آئندہ حکومت ہند کے ریزیڈنٹ کا دخل نہیں رہے گا۔لیکن یہ نہ وزراء کی سمجھ میں آتا تھا اور نہ والیان ملک کی کہ جمہوری آزاد ہندوستانی گورنمنٹ کے ساتھ موروثی شخصی حکمرانی کا جوڑ کیسے ملے گا اُن قیام کی ذمہ دار تو برٹش گورنمنٹ تھی مگر کوئی پرنس یہ خیال نہیں کرتا تھا کہ اس کے ہٹنے کے بعد کیا ہوگا۔مجھے یقین ہے کہ اگر برٹش حکومت معاہدوں کی وجہ سے والیان ملک کی حفاظت کی ذمہ داری نہ لیتی تو ان میں سے بعض ریاستیں ختم ہوگئی ہوتیں لیکن دوسری جانب بعض ایسی ریاستیں بھی تھیں کہ اگر برٹش اتالیق نہ ہوتے تو وہ ذہنی طور پر مفلوج نہ ہوجاتیں اور اپنی رعایا سے بے تعلق ہوجانا والیان ملک کی اصل کمزوری تھی۔

حیدرآباد میں یہ ایک عام توہم تھا جو حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوا کہ موجودہ نظام جو ساتویں نظام تھے۔ حیدرآباد کے آخری نظام ہیں۔

قصّہ یوں مشہور ہے کہ آصف جاہ اول دہلی سے حیدرآباد کے لئے روانہ ہوئے تو راستہ میں کسی بزرگ کے پاس حاضر ہوئے۔ جن کے وہ معتقد تھے اور عرض کیا کہ موصوف دعا فرمائیں۔ ان بزرگ نے آصف جاہ کو رخصت کرتے وقت ایک زرد چادر میں سات روٹیاں لپیٹ کر دیں اور دعا دی کہ جاؤ تمہاری سات پشت حکمراں رہے گی" نظام حال چونکہ ساتویں نظام تھے اس لئے لوگوں کا عام خیال تھا کہ یہ آخری حکمراں ہیں۔ حیدرآباد کے جھنڈے کا رنگ زرد اور اس میں ایک گول نشان اُسی زرد چادر اور کلچوں کی نمائندگی کرتا تھا کہ جو اُن بزرگ نے آصف جاہ اول کو عطا کی تھیں۔

سر اسٹیفرڈ کرپس کے آنے سے ہندوستان کے مستقبل کی طرف ہر ایک متوجہ ہوگیا ہر فریق اپنے خیال کے مطابق آزاد ہندوستان کی تصویر اپنے ذہن میں بناتا تھا۔ اور سمجھتا کہ آئندہ ہندوستان کا نظام اسی نہج پر ہوگا۔ اس غلط فہمی میں سر اسٹیفرڈ کرپس کی گفتگو سے کچھ اضافہ ہو جاتا تھا۔ کانگریس، مسلم لیگ اور والیان ملک اپنے اپنے تصور کے مطابق مستقبل کی تصویر بناتے تھے لیکن آزاد ہندوستان کا جو تصور والیان ریاست کے ذہن میں تھا وہ سب سے زیادہ غلط تھا۔ وہ یہ خیال کرتے تھے کہ آزاد ہندوستان میں اُن کی وہی حیثیت ہوگی جو برٹش گورنمنٹ کے آنے سے پہلے تھی۔ انہیں اس کا گمان بھی نہ تھا کہ جمہوریت کا سیلاب ان کو بہا لے جائے گا۔ سارے ملک میں جمہوری حکومت ہو اور ریاستوں میں شخصی حکومت باقی رہے" اجتماع ضدین" کیسے ممکن ہوگا یہ بات ان کے ذہن میں نہیں آتی تھی۔

اعلیٰ حضرت نے حکم دیا کہ حیدرآباد کی طرف سے جو مطالبہ پیش کرنا ہے اُس پر علی یاور جنگ بہادر ایک یادداشت تیار کریں جو برٹش گورنمنٹ کے سامنے پیش کی جائے گی۔

جیسا کہ پہلے لکھ چکا ہوں یہ مطالبہ پرانے معاہدوں کی بنا پر تھے۔ جن میں برار اور دوسرے اضلاع کی واپسی کا مطالبہ تھا۔

ہوش مرحوم نے اس کا ذکر مجھ سے کیا جس کی تصدیق بعد کو علی یاور جنگ نے بھی کی کہ اُن کے پاس سرکار کا پیام ناظم یار جنگ کی معرفت پہونچا ہے جس کا خلاصہ یہ تھا کہ اگر تمہاری پالیسی رہی جو فیڈریشن کے زمانہ میں تھی تو بہتر ہے کہ تم اس صیغہ کو چھوڑ دو نواب علی یاور جنگ کو قدرتاً اس پیام سے تکلیف ہوئی میں نے ان کو اطمینان دلایا۔

اس پیام میں فیڈریشن کی طرف جو اشارہ ہے اس کی مختصر کہانی یہ ہے کہ گول میز کانفرنس کے بعد ۱۹۳۵ء کا ایکٹ برٹش پارلیمنٹ نے پاس کیا اس میں یہ تجویز تھی کہ ریاستیں اپنی خوشی سے فیڈریشن میں شریک ہو کر مرکزی حکومت ہند کی تشکیل میں حصہ لیں۔ سر اکبر حیدری مرحوم فیڈریشن کی موافقت میں تھے اور نظام اس کے خلاف تھے۔ نواب علی یاور جنگ سکریٹری کی حیثیت سے صدر اعظم سر اکبر حیدری کے موافق نوٹ تیار کرتے ہونگے اس لئے سرکار کو یہ خیال ہوا۔

مجھے یاد ہے ۱۹۳۵ء کی فیڈریشن کی تجاویز کو نہ کانگریس نے پسند کیا تھا اور نہ مسلم لیگ نے۔ والیان ملک پہلی گول میز کانفرنس میں اس سے اتفاق کرنے کے بعد آہستہ آہستہ ہٹتے رہے تھے لیکن آج میں یہ خیال کرتا ہوں کہ وہ آخری موقعہ تھا جب والیان ملک کسی نہ کسی حیثیت سے بچ سکتے تھے ان کے اختیارات کم ہو جاتے ذمہ دار حکومتیں بنتیں مگر حرف غلط کی طرح یوں نہ مٹ جاتے۔ ظاہر ہے شخصی اختیارات رئیسوں کو نہ رہتے۔ مگر جب اُن

کی رعایا کے نمائندے شریک حکومت ہوتے تو اُن کی حکومت میں استحکام آجاتا۔ وہی لوگ جو رئیسوں کے خلاف شورش کرتے ہیں اُن کے طرفدار ہو جاتے۔

نواب علی یاور جنگ نے حیدرآباد کے حقوق اور مطالبوں کا نوٹ تیار کیا جو اعلیٰ حضرت نے بھی پسند کیا صرف اتنی ترمیم کی کہ نوٹ کا منشا یہ تھا کہ اگر ملک کے وہ حصے جو معاہدوں کی وجہ سے حیدرآباد سے زمانہ گذشتہ میں لئے گئے اگر واپس نہ ہو سکیں تو ان کا معاوضہ دیا جائے۔ حضور نظام نے معاوضہ کو ناپسند کیا اور ملک کے اُن حصص کی واپسی پر زور دیا۔

۲۳ مارچ ۱۹۴۲ء کو میں معہ دوسرے ممبران کے دہلی روانہ ہوا۔ مطلب یہ تھا کہ حیدرآباد کا ڈیلیگیشن سر اسٹیفرڈ کرپس سے تنہا ملے گا اور اپنے معاہدوں کی روشنی میں گفتگو کرے گا۔ یہ حقیقت ہے کہ حیدرآباد کے ساتھ برٹش گورنمنٹ کے معاہدے خاصکر وہ جو شروع میں ہوئے تھے بالکل مساویانہ حیثیت کے تھے اس لئے قانوناً ہماری پوزیشن مضبوط تھی اور ہمارا استدلال مسکت تھا مگر اس کا احساس نہ تھا کہ زندگی اور زمانہ شب و روز کی کتنی کروٹیں بدل چکا تھا اور دنیا کا نظریہ کتنا بدل گیا تھا۔ پہلے شخصی حکومت کی کارفرمائی تھی اب جمہوریت کا دور ہے۔ پہلے راعی کے حکم میں رعایا کو مداخلت کا حق نہ تھا۔ اب رعایا کا تخیل بدل کر شہری ہو گیا تھا۔ جس کے مستقبل کا فیصلہ بغیر اس کی رضامندی کے ناممکن تھا۔

ہم لوگ دہلی پہونچے۔ ۲۶ مارچ کو منسٹروں کی کمیٹی تھی۔ گو حیدرآباد پرنسس چیمبر ممبر نہ تھا مگر میں شریک ہوا۔

مسٹر پانیکار نے برٹش تجاویز کو بیان کیا۔ جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ریاستیں بالکل آزاد ہیں۔ وہ جس طرح چاہیں اپنا مستقبل بنائیں۔ والیان ملک کو یہ تجویز پسند تھی۔ اور یہ ظاہر انگریز کا یہ کہنا خلاف انصاف بھی نہ تھا کہ جس

طرح برٹش اقتدار سے پہلے ریاستیں آزاد تھیں۔ ہم اسی طرح آزاد چھوڑتے ہیں لیکن گذشتہ صدی میں جو ذہنی اور دماغی انقلاب عوام الناس میں ہو گیا تھا اس کے بعد ریاستوں کا آزاد رہنا ناممکن تھا دوسرے روز میں سر کنتھ فٹز سے ملا اُن کی گفتگو سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ والیان ملک کا اس آزادی کو پسند کرنا مستقبل کا کیسا غلط تصور تھا۔

۲۶ مارچ کے روزنامچہ کی عبارت یہ ہے۔

میں سر کنتھ فٹز سے ملا۔ اُن کے طرز بیان سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ سر اسٹافرڈ کے آنے سے پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ کو کوئی تعلق نہ تھا۔ میں نے اُن سے کہا کہ حیدرآباد کے ڈیلیگیشن کو تنہا ملاقات کا موقعہ ملنا چاہیئے۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ سرہنری کریگ سے کہیں گے۔ میں نے اُن سے کہا کہ معاہدہ جات جو حیدرآباد اور برٹش حکومت کے درمیان ہوئے ہیں وہ بدستور قایم رہنے چاہئیں۔ آپ یک طرفہ انہیں کیسے ختم کرتے ہیں انہوں نے جواباً کہا کہ "اس کا منشا یہ ہے کہ ہم اپنی فوجوں سے آپ کی رعایا کے مقابلہ میں آپ کی حفاظت کیا کریں" پھر کہنے لگے کہ "میں سب کو نہیں کہتا مگر کیا بہت سی ریاستیں ایسی نہیں ہیں کہ جو اس قابل نہیں کہ قایم رہیں"۔

مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ان کا جواب کس قدر معنی خیز تھا اور حالات زمانہ سے خود برٹش ذہن کس قدر متاثر ہو گیا تھا۔ اس کے بعد میں نے کہا کہ جو ملک کے حصے آپ نے ہم سے معاہدوں کے ذریعے لئے ہیں وہ واپس کرنے چاہئیں وہ کہنے لگے "کہ قانوناً تمہارا مطالبہ درست ہے مگر کیا عملاً اس کا امکان ہے۔ وہاں کی رعایا کا کیا نقطۂ نظر ہوگا وہ حیدرآباد میں شامل ہونا کب پسند کریں گے۔ اُن کی گفتگو اس بات کا قطعی ثبوت تھی کہ جنگ کے اثرات مابعد اور انقلاب زمانہ کے

تقاضوں سے برٹش حکومت پوری طرح متاثر ہوگئی تھی۔

میں خود ان حالات سے بے خبر نہ تھا۔ جنگ کے ایک طرف تو برٹش حکومت کمزور ہوگئی تھی دوسری جانب اقوام عالم میں آزادی اور حکومت خود اختیاری کی لہر دوڑ رہی تھی۔ امریکہ برابر انگلستان پر دوستانہ دباؤ ڈال رہا تھا کہ ہندوستان کو آزاد کیا جائے ان تمام عوامل سے برطانوی پالیسی متاثر ہو رہی تھی۔ اس کا مجھے ذاتی علم تھا کہ امریکہ ہندوستان کی آزادی کا طرفدار تھا۔ اس زمانہ میں دہلی میں مسٹر ولیم فلپ مقیم تھے۔ یہ امریکہ کے پریسیڈنٹ مسٹر روزویلٹ کے ذاتی نمائندہ کی حیثیت سے یہاں تھے۔ اُن سے ملاقات ہوئی۔ اُنہوں نے حیدرآباد آنے کا قصد ظاہر کیا۔ میں نے خوشی سے منظور کیا وہ حیدرآکر میرے ہی پاس ٹھہرے حالانکہ برٹش ریزیڈنٹ نے کوشش کی کہ وہ ریزیڈنسی میں قیام کریں۔

ہندوستان کے سیاسی حالات پر گفتگو کے دوران میں انھوں نے مجھ سے کہا کہ امریکہ کے پریسیڈنٹ نے مسٹر چرچل کو اس طرف متوجہ کیا تھا کہ مناسب ہوگا کہ ہندوستان کو آزاد حکومت دیجائے۔

اُسی زمانہ میں ایک روز نواب بہادر یار جنگ اور ابوالحسن سید علی مرحومین مجھ سے دہلی میں ملے اور کہا کہ سرکار کے حکم سے وہ آئے ہیں تاکہ ہم لوگوں کو مدد دیں اور مسلمان لیڈروں سے مل کر اُنہیں حیدرآباد سے موافقت کے لئے تیار کریں۔ میں مسکرا کر خاموش ہوگیا۔ میں جانتا تھا کہ مدد تو کیا کرتے البتہ پرچہ نویسی کا کام کر سکتے تھے۔ پرانے زمانہ میں شاہانِ وقت اپنے ذرائع سے خبریں حاصل کیا کرتے تھے مگر اس صدی میں ایسے حضرات کا مشورہ کہ جو اُس مشورہ کے نتائج کے ذمہ دار نہوں یقیناً خطرناک تھا۔

سر اسٹیفرڈ کرپس کے آنے اور ان کی پالیسی کو حکومت ہند دل

سے پسند نہ کرتی تھی اس کا اظہار بعض ایگزیکٹو کونسلر اور پولیٹیکل صیغہ کے افسران سے صاف ظاہر ہوتا تھا۔

۲۸ مارچ ۱۹۴۲ء کو ہماری پہلی ملاقات سر اسٹیفرڈ سے ہوئی۔ اپنے تاثرات کے اظہار کے لئے اپنے روزنامچے سے کچھ اقتباسات نقل کرتا ہوں تاکہ اس زمانہ کی ذہنی کیفیات کی پوری تصویر سامنے آجائے۔

۲۸ مارچ ۱۹۴۲ء سر اسٹیفرڈ ہم لوگوں کو سیڑھیوں تک لینے آئے نہایت اخلاق سے ہم لوگوں کو بٹھایا۔ یہ نہایت ذہین طبع اور حاضر جواب آدمی ہیں۔ دبلے پتلے ہیں۔ کپڑے اچھے پہننے کا شوق ہے۔ سیاسی (ڈپلومیٹک) کام کے لئے مخصوص صلاحیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنی تجویز ہم لوگوں کو دی۔ اس تجویز کے متعلق میری رائے ہے کہ یہ چند بنیادی اصول ہیں جو جان کر اس طرح تیار کئے گئے ہیں کہ ہر فریق ان میں سے اپنے مزاج کے موافق مطلب نکالے۔ لیکن جب ان تجاویز کو ایک اسکیم کی شکل دی جائیگی اور مکمل تصویر تیار ہوگی۔ اس وقت غالباً ہر طبقہ کو بالخصوص مسلمانوں اور والیان ملک کو بڑی ناامیدی ہوگی۔ ہمارے وفد میں۔ جام صاحب بیکانیر۔ بھوپال۔ پٹیالہ۔ سروہی۔ اور سر سی پی راماسوامی۔ گوپالاسوامی وزیر کشمیر اور میں شامل تھے۔

میں نے فقط دو سوالات کئے۔

(۱) جب صوبوں کو یہ حق ہے کہ جس یونین میں چاہیں شریک ہوں تو کیا ایسا حق ریاستوں کو بھی ہوگا" سر اسٹیفرڈ نے کہا "ہاں"
میں نے کہا کہ اگر کچھ ریاستیں خود ملکر یونین بنائیں تو کیا انہیں اسکا حق ہوگا"
سر اسٹیفرڈ نے کہا "نہیں"

اس پر جام صاحب نے کہا کہ کیا ہمیں اتنا بھی حق نہ دیا جائے گا کہ جتنا صوبجاتی حکومتوں کو دیا جا رہا ہے" سر اسٹیفرڈ نے کہا کہ کوئی

وجہ نہیں اگر بہت سی ریاستیں ملکر ایک یونین بنائیں تو کیوں نہ اُسے مان لیا جائے۔ لیکن جب والیان ملک نے بذریعہ تحریر اُنہیں پابند کرنا چاہا تو سر اسٹیفرڈ نے کہا کہ ریاستوں کو کوئی حق دوسری یونین کا سا حاصل نہ ہوگا۔

میرا دوسرا سوال یہ تھا کہ جو ریاستیں ہر یونین سے الگ رہیں گی کیا اُن کے ساتھ تاج کا وہی تعلق رہے گا جو اب تک ہے " سر اسٹیفرڈ نے کہا کہ " ہاں "۔

میں۔ اُن کے حقوق کی حفاظت کون اور کس طرح کریگا۔

وہ ۔ ہم ایک وائسرائے مقرر کریں گے۔ اُس کے پاس فوج بھی ہوگی

میں۔ کیا آپ کے خیال میں اس کا امکان ہے کہ آپ کا وائسرائے اور آپ کا گورنر جنرل ایک دوسرے کے خلاف فوج کشی کریں جبکہ کسی ریاست اور برطانوی صوبہ میں جھگڑا ہو"۔

وہ ۔ ہاں انتہائی حالت میں اس کا بھی امکان ہے"۔

میں نے اس ملاقات کا ذکر تفصیل سے بیان کیا ہے تاکہ یہ معلوم ہوجائے کہ سر اسٹیفرڈ ہر ایک سے اُس کے مزاج کے موافق بات چیت کرتے تھے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اُن کا بیان درست نہ تھا اور نہ ہو سکتا تھا۔ یہ بالکل مہمل بات تھی کہ برٹش وائسرائے۔ برٹش گورنر جنرل کے خلاف فوج کشی کرے

اُسی روز پھر تین بجے شام حیدرآباد کے وفد سے ملاقات ہوئی جس میں میرے ساتھ نواب مہدی یار جنگ مرحوم اور سید عبدالعزیز بھی تھے۔ نواب علی یاور جنگ بحیثیت سکریٹری وفد شامل تھے۔

سر اسٹیفرڈ کے جوابات کا لب لباب یہ تھا کہ جو ریاستیں کہ کسی یونین میں شریک ہونگی اُن سے تاج برطانیہ کو کوئی تعلق نہ ہوگا۔ مگر جو تاج برطانیہ کی زیر حفاظت رہنا چاہیں گی ان کو اس کی اجازت ہوگی اور ایک

وبہراسے اُن کی حفاظت کریگا۔
میں نے کہا کہ اگر کوئی ریاست کسی یونین میں شریک بھی نہو اور برٹش گورنمنٹ کی (PARAMOUNTCY) کو بھی پسند نہ کرے تو اس کا کیا حشر ہوگا۔ ان کا جواب یہ تھا "WE WILL NOT ASK A STATE TO DO A THING WHICH IT DOES NOT LIKE OR NOT TO DO THAT WHICH IT LIKES."

۳۱ مارچ ۴۲ء کو پرنسس چیمبر کی میٹنگ تھی جس میں سر وی۔ ٹی۔ کرشنما چاری نے سر سی۔ پی۔ راماسوامی آئر کی تائید سے یہ ریزولیوشن پیش کیا کہ والیان ملک ایک یونین بنانے کی تجویز کو پسند کرتے ہیں۔ مگر اس کی کچھ زیادہ تائید نہیں ہوئی اور چانسلر کا پیش کردہ ریزولیوشن پاس ہوا جس کا منشاء یہ تھا کہ وہ ہندوستان کی خدمت کے لئے تیار ہیں بشرط اُن کے اختیارات اقتدار کو بحیثیت حکمراں کوئی نقصان نہ پہونچے۔ اور انہیں بھی ریاستوں کی جانب سے یونین بنانیکا اختیار ہو

۲ اپریل کو سر اسٹیفرڈ سے پھر ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات میں انہوں نے اسے صاف کر دیا کہ برٹش گورنمنٹ ہندوستان کی حکومت سے دست بردار ہونے کو تیار رہے۔ انہوں نے کہا کہ نئی یونین دوسرے ممالک سے براہ راست تعلق رکھ سکے گی۔ جو ریاستیں کسی یونین میں شامل ہوں گی اُن پر (PARAMOUNTCY) نہیں رہے گی یعنی برٹش حکومت سے انہیں کوئی تعلق نہ ہوگا۔ جو ریاست کسی یونین میں شریک نہ ہوگی اُسے خود مختار کر دیا جائے گا اگر خود چاہیں گی تو (PARAMOUNTCY) قائم رہے گی ورنہ خود مختار ہو جائیں گی میرے سوال کے جواب میں انہوں نے ان الفاظ میں ہندوستان کے سیاسی مستقبل کو بیان کیا۔
"WE WANT TO GET OUT OF INDIA, UNLESS INDIAN

WANTS TO KEEP US IN INDIA."

انہوں نے والیان ملک سے یہ بھی کہا کہ سیاسی لیڈروں سے گفت وشنید کریں اس صورت نے والیان ریاست میں حیرت اور انتشار پیدا کر دیا۔ سر اسٹیفرڈ سے ملاقات کے بعد جب میں حیدر آباد ہاؤس آیا تو وہاں میں نے والیان ملک کو بہت پریشان پایا۔ یہ انقلاب ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ ممکن ہے کہ بعض اس سے مستثنیٰ بھی ہوں مگر والیان ملک کو اپنی رعایا سے کوئی براہ راست تعلق نہیں رہا تھا۔ وہ اپنی رعایا پر بھروسہ نہیں کر سکتے تھے۔ جمہوریت کے سیلاب سے بچنا ناممکن تھا عوام میں ایک ایسی حکومت کی خواہش پیدا ہو گئی تھی جس میں اُن کا بھی حصّہ ہو۔ ایسے میں شخصی حکومت کا قیام ممکن نہ تھا۔ یہ ان کی پریشانی کے واسطے کافی تھا۔ مجھے مقبول محمود مرحوم نے ٹیلیفون کیا اور بتایا کہ والیان ملک نے ویسرائے سے جب یہ بیان کیا کہ سر اسٹیفرڈ نے یہ کہا کہ

"WE WANT TO GET OUT OF INDIA."

تو ویسرائے نے کہا کہ ہمیں لکھ کر دیجئے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ وائسرائے اور سر اسٹیفرڈ کرپس ہم خیال نہ تھے۔

۱۶ اپریل ۱۹۴۲ء کو دہلی کی واپسی پر حضور نظام سے ملا۔ وہ سر اسٹیفرڈ کرپس کی گفتگو کے نوٹ سے بہت مایوس ہوئے۔ خاصکر اس وجہ سے کہ اس میں لکھا تھا کہ جو ریاستیں کسی یونین میں شریک نہ ہونگی اُن پر گورنمنٹ آف انڈیا کا تسلط یعنی (PARAMOUNTCY) قائم رہے گی۔

دوسرے روز SIR CLAND GIDNEY. ریزیڈنٹ سے ملا۔ دہلی کی گفتگو کے نوٹس انہیں دکھائے۔ وہ اس سے بہت ناخوش

تھے اور کہنے لگے کہ نوٹ ایک بڑا ہی PATHETIC DOCUMENT ہے گو زبان سے صاف نہیں کہا لیکن اس پر خوش تھے کہ مشن ناکامیاب رہا۔

شام کو نواب بہادر یار جنگ آئے اُن سے ایک عجیب بات معلوم ہوئی۔ اُن کا بیان ہے کہ "دس تاریخ کو جناح مسلم لیگ کا ریزولیوشن لیکر سر اسٹیفرڈ کرپس کے پاس گئے اور کہا کہ ہم لوگوں نے آپ کی تجویز کو مسترد کر دیا ہے لیکن سر اسٹیفرڈ نے کہا کہ آپ اسے واپس لے جائیے اور کل جب کانگریس مسترد کر دیگی تو آپ سے خود آکر لیجاؤنگا۔"
جناح نے یہ بھی کہا کہ وہ کانگریس سے بہت ناخوش تھے جب کانگریس کا ریزولیوشن مل گیا تو جناح کے مکان سے خود آکر مسلم لیگ کا ریزولیوشن لے گئے۔

میں حضور نظام کی خدمت میں دہلی کی رپورٹ پیش کر کے ریاست کے کاموں میں مصروف ہو گیا۔

حیدرآباد میں کئی انگریز ملازم تھے۔ وہ بعض اوقات اپنے انگریز ہونے کا بیجا فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ حکومت ہند کو اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ بارود سازی کا ایک کارخانہ کلکتہ سے ہٹا کر حیدرآباد میں لایا جائے جب یہ مسئلہ کونسل میں پیش ہوا تو کونسل نے اختلاف کیا جس کی وجہ یہ تھی کہ جہاں ایسے کارخانے ہیں وہاں ہوائی جہاز بم باری بھی کرتے ہیں۔ کرنل سلاٹر نے جو اس تجویز کے حامی تھے ایک خط لکھ کر بھیجا کہ اس پر نظر ثانی کیجائے ورنہ حکومت ہند کا اعتبار ہم پر کم ہو جائے گا۔ کرنل سلاٹر ہمارے ملازم تھے اور مجھے اس فقرہ پر سخت ناگواری ہوئی میں نے کہا کہ (LET IT BE SHAKEN) لیکن کسی شخص کو ہمیں یہ بتانے کا حق نہیں ہے کہ حکومت ہند کی نظر میں کیا چیز ہمارے اعتبار کو قائم رکھے گی

اور کیا نہیں رکھے گی۔ کونسل نے متفقہ طور پر انکار کر دیا۔ اس میں شک نہیں کہ انگریز ملازم نہایت مستعد اور فرض شناس ہوتا تھا۔ لیکن کبھی کبھی حکمراں قوم کے ایک فرد ہونے کی جھلک اس کے اقوال و اطوار میں واضح ہوتی تھی۔

پچاس برس پرانا عطر

ایک واقعہ یاد آرہا ہے جس سے حیدرآباد کے امراء کے کردار پر روشنی پڑتی ہے امراء کو برا کہنا تو ایک فیشن ہو گیا ہے مگر ان پرانے خاندان کے امراء میں کچھ خوبیاں بھی تھیں۔ عجیب او جملہ نگفتنی ہنر شش نیز بگو۔

میرے پاس ایک خط عبدالرشید خاں مرحوم کا جو اندور کی ریاست میں ہوم منسٹر تھے۔ آیا جس میں یہ خواہش تھی کہ مہاراجہ اندور سابق کی یہ خواہش ہے کہ "اگر" کا عطر پچاس برس سے زیادہ پرانا اگر ملجائے تو ان کے واسطے بھیجا جائے مجھے اس خواہش پر حیرت ہوئی۔ روزنامچہ کی تحریر کی نقل یہ ہے جو پیشن گوئی بن گئی "یہ لوگ پچاس برس پرانا "اگر" کا عطر تلاش کرتے ہیں حالانکہ زمانہ بتا رہا ہے کہ عطر تو عطر تھوڑے روز میں پچاس برس پرانے مہاراج بھی نہ ملیں گے۔

میں نے اپنے A.D.C سید صادق حسین سے کہا معلوم کرنا اگر کسی عطار کے یہاں یہ عطر ہو۔ A.D.C کو نواب کمال یار جنگ مرحوم کے خاندان سے دیرینہ تعلق تھا۔ شام کو یہ سبیل تذکرہ یہ بھی ذکر آیا۔ جب وہ نواب صاحب مرحوم کے گھر حاضر ہوئے۔ دوسرے روز صبح ہی کمال یار جنگ مرحوم موٹر میں تشریف لائے اور مجھ سے پوچھا کہ کیا ایسا خط آیا ہے۔ میں نے کہا "جی ہاں" کسقدر بے معنی فرمائش ہے۔ ایسا پرانا عطر کون تلاش کرے نواب صاحب مرحوم نے کہا "نہیں صاحب یہ تو اعطر" "اگر" پچاس برس سے بھی زیادہ پرانا میرے ہاں موجود ہے۔ اسے روانہ کر دیجئے۔ یہ تو ہم

لوگوں کے واسطے بڑی شرمناک بات ہوگی کہ ہمارے صدر اعظم سے ایک والئ ملک کوئی فرمائش کرے اور وہ پوری نہ ہوسکے۔

صدر اعظم اور حیدرآباد کی عزت کا یہ احساس قابل قدر تھا۔

حیدرآباد میں گورنمنٹ ریلوے ریاست کی تھی مگر پولیس کا انتظام لالہ گوڑہ اور ریلوے کے رقبہ میں برٹش کا تھا۔ میں اس لئے کوشاں تھا کہ یہ رقبہ ریاست کے زیر انتظام آجائے۔

مئی ۱۹۴۲ء میں برٹش گورنمنٹ نے اسے منظور کرلیا اور پوری ریلوے لائن میں ریاست کی پولیس کا انتظام ہوگیا۔ مئی ۱۹۴۲ء میں غلام محمد صاحب مرحوم نے فنانس اور انڈسٹری کے وزیر کی حیثیت سے چارج لے لیا۔ میں انہیں خاص طور پر حکومت ہند سے مانگ کر لایا تھا۔

۲۱ مئی کو چینی مسلمانوں کے ایک نمائندے مجھ سے ملے اُن کا نام مسٹر اوتھمین وو تھا۔ میں نے اُنہیں سرکاری مہمان بنایا۔ چائے اور ایک دن کھانے پر اپنے پاس بلایا۔ یہ ممالک اسلامی کا دورہ کررہے ہیں۔ اُن کے بیان سے معلوم ہوا کہ چین کے مسلمانوں کی اقتصادی اور عام حالت سقیم ہے۔ جب چین کے مسلمانوں کا حال سقیم تھا تو کمیونسٹ زمانہ میں اور زیادہ ہوگیا ہوگا۔ اخباروں سے تو یہی معلوم ہوتا ہے۔

جنگ کے اثرات اور مابعد کی تصویر انگریز کے سامنے آنے لگی ہے۔ میں ریزیڈنٹ سے ۲۵ یا ۲۶ مئی ۱۹۴۲ء کو ملا۔ اب وہ انتظامی معاملات میں مداخلت کرنا نہیں چاہتے اور کہتے تھے کہ مجھے اور دوسرے ممبران کونسل کو مضبوطی سے کام لینا چاہئے۔

خلیق اور نواب اسماعیل خاں مرحوم آئے ہوئے ہیں۔ میں نے کھانے پر بلایا۔ خلیق یہ چاہتے تھے کہ جو ہمارا نی مشین چھاپنے کی حیدرآباد میں ہے وہ انہیں دیدی جاوے تاکہ ایک مسلم اخبار نکل سکے مگر جناح کو خبر نہ ہو۔

اس سے فریقین کے صفائی قلوب کا پتہ چلتا ہے۔

چونکہ حیدرآباد میں کوئی جمہوری نظام نہ تھا۔ میری یہ خواہش تھی کہ اگر انتخاب نہ ہو تو نامزد شدہ حضرات کی ایک مشاورتی کمیٹی بنجائے (ایڈوائزری کمیٹی) گورنمنٹ حیدرآباد اس کی موافقت میں تھی۔ ۲۷ مئی کو سید عبدالعزیز صاحب جو ایک وزیر تھے۔ اور بہادر یار جنگ اور ابوالحسن سید علی مرحومین میرے پاس آئے اور اس پر زور دے رہے تھے کہ مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کی تعداد مساوی ہو۔ مجھے حیرت ہوئی کہ جب یہ مسئلہ وزراء کی کونسل کے سامنے زیر بحث تھا تو بحیثیت ایک ممبر کے سید عبدالعزیز نے یہ کہا تھا کہ اس کے متعلق بہادر یار جنگ سے دریافت کرنے کی ضرورت نہیں چونکہ یہ منتخبہ جماعت نہیں ہوگی بلکہ حکومت کی نامزد شدہ کمیٹی ہوگی۔ اس لئے فرقہ وارانہ توازن کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن آج وہ اس پر زور دے رہے تھے کہ توازن ہونا چاہئے اور جو قواعد (رولز) بنائے جائیں اس میں اس کی صراحت موجود ہو۔

حیدرآباد کے ہندو اس پر راضی تھے کہ اُن کی اور مسلمانوں کی تعداد برابر ہو لیکن اس پر بجا طور پر اُن کو اعتراض تھا کہ کسی کمیٹی یا جماعت میں نصف مسلمان ہوں اور نصف غیر مسلم جس میں ہندو۔ عیسائی۔ اینگلو انڈین سب شامل ہوں۔ میرے روزنامچہ میں یہ عبارت ہے "مجھے یقین ہے کہ یہاں کے مسلمان ان اصلاحات کو نافذ نہ ہونے دیں گے اور بعد از جنگ اس سے دوگنی اور سہ گنی مراعات و حقوق دلوائیں گے۔ لیکن جو کچھ ہوا وہ میرے بھی خواب و خیال میں نہ تھا۔ آں قدح بشکست و آں ساقی نماند۔ غیر منصفانہ ضد اکثر خود ضد کرنے والے کے واسطے نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔

حضور نظام برٹش حکومت سے بہت ہی بدگمان تھے اور ماضی کے تجربوں کے بعد وہ بدگمانی غلط بھی نہ تھی۔ ۳ مئی کو ملاقات میں مجھ سے

فرمایا کہ دوران جنگ میں ہوائی اڈوں کے واسطے جگہ حکومت ہند مانگتی ہے۔ اس چیز کو ابھی صاف کر لینا چاہیئے کہ واپسی کے وقت ہزاروں شرائط کھل آتی ہیں۔ دیکھو سکندر آباد کی واپسی ابھی تک نہیں ہوئی۔ میں نے اطمینان دیا کہ جو عرضداشت پیش کی گئی ہے اس میں ان سب چیزوں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ پھر انگریز افسروں کا ذکر آیا جو ۱۸۲۶ء کے بعد سے حیدرآباد پر مسلط تھے۔ فرمانے لگے کہ ریزیڈنٹ سے اس کے متعلق کہنا چاہیئے۔ میں نے عرض کیا کہ میں نے ذکر کیا تھا مگر مجھے معلوم ہوا کہ حضور اسے طے فرما چکے ہیں کہ تا اختتام جنگ یہ لوگ رہیں اس کے بعد اس پر نظر ثانی ہو۔

میں نے غلام محمد مرحوم کا ذکر کیا کہ انہوں نے چارج لے لیا اور کام کر رہے ہیں فرمایا میں تو انہیں جانتا بھی نہیں۔ آپ کی سفارش پر رکھ لیا ہے۔ کل اُن سے ملوں گا۔

۳۱ مئی کو غلام محمد صاحب نظام سے ملے۔ اُن کے ساتھ سید عبدالعزیز بھی تھے غلام محمد صاحب نے مجھ سے یہ کہا کہ سرکار نے کہا کہ نواب صاحب چھتاری آپ کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ غلام محمد صاحب نے مجھے یہ بھی مشورہ دیا کہ انگریزوں کے اختیارات کچھ کیوں نہ کم کر دیئے جائیں میں نے کہا جلدی کیا ہے آپ خود نتیجہ نکال لیں گے۔ دوسرے روز یعنی یکم جون کو میں سید عبدالعزیز کی عیادت کو گیا وہ بیمار رہنے لگے تھے مگر کام کرتے تھے۔ سید صاحب کا بیان تھا کہ غلام محمد صاحب نے نظام سے کہا کہ انہیں تنہائی میں جلد جلد ملنے کا موقع دیا جائے۔ جس پر اعلیٰ حضرت نے فرمایا کہ جو کچھ مشورہ ہو آپ نواب صاحب چھتاری سے کیا کریں۔ لیکن جب میں نے مرحوم سے دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ انہوں نے یہ کہا تھا کہ سب ممبران کونسل کو تنہا نظام سے ملنے کا موقع ہوا کرے۔

لیکن حیدرآباد کا طریقہ یہ تھا کہ ہر روز یہ صدر اعظم سے بغیر مشورہ نظام سے راست مشورہ نہ کرے ایک طرح یہ طریقہ کار حیدرآباد کے واسطے مناسب تھا ورنہ درباری سازشوں کا اور بھی دروازہ کھل جاتا۔

۱۶ جون کو ریذیڈنٹ کے سکریٹری مسٹر کوک ولیس میرے پاس آئے اور بادشاہ کے بھائی ڈیوک آف گلوسٹر DUKE OF GLOWESTER کا پروگرام جو ۲۰ تاریخ کو آرہے تھے مجھے دیا جس کا منشا یہ تھا کہ جب ڈیوک آئیں تو ہوائی جہاز کے اڈے پر حضور نظام شہزادگان اور میں موجود ہوں۔ وہاں سے وہ فلک نما نظام کے ساتھ جائیں۔ وہیں لنچ ہوا اور شب کو نظام کی طرف سے ڈنر ہوا اور اسی طرح رخصت ہوتے وقت نظام ہوائی اڈے تک پہونچانے جائیں۔ میں نے علی یاور جنگ اور انصاری معتمد باب حکومت یعنی کیبنٹ سکریٹری کو بلا کر بذریعہ نیم سرکاری دفتر پیشی کو مطلع کر دیا۔

آج ہی سرکار کو ان کے شاعری کے استاد جلیل نے ملک الشعراء کا خطاب دیا اور باغ عامہ میں جلسہ اور رایٹ ہوم ہوا۔ ایڈریس کے جواب میں سرکار نے اس خطاب کو قبول کیا۔ مجھ سے فرمایا کہ صبح تم علی یاور جنگ کو بھی ساتھ لانا۔ علی یاور جنگ نے مجھ سے یہ کہا کہ اگر سرکار ڈیوک کو رخصت کرتے وقت ہوائی جہاز تک پہونچانے سے انکار کریں تو میں اس پر زور نہ دوں ورنہ انہیں غلط فہمی ہو جائے گی۔ میں صرف یہ کہوں کہ چونکہ مسئلہ اہم ہے اس لئے کونسل کے مشورے کے بعد طے کیا جائے نواب علی یاور جنگ کو غالباً ڈیوک آف ونڈسر کا واقعہ یاد آیا۔ جب وہ پرنس آف ویلز کی حیثیت سے حیدرآباد آئے تو نظام نے رخصت کے وقت اسٹیشن جانے سے انکار کیا۔ جس سے حکومت ہند اور انگلستان کے

شاہی خاندان کو ناگواری ہوئی۔

آج ہی غلام محمد صاحب نے مجھ سے کہا کہ اُن سے اور سر تھیوڈر ٹاسکر سے گفتگو ہوئی اور سر تھیوڈر ٹاسکر نے منجملہ اور باتوں کے یہ بھی کہا کہ "تم خود ہی یہ اندازہ کرو کہ اگر اعلیٰ حضرت کو اختیارات کامل دیدئے جائیں تو جو اُن کی موجودہ کیفیت مزاج ہے اس میں وہ اس ریاست کا کیا حشر کریں" جو کچھ ٹاسکر نے کہا یہ نہ صرف حکومت ہند کا خیال تھا بلکہ اس سے بہت سے حیدرآباد کے لوگ بھی متفق تھے۔

دوسرے روز میں اور علی یاور جنگ کنگ کوٹھی حاضر ہوئے۔ سرکار نے فوراً علی یاور جنگ کو نوٹ لکھانا شروع کر دیا۔ جس کا منشا یہ تھا کہ چونکہ بمباری کے خطرے سے فلک نما محل کا سامان ہٹا لیا گیا۔ لہذا ڈیوک ریزیڈنسی میں قیام فرمائیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مجھے سرکار کے اس فیصلہ پر کس قدر حیرت اور افسوس ہوا۔ شہنشاہ ہندوستان کا بھائی اور نظام حیدرآباد کا مہمان مگر اس کا قیام بجائے فلک نما محل کے ریزیڈنسی میں ہو۔ لیکن اگر میں اصرار کرتا تو ضد بڑھتی میں خاموش رہا۔ خیر مقدم اور الوداع کے موقع پر جانے کے لئے راضی تھے مگر الوداع کے متعلق یہ کہا کہ اگر "ضروری ہو تو میں اس پر بھی تیار ہوں"۔

میں اس نوٹ کے ساتھ گیارہ بجے ریزیڈنٹ سے ملا اور جہاں تک مجھ سے ہو سکا ایک ناخوشگوار بات کو خوشگوار طریقہ سے کہا۔ انہیں یقین دلایا کہ ڈیوک کا قیام ریزیڈنسی ہی میں مناسب ہوگا۔ خیر مقدم اور الوداع کے سلسلہ میں ریزیڈنٹ نے کہا کہ دونوں مواقع پر سرکار کا تشریف لیجانا مناسب ہوگا۔

میں نے دوسرے روز رجون کو سرکار سے وہ سب عرض کر دیا جو طے کر آیا تھا جسے سرکار نے پسند فرمایا۔ مگر میرے لئے ایک اور نزاکت پیدا

ہوگئی۔ اسی روز شام کو مسٹر ووڈرٹاسک کے رخصتی ڈنر میں ریزیڈنسی گیا۔ میری
حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب ریزیڈنٹ نے کہا کہ سرکار نے انہیں خط
بھیجا ہے جس کا مقصد یہ تھا کہ اگر ڈیوک فلک نما محل میں قیام کریں تو مناسب
ہوگا۔ مجھ سے دریافت کیا کہ تمہاری کیا رائے ہے۔

میں نے کہا کہ سرکار کی جب یہ خواہش ہے تو منظور کر لیجئے مناسب ہے
لیکن بار بار یہ خیال آتا رہا کہ کل ہی چند دلائل میں نے ریزیڈنٹ سے
اس تجویز کے خلاف پیش کئے تھے اسے وہ بھول نہیں سکتا۔ کیا اسے یہ خیال
نہ ہوگا کہ نظام تو چاہتے ہیں کہ ڈیوک فلک نما میں قیام کریں مگر صدر اعظم اپنی
کسی مصلحت سے یہ نہیں چاہتے۔ حیدرآباد میں ایسے مواقع آجاتے
تھے اور صدر اعظم کی حیثیت سے میرے لئے بڑے خلجان کا باعث ہوتے تھے
اگر اپنی پوزیشن کو صاف کیا جائے تو آئین وفاداری کے خلاف اور خاموشی
کی صورت میں غلط فہمی کا اندیشہ۔

جیسا کہ اس سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں اس ریاست کی بڑی بدقسمتی یہ
تھی کہ سرکار کے مزاج میں ناظم یار جنگ چیف سکریٹری کا اس قدر دخل
ہوگیا تھا کہ وہ انتظام ریاست اور حکومت کے واسطے مضر تھا۔ اس کی
ایک مثال یہ ہے کہ غلام محمد صاحب کی یہ خواہش تھی کہ "دلکشا" کوٹھی
جس میں سر اکبر مرحوم رہتے تھے انہیں رہنے کو دیجائے۔ میں نے نیم سرکاری دفتر
پیشی کو روانہ کرنے کا حکم دیا۔ وہاں سے جواب نفی میں آیا۔ میں نے دوسرے
روز ناظم یار جنگ سے کہا کہ یہ جواب غلام محمد فنانس منسٹر کی دلشکنی کا باعث
ہوگا۔ میں نے دوبارہ نیم سرکاری یادداشت کی۔ دوسرے روز اجازت آگئی۔
حکمراں کو مشورہ دینے کا حق اسی شخص کو ہونا چاہئے کہ جو اپنی تجویز کے

ردعمل اور اثرات کا بھی ذمہ دار ہو۔ ورنہ غیر ذمہ دار لوگوں کے مشورے حکومت اور حکمران دونوں کے واسطے نقصان دہ ہو سکتے ہیں۔

مجھے یہ خیال آیا کہ اس موقع پر اگر سرکار ڈیوک کو ایک خط کے ساتھ دس لاکھ روپیہ دیدیں تاکہ وہ واپسی پر بادشاہ کے سامنے نظام کی طرف سے مجروحین جنگ کی امداد کے واسطے پیش کریں تو بہتر ہوگا۔ میں نے غلام محمد صاحب اور سید عبد العزیز سے مشورہ کیا یہ سب متفق تھے میں نے یہ تجویز بذریعہ نیم سرکاری سرکار کی منظوری کے واسطے بھیجی لیکن اعلیٰحضرت کی طبیعت ناساز ہوگئی اور کئی روز تک باریابی کا موقعہ نہ ملا۔

مجھے بڑی حیرت تھی کہ حضور نظام کی علالت کو بہت ہی راز میں رکھا جاتا تھا۔ ممکن ہے یہ پرانی روایات مغلیہ سلطنت کے زمانہ کی ہوں۔ جب یہ اندیشہ ہوتا تھا کہ اگر بادشاہ کی بیماری کی شہرت ہوگی تو تاج وتخت کے حصول کی غرض سے سازشیں شروع ہو جائیں گی۔ چار پانچ روز بعد باریابی کا موقع ملا۔ غلام محمد صاحب اور سید عبد العزیز کو بھی بلایا مگر سرکار اس علالت کی وجہ سے کمزور ہو گئے تھے۔ میری تجویز کے پیش ہونے سے پہلے ہی سرکار نے اس کی مخالفت میں تقریر شروع کردی اور وجہ یہ بیان فرمائی کہ ڈیوک کی پوزیشن لوگوں کی نظر میں خراب ہو جائے گی کہ ریاستوں سے روپیہ لیتے پھرتے ہیں۔ اس کے بعد سید عبد العزیز کی طرف دیکھا۔ گو وہ پہلے میری تجویز سے متفق تھے۔ مگر نظام کی رائے معلوم ہونے کے بعد وہ بھی اختلاف کرنے لگے۔ غلام محمد صاحب نے موافقت کی مگر سرکار خود مخالف تھے تو میں بھی خاموش ہوگیا۔ لیکن جب ڈیوک جے پور گئے تو سر مرزا اسماعیل مرحوم نے ڈھائی لاکھ روپیہ ڈیوک کو دیا کہ مجروحین جنگ کی آسائش کے واسطے مہاراج جے پور کی طرف سے ڈیوک ہزمجسٹی کے سامنے پیش کریں۔ میں نے اس اخبار کا تراشہ سرکار کو بھیجدیا۔

اس ملاقات میں سرکار نے ریزیڈنٹ سے اپنی گفتگو کا ذکر فرمایا۔ سرکار
نے ریزیڈنٹ سے یہ کہہ دیا کہ ہوائی جہاز کے اسٹیشن پر ڈیوک کا استقبال کرنے
کے بعد وہ واپس چلے جائیں اور اعلیٰ حضرت کی بجائے ریزیڈنٹ ڈیوک
کے موٹر میں فلک نما جائیں۔ مجھ سے ارشاد ہوا کہ تم کوشش کرو کہ بجائے
ریزیڈنٹ کے۔ پرنس آف برار ڈیوک کے موٹر میں فلک نما جائیں گر اعلیٰ
حضرت نے کچھ نہ کہا ہوتا تو میں یہ کہہ سکتا تھا کہ چونکہ نظام کو گذشتہ علالت
کے بعد ضعف اور نقاہت ہے۔ لہذا ولیعہد اُن کے بجائے موٹر میں ڈیوک
کے ساتھ جائیں۔ لیکن جب اعلیٰ حضرت نے خود بغیر ریزیڈنٹ کی خواہش
کے یہ فرما دیا۔ اور ظاہر ہے کہ سرکار لاڈ گڈنی۔ ریزیڈنٹ کے واسطے یہ بڑی
عزت تھی۔ میرے لئے اس عزت سے انہیں محروم کرنے کی خواہش کرنا بہت
دشوار تھا۔

کنگ کوٹھی سے واپس آکر سیدھا ہوائی اڈے گیا تاکہ ریہرسل میں شریک
ہو جاؤں۔ ریزیڈنٹ موجود تھے۔ میں اور وہ ایک ہی کار میں فلک نما تک
گئے راستہ میں وہ سر علی امام مرحوم کے زمانہ کا ذکر سناتے رہے۔ یہ خود اس
زمانہ میں بطور انڈر سکریٹری حیدرآباد میں تھے۔ پرنس آف ویلز کے حیدرآباد
آنے کا اور اعلیٰ حضرت کا انہیں اسٹیشن پر رخصت کرنے کے لئے نہ جانے
کا ذکر سناتے رہے۔ اُن کا یہ بیان تھا کہ جب بوسٹن جو اس زمانہ میں ریزیڈنٹ
حیدرآباد تھا۔ لندن میں کنگ جارج سے ملا اور بتایا کہ وہ حیدرآباد کا ریزیڈنٹ
تھا تو کنگ نے کہا

"YES, HE IS THE SOME PRINCE
WHO WAS RUDE TO MY SON"

یہ واقعہ میں نے لیٹ ہز ہائینس آغا خاں سے بھی سنا تھا۔ میں نے
ہنس کر دریافت کیا کہ اب حکومت ہند اور ریاست کے تعلقات کیسے
ہیں کہنے لگے کہ بہت اچھے۔ میں نے کہا کہ چھوٹی چھوٹی چیزوں میں آپ خیال

کرکے اُن کا دل خوش کر سکتے ہیں مثلاً نظام نے آپ سے کہا ہے کہ آپ ڈیوک کے ساتھ موٹر میں جائیں مگر آپ خود یہ کہیں کہ وہ پیچھے جائیں تو مناسب ہو۔ اس نے مان لیا مگر کہا کہ دہلی کو اطلاع دے چکا ہوں تار دے کر دریافت کرونگا۔ چنانچہ تار دیا گیا مگر دہلی سے جواب نفی میں آیا۔

کتنی عجیب بات ہے کہ پانچ برس بعد انگریز کو ہندوستان چھوڑنا پڑا۔ مگر اُس وقت اس پر راضی نہ ہوئے کہ بجائے H.E.H. کے پرنس آف برار ڈیوک کے ساتھ موٹر میں بیٹھیں۔ ڈیوک آئے۔ H.E.H. نے ایک بڑا ڈنر دیا جس میں دو سو سے زیادہ مہمان تھے میرا لڑکا ابن بھی معہ دستار و کلاہ شریک تھا۔ دوسرے روز ڈیوک ہوائی جہاز سے چلے گئے H.E.H. ریذیڈنٹ دونوں پرنس بسالت جاہ اور میں ایروڈروم پر رخصت کرنے گئے۔ H.E.H. نے فرمایا۔

"THANK GOD IT IS ALL OVER"

ریذیڈنٹ کے چہرے پر کچھ عجیب سا اثر ہوا۔ میں نے H.E.H. کے سوار ہو جانے کے بعد ریذیڈنٹ نے کہا۔

"THANKS GOD, EVERY THING WENT OFF SMUTHLY DURING THE DUK'ES VISIT.

ڈاکٹر سر ضیا الدین مرحوم نے مجھے لکھا کہ پرنس آف برار کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا ریکٹر کر دیا جائے۔ ۲۵ جون کو ملاقات میں H.E.H. سے میں نے عرض کیا مگر سرکار نے اس کی منظوری نہیں دی اور ڈاکٹر ضیا الدین پر یہ برس پڑے کہ یہ انگریزوں کا خوشامدی ہے۔ مجھے اس نے لکھا ہے کہ لارڈ لنلتھگو LORD LINLITHGOW کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی جائے۔ آپ اُسے لکھ دیں کہ "مجھے ڈگری دینے پر اعتراض نہیں مگر میں اس زمانہ میں علی گڑھ نہ آؤنگا۔"

حضور نظام کو انگریزوں سے نفرت تھی۔ وہ یہ خیال فرماتے تھے کہ اُن کے اختیارات پر بے جا پابندیاں عائد کی گئی ہیں۔ ان کی آزادی کو ایک حکمراں کی حیثیت سے سلب کر رکھا ہے۔ معلوم نہیں آج H. E. H. اور دوسرے والیان ملک کی کیا رائے ہے۔

میں نے H. E. H. سے یہ بھی عرض کر دیا کہ آیندہ زمانہ سرمایہ داری کے خلاف ہے مگر سرکار نے اس فقرہ پر توجہ نہیں فرمائی۔ سرکار کا بھی اور دوسرے والیان ملک کا خیال یہ تھا کہ اس جنگ میں انگریز جیت نہیں سکتا گو امریکہ کی مدد سے لڑائی میں تو انگریزوں کو فتح ہوئی لیکن بقول شاعر۔
لڑنے والوں کو پس از صلح یہ ہوگا معلوم۔ کس قدر جیت لیا۔ جنگ میں ہار سے کیا کیا۔ انگریز جنگ تو جیتے مگر امپائر ہار گئے۔ اس جنگ نے اقوام عالم میں آزادی کی روح پھونک دی۔ جتنی یوروپین اقوام کلونیل پالیسی کی قائل تھیں اور ایشیا و افریقہ کے غریب اور غیر تعلیم یافتہ اقوام کو غلام بنائے ہوئے تھیں۔ انہیں سب کو ان ممالک سے دستکش ہونا پڑا اور قومی حکومتیں بن گئیں۔

۲۸ جون ۱۹۴۶ کو میں نے ریذیڈنٹ سے کہا کہ عنقریب دہلی جا کر میں حکومت ہند پر زور دونگا کہ مطالبات پورے کئے جائیں اور H. E. H. کی خواہش کے مطابق پرنس آف برار کو G. C. I. E. دیا جائے۔ انہیں اتفاق تھا۔ میں نے یہ بھی کہا کہ ہماری فوج کو بندوقیں چاہئیں۔ اُس نے کہا کہ معلوم کرنا دہلی میں بندوقیں ہیں یا نہیں۔

شام کو سید عبدالعزیز صاحب کی عیادت کو گیا۔ اُنھیں آرتھرائیٹس ہے۔ شب کو گر پڑے اور ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ بہت دل گرفتہ اور پریشان تھے۔ اپنی زندگی سے مایوس ہو رہے تھے میں اُن کی دل دہی کرتا رہا۔ باتوں باتوں میں انہوں نے مجھ سے کہا کہ مجھ سے اتفاق کرنے کے بعد جو انہوں نے ڈیوک کو مجروحین کے لئے کوئی رقم دینے سے نظام کے سامنے اختلاف کیا اُس کی وجہ

یہ تھی کہ H.E.H نے کاظم یار جنگ کے ذریعہ اُن سے کہلوایا تھا کہ وہ خلاف کریں۔ یہ حیدرآباد کے واسطے کوئی عجیب بات نہ تھی اسی لئے کوئی شخص حیدرآباد اور نظام کی خدمت کما حقہٗ نہیں کر پاتا تھا۔

یکم جولائی ۴۷ء کو سر کھوڈر ٹاسکر حیدرآباد سے رخصت ہوئے۔ مجھے بھی بمبئی جانا تھا۔ میں بھی اسی گاڑی سے جا رہا تھا۔ اسٹیشن پر بہت لوگ اُنہیں پہونچانے آئے تھے۔ ریزیڈنٹ بھی تھا۔ یہ بہت غمگین تھے پندرہ سال کے بعد ملازمت اور پھر حیدرآباد کی ملازمت چھوڑنا مغموم کرنے کی کافی وجہ تھی۔

۲ جولائی ۴۷ء دوسرے روز سرکار کے حکم کے مطابق میں جناح سے ملا۔ جو فارمولہ کہ ہم نے ریاستوں اور حیدرآباد کے مستقبل کے متعلق بنایا تھا تاکہ وائسرائے کو بھیجا جائے وہ اُنہیں دکھایا۔ ہماری تجویز کو مسٹر جناح نے ناپسند کیا لیکن جب وہ اپنی تجویز بنانے لگے تو ممکن ہے کچھ الفاظ کا فرق ہو۔ مگر وہ بالکل وہی تھی جو ہم لوگ حیدرآباد سے لے گئے تھے۔ اس سے یہ اندازہ ہوا کہ مسٹر جناح کے سامنے اگر آپ مرض کا درماں پیش کریں تو وہ اس پر اعتراض کریں گے۔ اور اگر آپ اپنی مشکلات انہیں بتائیں اور درماں اُن پر چھوڑ دیں تو گمان غالب یہ ہے کہ اُن کی تجویز اور آپ کی تجویز یکساں ہوگی۔

۳ جولائی کو ریاست کے وزراء کی میٹنگ تھی جس میں تمام ممبران موجودہ نے اس تجویز کو منظور کیا جو حیدرآباد سے آئی تھی۔ ان تجاویز کا منشاء یہ تھا کہ چونکہ مستقبل کی کوئی صاف تصویر سامنے نہیں ہے۔ لہذا ریاستوں کو آزاد رہنا چاہیئے۔ وہ چاہیں تو یونین میں شریک ہوں یا چاہیں تو اپنی یونین الگ بنائیں یا الگ رہ کر اپنے تعلقات براہ راست تاج برطانیہ سے رکھیں۔

میں ۷؍ جولائی کو ڈیفنس کونسل کی میٹنگ میں شریک ہوا۔ اور دوسرے روز SIR HENERY CRAIKE سے جو ویسرائے کے پولیٹیکل ممبر یا منسٹر ہیں ملا۔ وہ اس بات سے بہت خوش تھے کہ ڈیوک حیدر آباد سے بہت خوش آئے۔ پھر ریاستوں کے مستقبل پر گفتگو ہوتی رہی۔ ملا مگر انگریز عجیب کشمکش میں تھے۔ ایک طرف دلی خیالات کو پوری طرح چھپا نہ سکتے تھے۔ دوسری طرف ملازمت کے قیود صاف بات بھی نہیں کہنے دیتے تھے۔ چنانچہ وہ صاف صاف تو کسی رائے کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ مگر اتنا ضرور کہا کہ نئے حالات میں برٹش حکومت ریاستوں کی ویسی حفاظت نہیں کر سکے گی جیسی اس وقت تک کرتی تھی۔ یہی وہ بات تھی جو بحیثیت ایک بہی خواہ اور ذمہ دار ملازم کے مجھے پریشان رکھتی تھی۔ اکثر ناسمجھ اس اعلان سے خوش تھے کہ ریاستوں کو آزاد چھوڑا جائے گا لیکن حقیقت یہ ہے کہ برٹش حکومت ان کی حفاظت کرتی تھی ورنہ اس ڈیڑھ سو برس کے دوران میں کتنے ہی پرنس خود اپنی رعایا کے ہاتھوں ختم ہو گئے ہوتے۔

پھر میں نے پرنس کے G.C.I.E. پر زور دیا اور برار وغیرہ کا ذکر کیا۔ ہمارے دلائل کی طاقت اور صداقت تو سب کو تسلیم تھی۔ مگر اب ان حصص کا پھر ریاست میں جانا ناقابل عمل تھا اور H.E.H معاوضہ پر تیار نہ تھے۔ یہ ایک بڑی غلطی تھی۔ برار یا دوسرے ایسے اضلاع کے باشندے ہرگز اس پر راضی نہ ہوتے کہ انہیں حیدر آباد میں شامل کر دیا جائے۔

میں چھتاری کا چکر لگاتا ہوا ۱۴؍ جولائی کو پھر حیدر آباد آ گیا۔ سرکار کے حکم کے مطابق سیدھا اسٹیشن سے باغ عامہ پہونچا۔ وہاں سالگرہ کے سلسلے میں کافی وغیرہ پی۔ پھر میں گھر آیا۔ شب کو ڈنر تھا۔ تقریباً ایک ہزار آدمی شریک ہوئے۔ راحت سلطانہ، جمشید علی خاں اور عبدالحمید خاں مرحوم بھی شریک تھے۔ ڈنر کے بعد سب سے پہلے میں نے پانچ اشرفیاں بطور نذر پیش

سکیں۔ بعدہ اور حضرات نے نذریں دیں۔

سر ہنری کریک جو ویسرائے کے پولیٹیکل سیکریٹری تھے حیدرآباد آئے ہیں اُن سے ۷ ار جولائی کو ملا۔ دوران گفتگو میں اُن سے نظام کے اختیارات سے متعلق میں نے ذکر کیا۔ سر ہنری کہنے لگے کہ نظام سے یہ کہیے کہ دوران جنگ میں ان مسائل کو نہ چھیڑا جائے۔ میں نے یہ کہا کہ انگریز افسران کا جہاں تک تعلق ہے یا جو لوگ برٹش انڈیا کے وزیر بنائے جائیں۔ اسی قاعدے کے تحت حکومت ہند سے دریافت کیا جائے لیکن باشندگان حیدرآباد سے اگر کسی کو وزیر بنائیں تو نظام کو آزادی ہو۔ سر ہنری کریک تو نیم راضی تھے۔ مگر سر کنراڈ کارفیلڈ ریزیڈنٹ نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ سر اکبر حیدری کا یہ خیال تھا کہ ایسی آزادی نظام کو دینا نامناسب ہوگی اور انتظام میں خرابی پیدا کر دیگی۔

مولا علی کا پہاڑ

یہاں ایک مقام مولا علی کا پہاڑ کے نام سے موسوم ہے۔ یہ خاص خوبصورت جگہ ہے پہاڑی کی چوٹی پر کچھ عمارت بنی ہوئی ہے۔ ایک کمرہ مخصوص بہت بنایا گیا ہے مشہور یہ ہے کہ کسی صاحب نے یہ خواب میں دیکھا کہ حضرت مولا علی کی روح مقدس اس جگہ کہ جہاں یہ کمرہ بنا ہوا ہے تشریف لائی۔ نظام ہر سال یہاں ایک تاریخ کو جاتے تھے اور دونوں شاہزادگان اور دیگر صاحبزادگان اور صدر اعظم کو بھی بلایا جاتا تھا۔ مجھے اکثر حاضری کا موقع ملا۔ اوپر کوہ تک تو موٹر جاتے ہیں۔ یہاں بہت سی عمارات بنی ہوئی ہیں۔ نظام میر محبوب علی خاں مرحوم جب آتے تھے تو ان مکانوں کو کام میں لایا جاتا تھا۔ وہ معہ اپنے امراء اور بیگمات کے یہاں آتے تھے اور دو چار روز قیام کرتے تھے۔ موٹر سے اتر کر نظام اور تمام حاضرین برہنہ پا ہو جاتے اور اسی طرح سیڑھیوں پر چڑھنا شروع کر دیتے جس عمارت پہ حاضری مخصوص ہے وہاں تک پہنچ کر بیٹھنا

ہیں۔ اندازاً پہاڑ کی چوٹی تک چھ سات سو سیڑھیاں ہونگی۔ نظام بڑی شہزادی کے کاندھے پر ہاتھ رکھے ہوئے اور ہر چوکھٹ پر آستانہ بوسی کرتے ہوئے چلے گئے۔ باوجود پیرانہ سالی اور نقاہت جسمانی کے اُن کا اس طرح چڑھنا حیرت انگیز تھا۔ البتہ شہزادگان پر یہ ورزش جسمانی شاق تھی اُن کا طرزِ تکلّم اور حالتِ تنفس اس پر شاہد تھی۔

ہم ایک عمارت پر پہونچے۔ اس کے آخر میں ایک کمرہ ہے اس کے در و دیوار پر شیشہ کا کام ہے کمرہ کے اندر ایک جگہ بہت سے پھولوں کے ہار وغیرہ رکھے تھے۔ سرکار اور جملہ شہزادگان نے پھولوں کے سامنے سجدے کیئے۔ میری جبینِ عبودیت تو ایک ہی آستانہ کی سجدہ گزار رہی ہے۔ میں معذور رہا۔ کچھ فضائل حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ بیان کیئے گئے اور واپسی پر اس درگاہ سے نظام کو ایک جلد کلام پاک اور ایک تلوار دی گئی۔ جس ملازم کے دونوں ہاتھوں میں قرآن شریف تھا۔ وہ حضور نظام سے آگے چلتا تھا اور نظام اس کے پیچھے۔ مجھے یہ طرزِ آداب کلام پاک بہت پسند آیا۔ واپسی کے وقت ہلکی ہلکی بارش شروع ہوگئی حیدرآباد میں نظام جس جلسہ میں ہوں کوئی شخص چھتری نہیں لگا سکتا تھا۔ یہ دیرینہ طریقہ تھا مقصد یہ تھا کہ صاحب چتر و علم تو فقط حکمراں ہوسکتا ہے۔ لہٰذا سوائے اس شخص کے کہ جس کے ہاتھ میں کلام پاک تھا یا نظام کے دیگر سب بغیر چھتریوں کے روانہ ہوگئے۔ یہ غنیمت ہوا کہ بارش تیز نہ تھی۔ راستہ میں تھوڑی سی ہموار جگہ ہے۔ جہاں شامیانہ لگا کر کمال یار جنگ سرکار اور جو ہمراہی ہوں، انہیں چار یا کافی پیش کرتے تھے۔ چنانچہ ہم سب شریک چائے نوشی ہوئے۔ جس شخص کے ہاتھ میں قرآن شریف تھا وہ سرکار کی برابر کی کرسی پر بیٹھتا تھا۔

غلام محمد صاحب مرحوم کی یہ بڑی خواہش تھی کہ نظام اُن سے تنہا ملا

کریں مجھ سے کہا تو میں نے کہا کہ دشوار ہوگا۔ حیدرآباد کی روایات یہ ہیں کہ صدر اعظم کی وساطت سے ہر بات نظام کے سامنے پیش ہو۔ میرا خیال ہے کہ یہ طریقہ کابینہ میں اتفاق قائم رکھنے کے واسطے اچھا تھا ورنہ پارٹی بندی ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ مگر غلام محمد مرحوم نہ مانے اور ہوش بلگرامی کے ذریعہ اسے گوشش گذار کرایا۔ ہونس سرکار کے اسٹاف کے لوگوں میں سے تھے۔ ۲۲ر جولائی کو میرے پاس کاظم یار جنگ یہ پیام لائے کہ میں غلام محمد صاحب سے کہدوں کہ انہیں جو کچھ عرض کرنا ہو صدر اعظم کے ذریعہ سے اور اگر صدر اعظم نہ ہوں اور ضروری بات ہو تو پھر چیف سکریٹری یعنی کاظم یار جنگ کو لکھیں۔ مجھے افسوس ہوا کہ غلام محمد صاحب مرحوم نے اسے مناسب سمجھا ورنہ میں نے منع کیا تھا۔ یہ طریقہ حیدرآباد کے واسطے ضروری تھا۔ ورنہ سازشوں کی گرم بازاری حیدرآباد کے انتظام مملکت کو ختم کر دیتی۔ حضور نظام اس وجہ سے بھی اس تجویز کو پسند نہیں کرتے تھے کہ اگر سوائے صدر اعظم کے دوسرے وزراء کو بھی باریابی کا براہ راست موقع دیا جائے تو پھر انگریز وزیر کو بھی یہی اختیار ہوگا کہ براہ راست حکمراں سے معاملات طے کرے۔ اسے نظام نہ پسند کرتے تھے اور نہ مناسب تھا۔

یکم اگست ۴۲ء کو سرکار نے فرمایا کہ بہادر یار جنگ اور ابو الحسن سید علی اُن سے ملنے حاضر ہوئے تھے اور اپنے غیر مطمئن ہونے کا اظہار کر رہے تھے مطلب یہ تھا کہ حیدرآباد کے حقوق کے متعلق جو نوٹ تیار کیا جا رہا ہے اس میں ان حضرات کا بھی مشورہ ہو۔ حضور نظام نے یہ بھی فرمایا کہ سوائے انگریز ممبر کے اور ممبروں کی رائے سے انہیں مطلع کیا جائے۔ اس مسئلہ کو جب ۵ر اگست ۴۲ء کی کونسل میں پیش کیا تو متفقہ رائے یہ تھی کہ کونسل اس کے واسطے تیار نہیں ہے کہ ایسے اہم مسائل میں باہر کے حضرات کو شریک راز بنایا جائے۔ اگر نظام پسند فرمائیں تو ہم عہدوں سے کنارہ کش ہو جائیں۔

چنانچہ یہی عرضداشت بھیجی گئی۔

حضور نظام کو جب گورنمنٹ کی طرف سے کوئی مراسلہ جاتا تھا تو وہ عرضداشت کی صورت میں پیش ہوتا تھا۔

شروع اس طرح ہوتی تھی۔

"یہ پیشگاہ اعلیٰ حضرت بندگان و عالی و متعالی مدظلہ العالی"

"بعد آستانہ بوسی مودبانہ عرض ہے"

اور ختم اس طرح کیجاتی تھی۔

"الٰہی آفتاب عمر و دولت و اقبال تاباں و درخشاں باد"

عرضی

فدوی جاں نثار

(دستخط صدر اعظم)

۵ اگست کے روزنامچہ میں نے لکھا ہے کہ بہادر یار جنگ ملنے آئے دوران گفتگو میں مجھے یہ معلوم ہو کر حیرت ہوئی کہ یکم اگست کو یہ اور سید ابوالحسن سرکار کے طلبیدہ حاضر ضرور ہوئے تھے مگر گفتگو صرف برار کے طرز حکومت کے متعلق تھی۔ اور انہوں نے میری گورنمنٹ کے کام پر کسی غیر مطمئن ہونے کا اظہار نہیں کیا۔ اور کہنے لگے "یوں سرکار مالک ہیں جو فرماتے ہیں بجا اور درست کہنے کے سوا کیا چارہ ہے"

سنہ ۱۹۴۲ء سارے ہندوستان میں سیاسی طوفان خیز مظاہروں کا سال تھا۔ اس کا اثر ریاستوں پر بھی پڑا۔ چنانچہ حیدرآباد میں بھی طلبا نے مظاہرے اور شورش شروع کر دی۔ ناظم (ڈائرکٹر) تعلیمات اور وزیر تعلیمات کو بلاکر مشورہ کیا اور طے پایا جیسا کہ ایک بار علی گڑھ یونیورسٹی میں کیا گیا تھا۔ طلباء کے والدین اور سرپرستوں کو بلایا جائے اور وہ اپنے بچوں کو نرم و گرم طریقوں سے فہمائش کریں۔ یہ تدبیر ایک بہت بڑی حد تک کامیاب

ہوئی اور شورش کے مظاہرے بند ہو گئے۔ میں نے دیکھا کہ نوعمر طلباء سے معاملہ کرنے میں بجائے استبدادی کارروائی کرنے کے یہ طرز زیادہ کامیاب ہوتا ہے۔ ارکان حکومت کے مقابلہ میں غصّہ اور ضد بڑھتی ہے۔ لیکن اپنے بزرگوں کے سامنے نوعمر ٹھنڈے دل سے بات سننے کو تیار ہو جاتا ہے اور مان لیتا ہے۔ پھر جتنی شورش کرنے والوں کی تعداد ہوتی ہے اُتنی ہی سمجھانے والوں کی ہوتی ہے۔ نوعمر کو غرورِ نفس جیسے وہ خودداری سے تعبیر کرتا ہے اپنی ..... ہو جاتا ہے۔ پھر عمّالِ حکومت کا تیز اور ترش طرزِ عمل نوعمر کو بہت شاق گذرتا ہے۔ اور وہ مناسب بات کو بھی تسلیم کرنے کو اپنی شکست سمجھتا ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ اساتذہ کی طلبا کے دلوں میں عزت نہیں دوسری طرف اساتذہ میں شفقت نہیں۔ پرانا نظریہ۔

"جورِ استاد بہ ز مہرِ پدر"

بالکل مفقود ہو گیا ہے۔ گھر کے بزرگ بڑی حد تک طلبا کو شورش سے روکنے میں مدد دے سکتے ہیں۔

۲۹ اگست ۱۹۴۲ء کو حضور نظام سے بہت خانگی معاملات پر گفتگو رہی۔ وہ میری ذاتی آمدنی، بچوں کی تعداد، شادی شدہ کتنے اور غیر شادی شدہ کتنے ہیں، میں محراب میں قرآن اب بھی سناتا ہوں یا نہیں۔ دریافت فرماتے رہے پھر سیاسی حالات پر گفتگو رہی۔ میں نے عرض کیا کہ خدا کا کرم ہے کہ جیسی شورش برٹش انڈیا ہے۔ حیدرآباد اس سے محفوظ ہے۔ اگر یہاں ہوتی تو برٹش انڈیا سے حالت نازک تر ہوتی۔ فرمایا "کیوں" میں نے عرض کیا کہ یہاں رعایا کے پاس ہتھیار ہیں۔ وہاں نہیں ہیں۔ کہنے لگے "یہ تو بڑا فرق ہے" میں نے اس موقع پر عرض کیا کہ ہندو جماعت کو بھی ساتھ رکھنا ضروری ہے۔ سرکار نے جو فرمایا اُس کا منشا یہ تھا کہ شورش کرنے والوں کو سزا دینی چاہیئے۔ میں نے کہا کہ شوریدہ سر لوگوں کا علاج سختی ہے۔ مگر عام لوگوں کے دلوں کو بھی ہاتھ میں لینا ضروری ہے۔

(پرنس کی تعلیم)

اس زمانہ میں پرنس مکرم جاہ بہادر کی عمر نو سال تھی۔ اعلیٰحضرت ہز ہائینس پرنس آف برار بالخصوص پرنسس آف برار کو ان کی تعلیم کے متعلق فکر تھی۔ میری رائے دریافت کی۔ میں نے کہا کہ پرنس کی تعلیم کسی مدرسہ میں داخل کرا کر ہونی چاہیئے تاکہ پرنس مستقبل کے حالات کا مقابلہ کر سکیں۔ اس کا ذکر کاظم یار جنگ سے کیا گیا۔ اُن کی رائے میں یہ تجویز کہ پرنس کو کسی پبلک اسکول یا مدرسہ میں داخل کیا جائے حیدرآباد کی روایات کے خلاف تھی۔ پرنس آف برار اور پرنسس دُرِّشہوار کو میری رائے سے اتفاق تھا۔ کاظم یار جنگ نے اس مسئلہ کو حضور نظام سے عرض کیا۔ جواب میں سرکار نے کاظم یار جنگ کے ذریعہ یہ کہلا دیا کہ ابھی بچہ کی عمر ہی کیا ہے اور اس جنگ کے پُر آشوب زمانہ میں تعلیم کا کیا انتظام ہو سکتا ہے اور سم ندا زیتا زیادہ یہ تھا کہ کاظم یار جنگ نے پرنس آف برار سے کہا کہ ریزیڈنٹ کی بھی یہی رائے ہے جو خلاف واقعہ تھا۔ جب میں نے پرنس آف برار سے یہ قصہ سُنا تو کہا کہ اگر لڑائی ختم نہیں ہوتی تو کیا پرنس مکرم جاہ کی تعلیم بھی نہ ہوگی۔ اس قصہ میں بڑی کشمکش رہی۔ جب سرکار نیم راضی ہوئے تو بورڈنگ میں رہنے کے خلاف تھے لیکن مکرم جاہ اور اُن کے بھائی مُفخّم جاہ کی تعلیم کی تکمیل کا سہرا اُن کی محترمہ والدہ ہز ہائینس شہزادی دُرِّشہوار کے سر تھا وہ برابر مصر رہیں کہ ان کی تعلیم پبلک اسکول میں ہو۔ آخرکار دہرہ دون کے پبلک اسکول میں انہیں داخل کیا گیا۔ ویسرائے کو خود بھی اشارۃً اس تجویز کی تائید کرنی پڑی تب کہیں نظام راضی ہوئے۔

پرنسس دُرِّشہوار ایک نہایت ہوشمند۔ دوربین اور قابل خاتون ہیں اور زبردست شخصیت کی حامل ہیں۔ یہ جس جلسہ میں ہوں یہ بتانے کی

ضرورت نہیں ہوتی کہ شہزادی کون ہیں یہ ترک شہزادی ہیں اور آخری
سلطان کی لڑکی ہیں۔ انگلش، فرنچ، جرمن زبانوں پر پورا عبور ہے ترکی
اُن کی مادری زبان ہے اور اب اردو میں بھی بے تکلف بات کر لیتی ہیں
باری تعالیٰ نے انہیں صوری اور معنوی تمام خوبیوں سے سرفراز فرمایا ہے۔
ترکی انقلاب کے بعد سلطان معہ اپنے خاندان کے فرانس آ گئے۔ پہلی
گول میز کانفرنس کے زمانہ میں مولانا شوکت علی و محمد علی مرحومین نے شہزادی
درشہوار اور شہزادی نیلوفر کی شادی کے متعلق سلطان مرحوم سے طے
کیا اور پھر اعلیٰ حضرت سے گفتگو کر کے ہز ہائینس پرنس اعظم جاہ ولیعہد کی شادی
شہزادی درشہوار اور شہزادی نیلوفر کی شادی پرنس معظم جاہ سے ہوئیں۔

حیدر آباد کی یہ روایت کہ نظام کے بچوں کو عام مدارس میں تعلیم
دینا اُن کی شان کے خلاف ہے بہت ہی غلط اور نقصان دہ تھی
کتابی تعلیم اپنی جگہ ہے اور بغیر اس کے علوم و فنون کا علم ناممکن ہے
مگر انسانیت کی تکمیل بغیر تربیت نہیں ہوتی اور صحیح تربیت کے لئے
ضروری ہے کہ نوعمر کے دل میں دوسروں کے احساسات کا احترام
پیدا کیا جائے۔ اگر حکمراں اپنے بچوں کو گھر پر تعلیم دیں گے تو ان میں
امارت اور علیحدگی کا جذبہ پیدا ہو گا۔ اور جمہوریت کے ساتھ یہ چیزیں نہیں
چل سکتیں۔ وہ زندگی کے حوادث کی تاب نہ لا سکیں گے۔ مساوات
اور موانست ان پر گراں گذرے گی اور یہ بہت بڑی محرومی ہے۔ جس
کا تمام عمر سابقہ رہے گا۔ تعلیم کا مقصد نوعمر کو کشمکش حیات کے لئے
تیار کرنا ہے جس سے عہدہ برآ ہونا ہمیشہ لازم آئیگا۔

۱۱ اکتوبر ۴۲ء کو اعلیٰ حضرت سے طویل اور کارآمد گفتگو رہی۔
اس کا سلسلہ یوں شروع ہوا کہ غلام محمد صاحب مرحوم نے جو پہلا
بجٹ بنایا تو عمداً اُسے خسارہ کا بجٹ بنایا جس میں خرچ کو آمدنی کے

مقابلہ میں چوراسی لاکھ زیادہ دکھایا۔ میں نے مرحوم کو بتا دیا تھا کہ بجٹ
میں آمدنی کم نہیں ہے مگر کوشش کرکے ایسا لیا گیا تھا۔ وجہ غالباً یہ
تھی کہ حکومت ہند چاہتی تھی کہ ریاستیں بھی انکم ٹیکس لگائیں۔ انکم ٹیکس
نہ ہونے کی وجہ سے کاروباری حضرات برٹش انڈیا پر ریاستوں کو
ترجیح دیتے تھے اور حکومت ہند کے انکم ٹیکس کا نقصان ہوتا تھا۔
غلام محمد صاحب کے اصرار پر میں نے اپنی عرضداشت کے ساتھ
یہ بجٹ سرکار کو بھیجدیا۔ اعلیٰ حضرت نے میری عرضداشت کے
متعلق فرمایا کہ انکم ٹیکس لگانا یہاں کی روایات کے خلاف ہے اور
ہم نے کبھی یہاں انکم ٹیکس نہیں لگایا۔ اسی سلسلہ میں فرمایا کہ جمہوری گورنمنٹ
ایسا کرے تو دوسری بات مگر خود مختار حکمراں کو ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔
اگر موازنہ (بجٹ) میں کمی پڑیگی تو صرف خاص سے پوری کردی جائیگی۔
میں نے اس پر سرکار کی بہت تعریف کی اور کہا کہ گورنمنٹ نے بجٹ
ایسا بنایا کہ جیسا کسی گورنمنٹ کو بنانا چاہیئے مگر یہ حکمراں کو اختیار ہے کہ
وہ اگر ضرورت ہو تو اپنے پاس سے روپیہ دے مگر رعایا کو ٹیکس سے
بچائے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ یہ اہل حیدرآباد کی خوش نصیبی ہے۔ پھر وہاں
کے امراء کے متعلق فرماتے رہے۔ اُن کی وفاداری سے مشکوک تھے
اس کے بعد مخلوط اور جداگانہ انتخاب پر گفتگو شروع ہوئی۔ سرکار کو یہ غالباً
اتحاد المسلمین کے حضرات سے معلوم ہو چکا تھا کہ میں حیدرآباد میں جدا
گانہ انتخاب کے خلاف ہوں اور وہاں کے مسلمان اتحاد المسلمین کے
زیر اثر جداگانہ انتخاب کے طرفدار تھے۔

نظام بجا طور پر یہ جاننا چاہتے تھے کہ مسلمانان ہند کے عام رائے
کے خلاف یہاں میری رائے مخلوط انتخاب (نشستوں کو ریزرو کرتے
ہوئے) کی موافقت میں کیوں ہے۔ میں نے سرکار کو تفصیل کے ساتھ بتایا

کہ حیدرآباد کے خاص حالات میں جداگانہ انتخاب کیوں مضر ہوگا مختصرًا میری تقریر کا منشاء یہ تھا کہ برٹش انڈیا اور حیدرآباد کے حالات یکساں نہ تھے۔ برٹش انڈیا میں تین پارٹیاں تھیں۔ اکثریت کی پارٹی۔ اقلیت کا گروہ اور برٹش حکومت۔ حکم شد کا اختیار کامل صرف آخر الذکر پارٹی کے ہاتھ میں تھا۔ باقی دونوں فریقین اپنے دلائل پیش کر سکتے تھے مگر فیصلہ برٹش حکومت کی رائے پر منحصر تھا۔ مثلاً مدعی یا مدعا علیہ کی حیثیت سے اکثریت اور اقلیت کام کرتی تھیں اور قاضی یا جج کی حیثیت برٹش حکومت کی تھی لہٰذا ضرورت اس کی تھی کہ کمزور پارٹی کے نمائندے یا وکیل اپنے دلائل پوری زبانت کے ساتھ برٹش حکومت کے سامنے پیش کرکے دادخواہ ہوں اور انصاف چاہیں۔ حیدرآباد میں کوئی تیسری پارٹی یا بدیشی حکومت نہ تھی اگر جداگانہ انتخاب ہوگا تو فرقہ وارانہ جذبات کو ترقی ہوگی اور محبت اور اتفاق باہمی کی فضا جو ہمیشہ حیدرآباد کا طرۂ امتیاز رہی ہے ختم ہو جائیگی میں نے یہ بھی عرض کیا کہ حکومت اور رعایا کے درمیان محبت کے تعلقات ہونے چاہئیں اس کے بعد کوئی شرارت کرے تو بلاخوف سزا دینی چاہئیے حضور نظام بہت غور سے سنتے رہے۔ اور جب ملاقات ختم ہوئی تو فرمایا کہ آج بہت کارآمد بات چیت ہوئی۔

۱۴ اکتوبر ۱۹۴۲ء کو نئے ریزیڈنٹ سر آرتھر لوتھین نے آکر چارج لیا میں ان سے پہلے سے واقف تھا۔ یہ نہایت فہیم اور تجربہ کار افسر تھے۔ ریاستوں میں ریزیڈنٹوں کے ذرائع معلومات اتنے وسیع تھے کہ ہر چیز کی اطلاع انہیں ہوتی تھی۔ میرا یہ خیال ہے کہ محلات میں خود ایسے لوگ موجود تھے کہ جو ریزیڈنٹ کو باخبر رکھتے تھے۔ میں اُن سے ۱۵ اکتوبر کو ملا۔ مجھ سے دریافت کیا کہ اب کوئی گورنمنٹ کے خلاف محاذ (FRONT) تو نہیں ہے۔ میں نے انکار کیا پھر ایک ایک ممبران وزارت کا حال دریافت

کرتے رہے۔ میں نے دیکھا کہ انہیں پوری طرح ان حضرات کی خوبیاں اور کمزوریاں معلوم تھیں۔ میں نے سرعقیل جنگ اور مہدی یار جنگ مرحومین کی بہت تعریف کی۔ پھر کاظم یار جنگ کے متعلق کہا کہ احکامات جاری ہونے میں اسقدر تعویق اور دیر کیوں ہوتی ہے۔ اُن کا منشا یہ تھا کہ دفتر پیشی نظام سے احکامات جاری نہیں ہوتے جب تک کاظم یار جنگ کو خوش نہ کیا جائے۔ کاظم یار جنگ کے حالات حیدرآباد میں راز نہ تھے۔ مجھے کہنا پڑا کہ بعض اوقات اپنی ذاتی اغراض کی بنا پر پیشی سے احکام جاری کرنے میں تاخیر کردیتے ہیں۔ پھر شہزادگان کا ذکر کرتے رہے۔ برٹش حکومت کو اب بھی بعض باتوں پر اعتراض تھا جس کی میں نے صفائی کی۔ آخر میں کہا کہ گزشتہ عالمی جنگ کے موقعہ پر سرکار کے دلی رجحانات برٹش حکومت کے خلاف تھے اب کیا حال ہے۔ میں نے کہا کہ جنگی کاموں میں مجھے کوئی دقت نہیں ہوئی اور نظام کا پورا تعاون مجھے حاصل رہا میں نے عمداً سرکار کے دلی رجحانات کا ذکر نہیں کیا۔

یکم نومبر ۴۲ئہ کو میں سرکار کے پاس حاضر ہوا تو معلوم ہوا کہ گذشتہ پندرہ روزہ ملاقات میں ریزیڈنٹ نے نظام سے کہا کہ ال۔ ادروس کو کہ جو حیدرآباد کی فوج کے کمانڈر تھے C.B.E. کا خطاب دیا جائے۔ میں نے عرض کیا کہ کیا حرج ہے۔ فرمایا کہ نہیں پہلے پرنس آف برار کو جو حیدرآباد کی فوج کے کمانڈر ہیں خطاب ملنا چاہیئے۔ میں نے اتفاق کیا اور کہا کہ ریزیڈنٹ کی تجویز کو حضور میرے پاس بھیج دیں۔ میں حکومت حیدرآباد کی طرف سے تحریک کروں گا کہ اول پرنس کو G.C.I.E. دیا جائے چنانچہ میں نے ریزیڈنٹ سے گفتگو کرکے یہ طے کرا یا کہ وہ پُرزور سفارش پرنس کو خطاب G.C.I.E. کی کریں اور میں نے سرکار کو مطلع کردیا کہ یہ طے پایا ہے لیکن میں ششدر رہ گیا جب ۶ نومبر کو حضور نظام نے مجھے اس خط کی نقل دکھائی جو ایک روز قبل

وہ ویسرائے کو روانہ کر چکے تھے۔ اس میں سرکار نے اپنے دونوں شہزادوں کی شکایت کی تھی۔ اور بہت تفصیل کے ساتھ۔ فضول خرچ اور مقروض ہونے کا ذکر بھی تھا۔ جب میں نقل خط پڑھ چکا تو اعلیٰ حضرت نے فرمایا کہ آپ کی کیا رائے ہے میں نے کہا کہ اچھا ہوتا اگر یہ خط کچھ مہینہ بعد گیا ہوتا۔ ایک طرف ولیعہد کے واسطے G.C.I.E کی سفارش اور دوسری طرف یہ خط طرح طرح کی شکایات سے لبریز۔ ویسرائے پر اس کا اثر ظاہر ہے کیا ہوا ہوگا۔ اس پر اعلیٰ حضرت برہم ہوگئے اور فرمایا کہ اور کیا میں یہ کہتا کہ میرے لڑکوں میں یہ خوبیاں ہیں۔ ایسے لائق اور قابل ہیں۔ کیا میں ان باتوں کو ویسرائے سے چھپاتا۔ میں صاف کہتا ہوں۔ صاف کرداری ہی صفت ہے۔ اس کے بعد دونوں شہزادوں پر برس پڑے اور بہت کچھ اُن کے خلاف کہتے رہے۔ میں خاموش سنتا رہا۔ بار بار مجھ سے فرماتے تھے کہ آپ کچھ نہیں کہتے۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہتا تھا کہ یہ شہزادوں کی بدنصیبی ہے کہ جو ایک شفیق باپ کو ناخوش کیا۔ آخر کار میں نے مجبور ہو کر کہا کہ حضور اُن کے والد ہیں جو کچھ بھی ارشاد فرمائیں حضور کو حق ہے مگر میرے تو آقا زادے ہیں۔ میں کوئی نا ملائم لفظ اُن کے متعلق کیسے کہوں۔ یہ سُنکر خاموش ہوگئے۔

حیدرآباد میں چند لوگ نظام کے اسٹاف کے لوگ کہلاتے تھے۔ غالباً ایسے لوگ سب ہی ریاستوں میں ہونگے۔ اُن کا کام تھا کہ جو کچھ حکمراں کی زبان سے نکلے وہ اُسے بڑی آب و تاب کے ساتھ سراہیں اور اپنی طرف سے بڑھا کر تائید کریں۔

ایک واقعہ یاد آرہا ہے۔ شہزادہ معظم جاہ نے ایک بار مجھ سے ہوش یار جنگ کی شکایت کی کہ ہوش نے نظام کے حضور میں تمام اسٹاف کے سامنے اُن کی بیوی شہزادی نیلوفر کے متعلق نا شائستہ اور توہین آمیز

الفاظ استعمال کئے اور معظم جاہ کو بجا طور پر اس سے تکلیف پہونچی۔ میں نے ہوش یار جنگ کو بلایا۔ یہ نظام کے اسٹاف میں تھے۔ اُردو اچھی لکھتے تھے شاعر اور بہت چرب زبان تھے۔ میں نے اُن سے کہا کہ پرنس معظم جاہ کو شکایت ہے کہ تم نے سرکار کے سامنے پرنس نیلوفر کے متعلق ناشائستہ اور توہین آمیز الفاظ استعمال کئے ہوش نے اقرار کیا اور اپنی صفائی میں ایک قصہ سنایا۔ جو بہت مشہور ہے۔

ایک رئیس اپنے باغ میں بیٹھے تھے۔ مصاحبین گرد و پیش ہالہ بنائے ہوئے تھے۔ سامنے ایک کیاری میں بیگن لگے ہوئے تھے۔ رئیس صاحب نے کہا کہ کس قدر خوبصورت معلوم ہوتے ہیں سبز درخت اور اس میں اودے رنگ کے پھل۔ بس پھر کیا تھا۔ درباریوں نے بینگن کی تعریف میں قصیدہ خوانی شروع کر دی اور اُسے جنتی میووں کے قریب پہونچا دیا۔ یکایک رئیس نے کہا کہ حکما اس کو اچھی ترکاری خیال نہیں کرتے۔ طبا مفید نہیں ہے۔ درباریوں نے بھی رُخ بدلا اور بینگن کی مذمت اور رسوائی میں مبالغہ شروع ہو گیا۔ ترکاری بدذائقہ ہوتی ہے۔ خون غیر صالح پیدا کرتا ہے درخت میں لگے ہوں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مردے چوہے لٹک رہے ہیں نہ صورت خوشنما نہ سیرت اچھی۔ رئیس نے کہا کہ ابھی تو آپ لوگ اتنی تعریف کر رہے تھے۔ اس پر ایک درباری نے کہا کہ حضور ہم آپ کے نوکر ہیں بینگن کے نہیں۔ اس کے بعد ہوش نے کہا کہ میں نظام کا نوکر ہوں جسے وہ برا کہتے ہیں اُن سے زیادہ بُرا کہتا ہوں۔ جس کی سرکار تعریف کریں میں بھی قصیدہ خوانی شروع کر دیتا ہوں۔

۱۵ ارنومبر ۱۹۴۲ء کو لارڈ لنلتھگو وِیسرائے سے ملاوہ آل انڈیا بوائے اسکاؤٹ کے متعلق گفتگو کرتے رہے اور MR. HOOG کے بجائے ڈپٹی چیف کمشنر کون ہو۔ میری رائے دریافت کی۔ میں نے مسٹر جسٹس مہدی یار

بوس کا نام لیا جو مدھیہ پردیش ہائی کورٹ کے جج تھے۔ میں نے کہا کہ اُن کے
ریٹائر ہونے کا نظام کو بہت افسوس ہے۔ میں نے دریافت کیا کہ انکا جانشین
کون ہوگا۔ کہنے لگے نظام نے مجھے خط لکھا ہے۔ اس کا جواب دونگا اور
جانشین کے متعلق ابھی طے نہیں ہوا ہے۔ پھر پوچھا کہ شہزادوں کا کیا
حال ہے میں نے فوراً کہدیا کہ وہ خط میں نے دیکھا ہے جو نظام نے انہیں
لکھا تھا۔ میں نے اُن سے کہا کہ اچھا ہو کہ آپ نظام کی خواہش کے مطابق
اُنہیں خط لکھدیں۔ اور نظام شہزادوں کو تنبیہہ کردیں۔ پھر علی گڑھ اور عثمانیہ
یونیورسٹیوں کی تعریف کرتے رہے کہ یہاں کے لڑکے کسی شورش میں شریک
نہیں ہوئے۔ پرنس مکرم جاہ کی تعلیم کے متعلق گفتگو کرتے رہے جس کا پچھلے
اوراق میں ذکر آچکا ہے۔

میں ۲۶ نومبر کو حیدرآباد واپس پہونچا۔ جاتے ہی مہر خاں نے مجھ سے
کہا کہ گذشتہ شب سر محمد یعقوب مرحوم کا انتقال ہوگیا۔ یہ مراد آباد کے
رہنے والے تھے مسلم یونیورسٹی کے ٹرسٹی تھے۔ دہلی میں قانون ساز جماعت
کے ممبر تھے۔ میں نے ہی انہیں اس غرض سے رکھا تھا کہ حیدرآباد میں جمہوری
رنگ میں کچھ اصلاحات جاری کئے جائیں اور وہ اسکیم تیار کر رہے تھے
میں اُن کے دفن میں شرکت کے بعد گھر گیا۔

یہاں انتظامی اعتبار سے یہ بڑی خرابی ہے کہ کوئی چیز راز میں نہیں رہ سکتی
یوں تو دفاتر سے بھی راز افشا ہوتا رہتا ہے۔ لیکن دفتر پیشی سرکار میں جاکر
ہر راز طشت از بام ہوجاتا ہے۔ نظام کا وائسرائے کو اپنے بیٹوں کی
شکایت کا خط لکھنا مسٹر گرگ سن کو معلوم تھا۔ حکیم مقصود جنگ مرحوم جو نظام
کے اسٹاف میں ہوشن مرحوم کی طرح تھے میرے پاس آئے اور کہا کہ آج
کل چھوٹے شہزادے پر روزانہ نہایت سخت الفاظ میں برہمی کا اظہار ہوتا
رہتا ہے اسی طرح سرکار جو کچھ کہتے وہ اس شخص کو معلوم ہوجاتا جس سے

متعلق وہ بات ہوتی۔ ریزیڈنٹ کے یہاں سرفیروز خاں کا لنچ تھا۔ سرفیروز میرے پاس ٹھہرے ہوئے تھے۔ پرنس معظم جاہ اور شہزادی نیلوفر بھی تھیں مجھ سے شہزادی نیلوفر نے کہا کہ آج کل اعلیٰ حضرت میرے خاوند سے بہت خفا ہیں۔ میں نے کہا کہ ہاں قرض وغیرہ کی وجہ سے ایسا ہے۔ کہنے لگیں کہ قرض ہی کی بات ہوتی تو خیر۔ مگر جو کچھ اور کہا جاتا ہے غلط ہے۔ مجھ سے زیادہ کون جا سکتا ہے میں اُن کی بیوی ہوں۔ میں نے یہ کہہ کر قصہ مختصر کر دیا کہ ایسے نشیب و فراز زندگی میں آتے رہتے ہیں آپ متفکر نہ ہوں۔

سرفیروز خاں نون ویسرائے کی انتظامیہ کونسل کے ممبر تھے۔ میرے خاص کرم فرما تھے۔ بڑے سچے اور قابل اعتماد دوست پنجاب میں وزیر رہے۔ ویسرائے کی مجلس انتظامیہ کے ممبر رہے۔ پاکستان بننے کے بعد بھی وزارت میں رہے اور کچھ دنوں وزیر اعظم پاکستان بھی رہے۔ میرے یہاں سرفیروز کا سرکاری ڈنر تھا۔ جس میں ریزیڈنٹ ولیعہد اور عمائدین حیدرآباد شامل تھے۔ ولیعہد ڈنر کے بعد ایک طرف مجھے لیکر بیٹھ گئے تمام مہمان رخصت ہو چکے تھے۔ مجھے صمد یار جنگ مرحوم نے جو ولی عہد کے کنٹرولر تھے کہہ دیا تھا کہ پرنس آپ کا شکریہ ادا کریں گے۔ پرنس نے میرا شکریہ ادا کیا کہ میں اُن کے واسطے G.C.I.E. کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے کہا کہ میں نے کبھی اس کا ذکر آپ سے نہیں کیا۔ اس لئے کہ جب تک کام نہ ہو جائے۔ تذکرہ بے سود ہے۔ شعر

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھئے قطرے پہ کیا گذرے گہر ہونے تک

قطرے کو گہر تک کتنے سانحات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ پہلا موقع ہے جو حکومت برطانیہ نے کسی کو G.C.I.E. کا خطاب حکمراں ہونے سے پہلے دیا ہو۔ مجھے امید ہے کہ پہلی جنوری تک مل جائیگا۔

ہنس کر فرمانے لگے۔ کیا میں پہلی جنوری تک حکمراں بھی ہو جاؤں گا۔ میں نے کہا کہ میرا منشاء خطاب سے ہے اور وقت آئے گا تو یہ بھی ہو جائیگا میں یہ کیا جانتا تھا کہ پرنس کبھی حکمراں نہ ہوں گے (صمد یار جنگ) یہ پہلے فوج کے معتمد (سکرٹیری) تھے۔ اب ریٹائر ہونے کے بعد ولیعہد کے کنٹرولر مقرر ہوئے تھے۔ علمی قابلیت بہت اچھی تھی۔ فارسی، انگریزی اور فرنچ زبانوں پر اچھا عبور تھا۔ صاحب کردار اور قابل اعتماد شخص تھے۔ حیدر آباد کا یہ عجیب دستور تھا کہ شہزادوں کے ساتھ باوجود اُن کے صاحب اہل و عیال ہونے کے۔ ایک کنٹرولر ضرور رہو ہیں ہمیشہ کنٹرولر کو (کنٹرولڈ) کہا کرتا تھا۔ جب شہزادوں پر خفگی ہوتی تھی تو اعلیٰ حضرت انہیں بلا کر اظہار ناخوشی فرماتے تھے۔ بس یہی اُن کا کام تھا کہ عتاب کی موجوں کے تھپیڑے برداشت کیا کریں۔

سر فیروز خاں نون اعلیٰ حضرت سے ملے۔ نظام نے اُن کے متعلق جو رائے قائم کی وہ پرنس اعظم جاہ اور معظم جاہ دونوں کے علم میں تھی جو تفصیل کے ساتھ ان حضرات نے مجھ سے بیان کی کہ سرکار فیروز خاں نون سے زیادہ متاثر نہیں ہوئے اور سر سلطان اور سر مرزا اسماعیل کی تعریف کرتے تھے۔

حیدر آباد میں دیگر ریاستوں سے زیادہ برٹش گورنمنٹ دخل دیتی تھی اور صدر اعظم (وزیر اعظم) کو بسا اوقات جام و سندان باختن پر بھی عمل کرنا پڑتا تھا۔ ایک طرف حضور نظام کے محسوسات اور خواہشات کا احترام دوسری جانب حکومت ہند کی پالیسی کا خیال۔ وزیروں کا انتخاب بغیر مشورہ حکومت ہند نہیں ہوتا تھا۔ ہر مہینہ میں دو بار ریزیڈنٹ نظام سے خود ملتا اور انتظامی معاملات میں گفتگو کرتا۔ اس کا ایک نوٹ تیار ہوتا تھا جس کی ایک نقل دفتر پیشی اور دوسری ریزیڈنٹ کے پاس رہتی تھی۔

SELF DENIAL POLICY

ایک روز اعلیٰ حضرت نے دریافت فرمایا کہ (SELF DENIAL POLICY) سے کیا مطلب ہے میں نے عرض کیا کہ کس موقعہ پر یہ فقرہ استعمال ہوا ہے۔ سرکار نے کاظم یار جنگ کو حکم دیا کہ ریزیڈنٹ سے ملاقات کا نوٹ دکھاؤ۔ میں نے اُسے پڑھ کر کہا کہ اس کا منشا یہ ہے کہ اگر دشمن کسی ملک میں آجائے تو ایسی چیزوں کو جن کی مدد سے دشمن لڑائی کو زیادہ مدت تک جاری رکھ سکے اس سے بچایا جائے وہ دشمن کے ہاتھ نہ آئیں۔ سرکار نے فرمایا کہ کیا وہ ہمارے محلات وغیرہ جیسے فلک نما۔ اُنہیں ڈہا دینگے۔ میں نے کہا نہیں۔ اس کا منشا یہ ہے کہ جیسے بجلی کا پاور ہاؤس یا ریل یا کانیں کوئلہ وغیرہ کی۔ انہیں بیکار کر دیا جائے۔ سرکار نے کہا "میں ریزیڈنٹ کو لکھ دوں گا کہ یہ مسئلہ گورنمنٹ کے طے کرنے کا ہے۔ میں نے جو کچھ کہا وہ میری سرسری رائے تھی۔

۱۲ر دسمبر ۴۲ء کو کاظم یار جنگ آئے۔ اُنہیں یہ معلوم تھا کہ حکومت ہند میں اُن کے خلاف شکائتیں ہوئی ہیں۔ مجھ سے کہنے لگے کہ وہ رشوت نہیں لیتے ہیں اور نہ برٹش حکومت کے خلاف ہیں۔ انہوں نے اپنی ذاتی آمدنی اور خرچ کا کئی سال کا حساب مجھے دیا اور یہ خواہش کی کہ میں اُسے گرگسن کو جو میری گورنمنٹ میں ممبر تھا اور ریزیڈنٹ کو دکھا کر ان کی پوزیشن صاف کر دوں میں نے دوسرے روز ریزیڈنٹ کو وہ کاغذات دکھا دیئے۔ جب دوبارہ کاظم یار جنگ میرے پاس آئے تو میں نے اُن سے کہا کہ تمہارے کاغذات میں نے ریزیڈنٹ کو دکھا دیئے تاکہ پوزیشن صاف ہو جائے۔ اظہار تشکر میں اس زمانہ کا حیدرآبادی طرز شائل تھا کہنے لگے "جس چیز میں آپ کو خاص دلچسپی ہوا کرے مجھ سے فرما دیا کیجئے" تاکہ فوراً نظام کا حکم آجائے۔ میں نے کہا مجھے کوئی دلچسپی اس معنیٰ میں کہ میرا ذاتی نفع ہو کسی معاملے سے کبھی

نہیں ہوگی۔ میری دلچسپی ہوتی ہے وہ محض اس نوعیت کی ہوتی ہے کہ حکومت کا نفع اور نقصان کس چیز میں ہے۔

یکم جنوری ۱۹۴۳ء کو ولیعہد پرنس آف برار کو G.B.E. کا خطاب مل گیا۔ حضور نظام کو مبارکباد کا عریضہ بھیجا۔ جمعہ کی نماز جو مسجد میں (موجودہ باغ عام) سرکار پڑھتے تھے۔ اور میں حاضر ہوتا تھا۔ سرکار آئے بہت خوش تھے۔ پوچھا یہ کیا خطاب ہے میں نے عرض کیا کہ جو سرکار کے پاس بھی ہے وہی یہ ہے۔

شام کو پرنس نے چاء پر بلایا۔ وہ شکر گذار تھے اور بہت مسرور تھے

۲ جنوری ۱۹۴۳ء کو سرکار کا مطلوبہ حاضر ہوا۔ G.B.E. کے متعلق کچھ اس طرح فرمایا کہ یہ کوئی چیز نہیں۔ میں نے عرض کیا کہ جیسا حضور نے حکم دیا کہ یہ خطاب پرنس کو ملنا چاہئیے اس کی تعمیل ہوئی۔ اور بہت سے والیانِ ملک تو اس پر رشک کرتے ہونگے۔ اس کے دو ہی ایک روز بعد بہادر یار جنگ کی طرف سے رہبر دکن میں ایک مضمون شائع ہوا کہ ہمارے پرنس کے واسطے یہ خطاب وجہ ناز نہیں۔ یہ تو محکومی کی دلیل ہے۔ گو نظام نے اسے قبول کیا مگر ہم لوگ پسند نہیں کرتے۔ سرکار نے اس مضمون کی طرف وزرارکی کونسل کو نیم سرکاری خط کے ذریعہ سے متوجہ کیا۔ اہر گرسن نے خود اس معاملہ کو اٹھایا اور یہ خیال ظاہر کیا کہ بہادر یار جنگ پر مقدمہ چلایا جائے میں نے اس لئے اس کی مخالفت کی کہ یہ غلط علاج ہوگا۔ اور جو بہادر یار جنگ نے کہا وہ اُن کی پارٹی کے ممبران بھی دُھرائیں گے۔ اس طرح سنتبہ گرہ شروع ہو جائے گی علاوہ ازیں کسی دفعہ کے تحت مقدمہ چلے گا۔ یہ کہنا کہ میری رائے میں یہ خطاب شہزادے کے واسطے کوئی عزت نہیں کسی جرم کی تعریف میں نہیں آتا۔ کونسل نے یہ طے کیا کہ اعلیٰ حضرت ایک فرمان کونسل کو بھیجیں جس میں اس خطاب پر طمانیت

کا اظہار فرمائیں۔ میں نے کابینہ کی اس رائے کو پسند کیا۔ اس لئے کہ اعلیٰ حضرت ایسے خطاب کے ملنے کے متعلق کئی بار فرما چکے تھے۔ اور انہیں کے حکم کی تعمیل میں اس خطاب کی تحریک میں نے کی تھی۔

۹ر جنوری ۱۹۴۳ء کو میں دفتر پیشی میں حاضر ہوا۔ اور کونسل کی اس قرار داد کو سرکار میں پیش کیا۔ مجھے سخت حیرت ہوئی کہ اعلیٰ حضرت ایسا فرمان لکھنے سے گریز فرماتے ہیں اور مجھ سے فرمایا کہ تم ریزیڈنٹ سے مل لو اور کہو کہ اس بیان کی طرف سرکار نے کونسل کی توجہ دلائی مگر کونسل کی یہ رائے ہے کہ اس وقت اعلیٰ حضرت کا اس بیان کی تردید کرنے سے غلط فہمی پیدا ہو گی۔ میں نے عرض کیا کہ کونسل کا فیصلہ میں پیش کر چکا ہوں کونسل ایسی تردید کی موافقت میں ہے اور کونسل کی قرارداد کوئی راز نہیں جو ریزیڈنٹ کے علم میں نہ ہو۔ فرمایا اچھا تم ریزیڈنٹ سے کہنا کہ سرکار کی یہ رائے ہے میں نے عرض کیا کہ تعمیل ہو گی۔

دوسرے روز میں ریزیڈنٹ سے ملا۔ وہ بہادر یار جنگ کی تقریر کا ترجمہ لئے ہوئے نہایت برہم بیٹھے تھے میں نے انہیں کونسل کا ریزولیوشن دکھایا وہ اسے ناکافی خیال کرتے تھے۔ میں نے اس تمام گفتگو کا نوٹ تیار کر لیا۔ جس کا منشاء یہ تھا کہ نہ صرف کونسل کی رائے کے مطابق سرکار فرمان جاری کریں بلکہ سرکار کو حکم دینا چاہیئے کہ بہادر یار جنگ معافی مانگیں۔ میں نے دوسرے روز اپنی ملاقات کا نوٹ پیش کیا۔ سرکار نے حکم دیا کہ کونسل کی رائے کے مطابق جریدے میں فرمان شائع ہو۔ میں نے سرکار سے عرض کر دیا کہ وہ بہادر یار جنگ کو حکم دیں کہ اب کوئی مضمون نہ لکھیں۔ چنانچہ کاظم یار جنگ کے ذریعہ ایسا حکم چلایا گیا۔

پرنس کا خطاب G.B.E. میرے واسطے ایک درد سر بن گیا جس کا قصہ عرصہ تک چلتا رہا ریزیڈنٹ نے اس معاملہ کو دہلی بھیجا تاکہ وہاں کی ہدایات

حاصل کرے۔

۱۱ر جنوری کو میں بھوپال پہونچا اور ۱۲ر کو وہاں سے چلکر لکھنؤ آیا۔ سر موریس ہیلٹ گورنر تھے اُن سے ملا۔ اس زمانہ میں جنگ کی وجہ سے برٹش گورنمنٹ نے منسٹروں کی بجائے ایڈوائزرس مقرر کر رکھے تھے۔ انہوں نے مجھ سے مشورہ کیا کہ اگر منسٹر مقرر کئے جائیں تو کیسا ہو۔ میں نے کہا کہ اگر آپ منسٹر مقرر کریں تو وہ اسمبلی کو جواب دہ ہوں تب تو ٹھیک ہوگا۔ لیکن جب تک اسمبلی برسر کار نہ ہو اس وقت تک منسٹروں کا ہونا بے معنی ہوگا۔

اُنہوں نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ خلیق الزماں صاحب حیدرآباد میں ملازمت چاہتے ہیں گورنر کے سکرٹری نے کہا کہ چودھری خلیق الزماں نے یہ خواہش کی ہے کہ گورنر حیدرآباد کے ریزیڈنٹ کو اُن کی ملازمت کے متعلق لکھیں۔ مگر گورنر نے یہ کہا کہ وہ مجھ سے ذکر کردیں گے۔ خلیق الزماں بھی ملے اور کہا کہ گورنر نے مجھ سے ذکر نہیں کیا۔ اگر وہ یہ چاہتے تھے کہ ملازمت میں حیدرآباد جانا نہ ہو۔ لکھنؤ میں ہی کچھ ہو جائے۔ جو ممکن نہ تھا۔

۲۳ر جنوری ۱۹۴۳ء کو سر ہنری کریگ سیاسی مشیر حکومت ہند سے ملا۔ یہ بھی بہادر یار جنگ کے مضمون پر بہت برہم تھے۔ گفتگو کے بعد یہ طے پایا کہ کہ اعلیٰ حضرت خود بہادر یار جنگ کو بلا کر فہمائش فرمائیں اور سزا کے طور پر چھ ماہ کے واسطے وہ نظام پاس حاضر نہ ہوسکیں (جسے حیدرآباد کی زبان میں ڈیوڑھی بند ہونا کہتے ہیں) اور کسی جلسہ میں چھ ماہ تک کوئی تقریر نہ کریں۔ مجھ سے بہادر یار جنگ نے خود کہا کہ میرا آقا مجھ سے ناخوش نہیں ہے۔ یہ صورت حیدرآباد کے واسطے بہت دشواریاں پیدا کرتی تھی اور حکومت کی دشواریوں میں اضافہ ہو جاتا تھا۔

سر آرتھر لوتھین ریزیڈنٹ چاہتے تھے کہ شیر کے شکار کا انتظام کیا جائے۔ چنانچہ ورنگل کے جنگلات میں شکار کا انتظام ہوا۔ ہماری پارٹی میں

سر آرتھر لودین۔ لیڈی لودین اور مس لودین یہ چاہتی تھیں کہ انھیں بھی شیر ملے۔ میں نے محکمہ شکار کو تاکید کر دی تھی کہ شکار کامیاب ہو۔ ایک مچان پر تو میں اور لیڈی لودین بیٹھے۔ دوسرے پر ریزیڈنٹ اور تیسرے پر اُن کی بیٹی مس لودین تھیں۔ میرا اور لیڈی لودین کا ارادہ تو خود شکار کھیلنے کا نہ تھا۔ اس لئے گو شیر ہمارے قریب سے نکلا مگر میں نے بندوق نہیں چلائی۔ ریزیڈنٹ نے اُسے مار لیا۔

میں نے اس کا انتظام کیا تھا کہ مس لودین کے مچان کے برابر بہت اچھے شکاری بیٹھیں تاکہ اگر اُن سے بچ بھی جائے تب بھی شیر جانے نہ پائے۔ دو شیر نکلے ایک تو ریزیڈنٹ نے مارا اور دوسرا مس لودین نے۔ بندوق شکاری کی بھی چلی۔ بہرحال شیر مس لودین کا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ ان دونوں شیروں کو ایک مہینہ سے دو کٹے ہر تیسرے روز دئے جاتے تھے اور جب وہ حسب عادت تھوڑا کھا کر چھوڑ جاتا تھا تو اس میں تھوڑی افیون ملا دی جاتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ شیر اس جنگل سے باہر نہیں جاتے تھے اور شکار کے روز ہنکا ڈالنے پر بے تکلف مچان کے سامنے آ گئے۔

۷ مارچ ۱۹۴۳ء کو ہز ہائینس جام صاحب نوانگر حیدرآباد آئے۔ میرے یہاں ڈنر تھا۔ تقریر میں میرے لئے بڑے اچھے کلمات فرمائے۔ ڈنر کے طور پر جو گفتگو ہوئی اس سے معلوم ہوا کہ والیان ملک اپنے وزراء سے مطمئن نہ تھے۔

میں نے ۹ مارچ کو ایک مسودہ بہادر یار جنگ کو معافی نامہ کے سلسلہ میں بھیجا۔ انہیں فقط ایک فقرے پر اختلاف تھا۔ میں نے صغیر صاحب کو بھیج کر کہلوایا کہ وہ مسودہ پر دستخط کر دیں جیسے انہوں نے مان لیا۔ مگر یہ بھی صغیر صاحب سے کہا کہ اعلیٰ حضرت نے اُن سے یہ کہلا دیا ہے کہ جو اعلان نکلے گا انہیں دکھا لیا جائے گا۔ اس طرح کی دشواریاں حیدرآباد میں ہوتی

ہیں۔ جو انتظامی در و بست ہیں مخل اور حکومت کے وقار کو نقصان دہ ثابت ہوتی ہیں۔ بہرحال بہادر یار جنگ نے جو بیان لکھ کر بھیجا اس سے ریذیڈنٹ اور گرگسن کبھی مطمئن نہ تھے وہ چاہتے تھے کہ سختی کی جائے۔

سرکار نے جام صاحب کو جو پیغ دیا تھا اُس موقعہ پر گرگسن سے کچھ ایسی گفتگو کی کہ وہ یہ سمجھا کہ سرکار بہادر یار جنگ پر سختی کے موافق ہیں۔ گرگسن نے مجھ سے کہا کہ اعلیٰ حضرت سختی کے موافق ہیں سختی کرنی چاہیئے۔ میں خاموش ہو گیا۔ لیکن جب غلام محمد سے گرگسن نے کہا کہ تو غلام محمد نے کہا کہ تم ناسمجھ ہو ریاست کی چالوں کو پہچانتے نہیں ہو۔ میں عجیب کش مکش میں تھا۔ سرکار قلباً زیادہ سختی کے خلاف تھے۔ لیکن گرگسن سے یہ خیال ظاہر نہیں کیا میں اصلی حالت کہنا وفاداری کے خلاف سمجھتا تھا۔

۱۲ مارچ کو میں۔ گرگسن۔ علی یاور جنگ۔ اور اینڈرسن (انسپکٹر جنرل پولیس) سب ریذیڈنٹ سے ملے۔ وہ چاہتا تھا کہ جتنی سختی ممکن ہو بہادر یار جنگ پر کی جائے۔ میں نے کہا کہ آپ کیا چاہتے ہیں ریذیڈنٹ نے کہا کہ

(۱) بہادر یار جنگ کی ڈیوڑھی چھ ماہ کے واسطے بند کر دی جائے یعنی وہ نظام کے پاس حاضر نہ ہو سکیں۔

(۲) وہ چھ ماہ تک کوئی تقریر نہ کریں اور نہ کوئی مضمون لکھیں۔

(۳) انہیں اُن کی جاگیر میں محبوس کر دیا جائے۔

میں نے کہا کہ جاگیر میں محبوس کرنے پر شورش کا اندیشہ ہے۔ وہ بولے کہ میں تو اپنی ہدایات کے مطابق کہوں گا۔ اب آپ کو اختیار ہے۔

شام کو سرکار نے طلب فرمایا۔ میں نے ریذیڈنٹ کی گفتگو کا ذکر کیا نظام اس پر تیار ہیں کہ چھ ماہ کے واسطے بہادر یار جنگ کو حکم دیں کہ وہ کوئی تقریر نہ کریں لیکن یہ چاہتے ہیں کہ گو وہ خود بہادر یار جنگ کو نہیں بلائیں گے کونسل ایسی سفارش نہ کرے۔

۱۴ مارچ ۴۳ء آج مسٹر ولیم فلپ (جو کہ پریسیڈنٹ روزویلٹ کے ذاتی نمائندے کی حیثیت سے ہندوستان آئے ہیں) حیدرآباد تشریف لائے اور میرے پاس شاہ منزل میں ٹھہرے۔ اسٹیشن پر میں اور ریزیڈنٹ دونوں موجود تھے۔ میں نے ان کی ملاقات نظام سے طے کرلی۔ سرکار دریافت کرنے لگے کہ وہ مسٹر فلپ سے کیا گفتگو کریں۔ میں نے عرض کیا احتیاط برتیں اور برٹش گورنمنٹ کی برائی نہ کریں۔ میرے یہاں ایک بڑا ڈنر تھا جس میں ریزیڈنٹ اور بہت لوگ تھے۔ ریزیڈنٹ ڈنر کے بعد مسٹر فلپ کو لیکر الگ باتیں کرتے رہے۔

۱۵ مارچ ۴۳ء کو مسٹر فلپس کا لنچ ولیعہد کے یہاں تھا۔ میں بھی شریک تھا۔ شب کو میں نے ایک بہت بڑا ڈنر مسٹر فلپس کو دیا۔ مجھ سے دورانِ گفتگو میں مسٹر فلپ کہنے لگے کہ اس کی کیا وجہ کہ انڈسٹریز یہاں ترقی نہیں کر رہی ہیں۔ میں نے کہا کہ حیدرآباد ہی نہیں یہ تو سارے ملک کا حال ہے وہ کہنے لگے کہ میرا بھی یہی مطلب ہے اور وجہ ظاہر ہے۔ انگریز یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان (RAW MATERIAL) تیار کیا کرے اور انگریز مصنوعات (FINISHED GOODS.) بھیجا کریں۔ پھر کہا کہ اسی کو (EXPLOI-TATION.) کہتے ہیں۔

ان کی یہ رائے ہے کہ صوبوں کو اختیارات کامل ہوں مگر صوبجات خود مرکزی حکومت کو طاقتور بنائیں تاکہ ہندوستان کی وحدانیت قائم رہے اور یکجائی قوت خراب نہ ہو۔ یعنی فیڈریشن ہو۔

شام کو انہیں گولکنڈہ کا قلعہ دکھانے لے گئے اور گنبدوں میں جہاں شاہانِ سلف کے مزار ہیں جانے کا انتظام کیا تھا۔ میں نے غلام محمد مرحوم کو بھی چار پر بلا کر اُن سے ملایا۔ دورانِ گفتگو اُن کے بیان سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ ہندوستان کے مستقبل میں امریکن حکومت کو تجارت اور اقتصادیات میں بہت دخل ہوگا۔ تجارت سب اقوام کے واسطے

یکساں کھلی ہوگی اور اس طرح (.RAW MATERIAL یعنی کچا مال کے
خرید اور برآمد کا سب کو اختیار رہوگا۔ وہ مجھ سے یہ دریافت کرتے تھے
کہ آیا مسلمان ہمیشہ علیحدہ رہیں گے۔ میں نے کہا کہ میرے خیال میں علیحدگی
کا اختیار ملنے کے بعد دونوں مجبور ہوں گے کہ ملکر رہیں میری یہ رائے
غلط ثابت ہوئی۔ مجھے ۱۹۴۳ء میں اس کا ہی یقین نہ تھا کہ ہندوستان
کی تقسیم ہوگی ہندوستان کے کروڑوں مسلمان یہ سمجھتے تھے کہ نہ برٹش اس
پر راضی ہونگے اور نہ ہندو اسے تسلیم کریں گے یہ مطالبہ تو فقط حقوق
لینے کے واسطے تھا۔ بقول صابری کے۔

سمجھتے تھے رہے گی جنگ محدود گل و بلبل
مگر تقسیم نظم گلستاں تک بات جا پہونچی

حیدرآباد کے قیام کے زمانہ میں مجھ سے مسٹر فلپ نے یہ بھی کہا تھا
کہ پریسیڈنٹ روزویلٹ نے مسٹر چرچل کو لکھا کہ ہندوستان کو آزادی دینا
چاہیئے۔

۱۶ مارچ ۱۹۴۳ء زمانہ جس طرح بدل رہا تھا اُس کے آثار و نشانیاں
ظاہر ہو رہی تھیں ریزیڈنٹ حالانکہ لنچ پر اور ڈنر پر اُن سے مل چکے تھے
مگر اُن کی خواہش پر میں نے انہیں پھر لنچ پر بلالیا۔ چلتے وقت انہوں نے
فلپس سے یہ خواہش کی کہ وہ شام کی چاء ریزیڈنٹ کے یہاں نوش فرمائیں
مگر فلپس نے معذرت کرلی کہ اُسے فرصت نہیں ہے۔ یہ صاف علامت تھی
جو انقلاب کی نشاندہی کر رہی تھی۔ کبھی برٹش امپائر میں سورج غروب
نہ ہوتا تھا۔ اب وہ خود آفتاب لب بام ہوگئی تھی۔

شام کو میں مسٹر فلپس کو راجہ دھرم کرن اور کمال یار جنگ کے گھر
لے گیا۔ وہ امراء کے ان پرانے مکانوں کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے انہوں
نے کچھ ساڑیاں وغیرہ خریدی تھیں۔ میں نے اُن سے کہا کہ انہیں میری طرف

سے بطور تحفہ قبول فرمائیں۔ بہت اصرار کے بعد مانے۔

۱۷ مارچ ۳۷ء کو کچھ فوجی کرتب دیکھنے پریڈ کے میدان میں گیا۔ ریزیڈنٹ بھی آئے تھے۔ ایک شخص دو گھوڑوں پر بہ یک وقت سواری کر رہا تھا۔ ریزیڈنٹ کہنے لگے۔

"RESIDENT, THE PRESIDENT SHOULD ALSO LEARN TO RIDE ON TWO HORSES."

میں نے ہنسکر کہا۔

"HE DOES NOT RIDE ON TWO HORSES BUT HAS IN STATE TWO MASTERS.

RESIDENT "NO HE BRIDGES THE GULF BETWEEN THE TWO IF ANY"

اس خلیج پر پل بنا صدر اعظم حیدرآباد کا سب سے مشکل اور ناخوشگوار فرض تھا۔

۲۲ مارچ ۴۳ء کی شام کو سرکار کا ایک فرمان منسٹر پیشی کے خط کے ساتھ آیا۔ یہ بہادر یار جنگ کے متعلق تھا۔ میں اسے انہیں الفاظ میں نقل کرتا ہوں۔ تاکہ اُس زمانہ کی طرز تحریر اور عبارت کا اندازہ ہو سکے۔ یہ اعلیٰ حضرت کے الفاظ تھے۔ منسٹر کو دخل نہ تھا۔

"بخدمت شریف عالیجناب نواب سر محمد احمد سعید خاں۔ صدر اعظم باب حکومت"

"ایک فرمان مبارک کی نقل بھیجکر آپ کو تحریر کرنے کو سرکار کا جو حکم ہوا ہے۔ وہ حسب ذیل ہے":

کونسل کی عرضداشت مورخہ ۱۰ ربیع الاول ۱۳۶۵ھ کو میں نے غور سے دیکھا اور آج بالمشافہ نواب صاحب چھتاری سے بھی گفتگو تفصیل سے کی۔ چونکہ میری پوزیشن بحیثیت حکمراں ہونے کے۔ اپنی جماعت بڑی ذمہ داری رکھتی ہے۔ لہذا جو کچھ میرا فرمان

اس بارہ میں ہو (جو کہ طبع ہوگا) وہ میری پوزیشن اور DIGNITY کے مطابق ہو نہ کہ ایسا جس پر ممکن ہے کہ چوطرف سے نکتہ چینی شروع ہو جائے (اندرون و بیرون ملک) لہذا اس کو بچانا ضروری ہے۔ پس میں نے سب امور کی پیش نظر رکھتے ہوئے ایک جامع مسودہ تیار کیا ہے وہ سب امور پر حاوی ہے (جس کا تذکرہ عرضداشت میں ہے) پس اگر کونسل کو یہ منظور ہے کہ میں اپنے (PREROGATIVE) کو استعمال کرتے ہوئے فرمان جاری کروں تو میں بخوشی اس مسودہ کے مطابق فرمان جاری کرنیکو تیار ہوں ....

نقل فرمان

ممالک محروسہ سرکار عالی میں جتنی سیاسی انجمنیں ہیں۔ اس سے بحث نہیں کہ کسی قوم اور ملت کی ہیں۔ اُن کو حکم دیا جاتا ہے کہ دوران جنگ میں کسی قسم کی شر انگیز تقاریر نہ کریں۔ نہ مضامین لوکل اخبارات میں شائع ہوں تاکہ کسی قسم کا نقص امن یا ملک میں بے چینی پیدا نہ ہو۔ ورنہ اس کے خلاف عمل ہوگا تو گورنمنٹ خاطیوں کے ساتھ سخت تدارک کرنے پر آمادہ ہو جائیگی۔

ہاں۔ وہ بات اور ہے اگر کسی فریق کو اپنی جائز شکایات یا مطالبات کے متعلق لب کشائی کی نوبت آئے تو اس کو درست طریقہ پیرا ور آئینی طریقہ پر کہہ سکتا ہے۔ جبکہ یہ ہمہ قسم کی گرفت سے خالی ہو۔ اور اس صورت میں اس پر گورنمنٹ غور کر سکتی ہے۔ نظر بر آں دنیا کے اس مقولہ پر نظر رہے کہ صلح و آشتی سے بیگانے اپنے ہو جاتے ہیں۔ اور جنگ وجدال سے دوست۔ دشمن بنجاتے ہیں۔

بعض اوقات دیکھا گیا ہے کہ بہادر یار جنگ جب تقریر کرنے
اسٹیج پر کھڑے ہوتے ہیں تو اُن کی زبان قابو میں نہیں رہتی یعنی
حدود معینہ سے باہر ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے پیچیدگیاں
پیدا ہو جاتی ہیں۔ جو موجودہ سیاسی فضا کو مکدر بناتی ہیں۔ لہذا
اُن کو بھی چاہیئے کہ حزم و احتیاط سے کام کریں۔ ورنہ کسی وقت
ہلچل پیدا ہو جائے تو اس کی ذمہ داری مقرر پر ہو گی۔ اور میرا
بحیثیت حکمراں ہونے کے یہ فرض ہو گا کہ جو کوئی اس حکم کی
خلاف ورزی کرے اس کا سدِ باب کروں۔ نظر برائی میری
دانست میں یہی مناسب ہے کہ ایک سال تک بہادر یار جنگ
کسی قسم کی تقریر نہ کریں یا کسی قسم کا بیان اخبار میں شائع نہ کریں
تاکہ اپنے ہاتھوں نہ خود کو مشکلات میں ڈالیں اور نہ دوسری
طرف گورنمنٹ کو ان امور کی وجہ دردسری اٹھانی پڑے جیسا
کہ شیخ سعدی نے کہا ہے۔

مرد آخر بیں مبارک بندہ ایست

میرا یہ حکم پبلک کی اطلاع کی غرض سے جریدۂ غیر معمولی میں شائع کیا جائے۔"
اسی زمانہ میں غلام محمد صاحب مرحوم کا وہ بجٹ میری عرضداشت کے
ساتھ پیش ہوا جس میں انہوں نے انکم ٹیکس لگانے کی خواہش کی تھی جس کا پہلے
ذکر کر چکا ہوں۔ اور نظام نے منظور نہیں کیا۔ اسی سلسلہ میں ایک اور فرمان
صادر ہوا۔

جسکی نقل حسب ذیل ہے۔ بصیغۂ راز

بسلسلہ فرمان دیروز متعلق انکم ٹیکس اس قدر اور کہدینا ضروری
خیال کرتا ہوں کہ حال میں سالار جنگ نے دوران انٹرویو مجھ سے
کہا کہ طبقۂ امراء سمستان وغیرہ غور کر رہے ہیں کہ اگر بغیر ان کی بابت

کے خاص حالات پر نظر کیے (جس کی تمثیل برٹش انڈیا ہو یا کوئی
اور انڈین اسٹیٹ۔ ہو نہیں سکتی) اور وہ بھی ایسے حالات میں
اور دوسری طرف دوران جنگ ہے۔ ایسے موقع پر اگر جبراً
پھر اگر یہ نافذ کیا جائے گا تو سخت ایجی ٹیشن اس کے خلاف میں
پیدا ہوگا۔ اور متفقہ طور پر یہ مختلف گروہ رئیس کے یہاں درخواست
دینگے کہ رئیس اپنے (PREROGATIVE) کر کے ایسے امور
کا سدباب کرے کہ رئیس اپنی حد تک بڑی ذمہ داری رکھتا ہے
اپنے ملک میں امن و امان قائم رکھنے کی۔
اس پر میں نے اُن کو جواب دیا کہ کوئی کام میری گورنمنٹ ایسا نہ کریگی
جو فتنہ کا موجب ہوگا۔ لہذا اس طرف میں کونسل کو متوجہ کرنے والا ہوں۔
اس کے بعد کہا کہ فنانس ممبر کو اپنے (PROFESSION) کو اچھا
جانتے ہوں تاہم وہ یہاں کے حالات اور روایات سے واقف نہیں ہیں
لہذا جب سے وہ یہاں آئے ہیں ان کی ایسی تجاویز کی وجہ سے وہ تمام طبقوں
میں ہر دلعزیز نہیں رہے۔ بلکہ ان کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جا رہا ہے۔ بعض
طبقوں کا خیال ہے کہ معلوم نہیں ان کی دوران ملازمت میں کیا فتنے کھڑے
ہوں اور اگر ایسا ہوا تو ممکن ہے کہ ان کی حد تک مخالفت یہاں بڑھ جائے
یہ سُن کر میں نے کہا کہ ایسے امور میرے کان تک بھی میرے ذرائع سے
آئے۔ آخر میں کہا کہ بجز چند مستثنیات انقلاب عالم کی وجہ سے تمام ہی
خواہان سلطنت کی وفاداری مشتبہ ہوگئی ہے۔ ایسی حالت میں تدبّر کا اقتضا
یہی ہے کہ ان کو ایسے اندھا دھند امور سے اور نہ خراب کیا جائے بلکہ علی حالہٖ
قائم رکھنے کی ضرورت ہے کہ یہی طبقے ریاست کی (BACK BONE)
ہیں۔ یہ سنکر میں نے کہا کہ اُن کا کہنا ضرور قابل غور ہے"۔
اس فرمان سے قدرتاً غلام محمد صاحب مرحوم کو پریشانی ہوئی۔ میں نے

انہیں سمجھایا کہ آپ ایسی تجاویز پر کیوں اصرار کرتے ہیں کہ جن سے نہ رئیس ہی خوش ہو اور نہ عوام پسند کریں۔

انہیں دنوں مسز مہر خاں جو امریکن لیڈی تھیں میرے پاس آئیں اور مہر خاں کی جو کیبنٹ سکریٹری تھے شکایت کی۔ اس خانگی معاملہ میں صدر اعظم کیا کہہ سکتا تھا۔ لیکن میں نے انہیں بھی سمجھایا۔ اور مہر خاں کو بھی سمجھایا۔ اس وقت تو معاملہ رو بہ اصلاح ہو گیا تھا مگر سننے میں آیا کہ تین چار سال بعد علیحدگی ہو گئی۔ بین الاقوامی شادیوں کے نتائج اکثر ناخوشگوار ہوتے ہیں حسن ظاہر کی عارضی فریفتگی بہت جلد ختم ہو جاتی ہے۔ جو عمر بھر نباہتی ہے اور ہر اختلاف کو دبا دیتی ہے وہ خاندانی روایات ملکی اور قومی روایات اور یکساں خیالات اور نقطۂ نظر ہے۔ جب نقطۂ نظر مختلف ہوں خیالات میں تصادم ہو۔ تو پھر زندگی بدمزہ ہو جاتی ہے اور عمر بھر نباہنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

اسی زمانہ میں حضور نظام کچھ علیل ہو گئے۔ اور میں بجائے دفتر پیشی کے نذری باغ میں حاضر ہوا۔ مجھے یہ بھی اجازت دیدی گئی تھی کہ بغیر دستار بکلوس حاضر ہوں۔ حیدرآباد کے آداب کا یہ حصہ تھا کہ نظام کے سامنے جو کوئی جائے وہ دستار بکلوس لگائے۔ مہمان اس سے مستثنیٰ تھے۔ اور بغیر دستار بکلوس حاضر ہونے کی اجازت ایک طرح کا اعزاز خیال کیا جاتا تھا۔ میرا موٹر نہایت تک گیا۔ میرے ۱۶ جون سنہ ۴۳ء کے روزنامچے میں درج ہے۔

سرکار نے علالت مزاج کی وجہ سے نذری باغ میں یاد فرمایا۔ میں نے موٹر سے اترتے ہی دیکھا کہ تمام کمرے برآمدے اور تہنابیاں مختلف قسم کے سامان سے بھری پڑی ہیں۔ بکس۔ صندوق۔ لیٹنے۔ پوٹلے۔ جملہ اقسام کی چیزیں انہی کے ساتھ بوتلیں اور مرتبان رکھے ہوئے ہیں۔ ان پر گرد چڑھی ہوئی ہے۔ مکڑیوں کے جالے لگے ہوئے ہیں۔ کبوتروں کی بیٹ پڑی ہوئی ہے۔ خدا جانے کتنے عرصہ سے یہ چیزیں اپنی جگہ پر رکھی ہوئی ہیں آگے بڑھا تو ایک

بہت بڑا بکرا کھڑا ہوا ہنہنا رہا تھا۔ اس موقع پر اس کے شان نزول کی کوئی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی (بعد کو معلوم ہوا کہ اس بکرے کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی اس وجہ سے وہ بطور پنشن خوار یہاں رہتا ہے) یہ پہلا موقع تھا جو بغیر دستار بجلوس کے حاضر ہوا۔ چھوٹے برآمدے میں سرکار ایک کرسی پر بیٹھے تھے اور سامنے ایک کرسی گول سیٹ کی رکھی ہوئی تھی جس پر سلام کر کے میں بیٹھ گیا۔ میں نے آداب کے بعد امام ضامن پیش کیا۔ سرکار بہت کمزور نظر آتے تھے۔ فرمانے لگے کہ مجھے دست بھی آتے ہیں اور سوئخار بھی ہے۔

میں نے دیکھا کہ اس برآمدے میں بھی بہت سے مقفل سربمہر صندوق اور سربمہر زرد رنگ کی تھیلیاں رکھی ہیں۔ مجھے خیال آیا کہ جس طرح یہ سامان رکھا ہوا تھا۔ اس میں وقتاً فوقتاً چوری ہونے کا ضرور امکان تھا۔

۱۹ جون ۱۹۴۳ء میں نے نواب بہادر یار جنگ کو بلایا۔ علی یاور جنگ اور غلام محمد مرحوم بھی تھے۔ سر اکبر حیدری کے زمانہ میں ایک ایسا تحریری معاہدہ انہیں دیدیا گیا تھا کہ قانون ساز جماعت میں اکیاون فیصدی مسلمان نشست ہونگی۔ چونکہ ہندو صاحبان بجا طور پر اس تجویز کے خلاف تھے۔ کوئی مقننہ یا قانون ساز جماعت کی تشکیل نہیں ہوسکتی تھی۔ میں یہ چاہتا تھا کہ وہ اس معاہدہ کو واپس دیدیں اور کوئی دوسری تجویز مسلمانوں کے تحفظ کے لئے قبول کرلیں۔ غلام محمد مرحوم نے مجھ سے کہا کہ جو تجاویز اس معاہدہ کی بجائے ہم نے بتائی تھیں۔ اُن کے متعلق جو گفتگو میرے بعد غلام محمد اور بہادر یار جنگ سے ہوئی اس کا نتیجہ یہ تھا کہ کسی نئی تجویز کو اس معاہدے کی بجائے پسند نہیں کرتے۔ مسلمانوں کا اصرار درست نہ تھا گو اس انقلاب کے بعد اس پر بحث لاحاصل ہے۔ مسلمانوں نے ایسا نہ کیا ہوتا تو اس سے سیاسی اعتبار سے کیا فائدہ ہوتا۔ مگر اکثریت اور اقلیت کے آپس کے

تعلقات ضرور بہتر ہو جاتے۔

۲۴ر جون ۴۳ء آج صاحبزادے ذوالفقار جاہ کی پیدائش کے سلسلہ میں سرکار نے ایک لنچ بارہ بجے دیا۔ جس میں شرکت ہوئی۔ میں نے بچے کے واسطے کچھ چاندی کے برتن۔ کھلونے اور کپڑے بھیجے۔ جن کی مجموعی قیمت سترہ سو روپیہ تھی۔ اعلیٰ حضرت نے ایک بہت اچھا خط اپنی اور بیگم صاحبہ کی طرف سے شکریہ کا بھیجا۔

شام کو پھر حاضری کا موقعہ ملا۔ اعلیٰ حضرت نے فرمایا کہ یہ وائسرائے جا رہے ہیں ریاستوں کے مستقبل کے متعلق کوئی اعلان کریں گے۔ میں نے عرض کیا کہ تین چار روز ہوئے میں نے یاددہانی کا خط انہیں لکھا ہے۔ فرمانے لگے

DID YOU HAVE THE COURAGE TO REMIND THE VICEROY.

میں نے کہا کہ اس میں ہمت کا کوئی سوال نہیں ہے۔ شام کو میں چھتاری کے واسطے روانہ ہو گیا۔ اسی زمانہ میں حیدرآباد کے ایک اخبار میں یہ خبر شائع ہوئی کہ بعض جاگیردار دہلی میں ریاست حیدرآباد کے خلاف کچھ سازش کر رہے ہیں اور ایک جاگیردار کا نام K سے شروع ہوتا ہے۔ اعلیٰ حضرت نے بتایا کہ وہ جاگیردار جن کی طرف اخبار میں اشارہ ہے کمال یار جنگ مرحوم تھے۔ سرکار نے فرمایا کہ دہلی میں اس کے متعلق معلوم کروں اور ضرورت ہو تو اس کا مداوا کروں۔

میں یکم سے ۳ر جولائی تک دہلی رہا اور SIR KEINETH FITZ سے ملا جو سکریٹری پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ میں تھے۔ میں نے ان سے ذکر کیا کہ حیدرآباد کے ایک اخبار میں خبر شائع ہوئی ہے کہ بعض جاگیرداروں نے آپ سے ریاست کی شکایت کی ہے کہ چونکہ یہ جاگیریں مغلیہ سلطنت کے زمانہ میں انہیں ملی ہیں۔ ان کا تعلق بجائے نظام کے حکومت ہند سے ہو اس

کے جواب میں انہوں نے صاف صاف تو کچھ نہ کہا مگر ان کے طرز بیان سے میں نے نتیجہ نکالا کہ خبر بے اصل نہ تھی۔ میں نے اُن سے کہا کہ جاگیرداروں کا بیان غلط ہے۔ تاریخ سے یہ ظاہر ہے کہ جس زمانہ میں آصف جاہ اوّل نے حیدرآباد اپنا دارالسلطنت بنایا۔ مغلیہ سلطنت اتنی کمزور ہو گئی تھی کہ بادشاہ کی حکمرانی دہلی ہی تک محدود تھی۔ لہذا حیدرآباد میں اُن کا جاگیر دینے کا کیا سوال ہے۔ بعض اوقات اظہار وفاداری کے طور پر دہلی سے بھی حکم منگا لیا ہوگا۔ لیکن حقیقت میں حکومت آصف جاہ کی تھی سر کننتھ فلٹر نے کہا کہ انہیں جاگیرداروں سے کوئی دلچسپی نہیں سوائے چند ایسے جاگیرداروں کے کہ جن کی ضمانت برٹش گورنمنٹ نے کی ہے۔ گو الیار میں بعض ایسے جاگیردار تھے کہ جن کی جاگیر کی ضامن برٹش حکومت تھی۔

۵ جولائی ۱۹۴۳ء کو صبح حیدرآباد پہنچا۔ اور باغ عامہ میں اُسی وقت حاضر ہوا۔ وہاں عرب جو بے قاعدہ فوج کا ایک حصہ تھے حاضر ہو کر نظام کو سلامی دیتے تھے اور عربی زبان میں دعا دیتے تھے شب کو سرکار کی طرف سے بہت بڑا ڈنر ہوتا تھا۔ جس میں کھانے کے بعد نذریں دیجاتی تھیں پہلی نذر پانچ گنی کی میں نے پیش کی۔ اس کے بعد درجہ بدرجہ نذریں پیش ہوئیں عام طور پر ایک اشرفی اور سات روپیہ ہوتی تھی۔ اس روز صدر اعظم باب حکومت ایک عرضداشت بھی پیش کرتا تھا۔ اتفاق سے اس تاریخ کی عرضداشت کی نقل "صبح دکن" اخبار کے پرچہ میں تھی جسے بلفظہٖ نقل کرتا ہوں۔ تاکہ اُس زمانہ کے آداب اور طرز تحریر کا اندازہ ہو جواب ایک فسانہ ہے جو عنقریب نذر طاق نسیاں ہو جائیگا۔

بہ پیشگاہ بندگان اعلیٰ حضرت پیر و مرشد جہاں پناہ ظل سبحانی سلطان دکن مدظلہ العالی خلد اللہ ملکہٗ۔

بعد آستانہ بوسی۔ مودبانہ عرض ہے کہ

عالم پناہ۔

یوں تو بادشاہوں کی سالگرہ منانے کا رواج ہر قوم اور ہر ملک میں زمانۂ دراز سے چلا آ رہا ہے۔ جس کو رعایا برابر رسماً مناتی ہی رہتی ہے۔ مگر ایسا بادشاہ جس کے قلب صافی میں رعایا کی ہمدردی بھری ہو جس کے دل میں انسانیت کا درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہو جو انسان تو انسان حیوان کی مصیبت سے بھی متاثر ہوتا ہو جس کی علالت سے ملک بے چین ہو جاتا ہو جس کی سواری نہ نکلنے سے اس کی رعایا پریشان ہو جاتی ہو۔ اسکی سالگرہ حقیقت میں ایسی سالگرہ ہے جس پر اہل ملک جتنی بھی خوشیاں منائیں کم ہے۔ لہذا آج اہل ملک خلوص قلب سے دعائیں مانگ رہے ہیں کہ خدا ارض و سما ایسے مالک مجازی کو صد و سی سال سلامت با کرامت رکھے جس کے فیوض و برکات اہل ملک خصوصاً اور مسلمانان ہند عموماً مستفید ہوتے ہیں اور جس کی رہبری ان کے لئے ایک نعمت ہے۔

فدوی جاں نثار اس مبارک موقعہ پر اپنی۔ کونسل اور اہل ملک کی جانب سے بصد ادب ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کرنے کی عزت حاصل کرتا ہے اور دعا کرتا ہے کہ خدا حضرت پیر و مرشد اور شاہزادگان والاشان و شہزادیاں فرخندہ فال کو دیر گاہ سلامت رکھے اور وابستگان دولت کو اس طرح سالگرہ مبارک منانے کا موقعہ مدتوں ملتا رہے۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد۔ زیادہ حد ادب۔

معروضہ ادب یکم رجب المرجب ۱۳۶۲ھ

عرضی

فدوی جاں نثار

احمد سعید

۷ر جولائی ۱۹۴۳ء کو ہز ہائینس پرنس والاشان ہز ہائینس پرنس آف برار کی خدمت

میں حاضر ہوا۔ مجھے الگ لیجا کر فرمایا کہ اُن کی سول لسٹ میں اضافہ کر دیا جائے جہاں تک مجھے یاد ہے ان کی سول لسٹ پچیس ۲۵ ہزار روپیہ ماہوار تھی۔ میں نے عرض کیا کہ میں نے وزراء کی ایک سب کمیٹی اسی مسئلہ پر غور کرنے کے واسطے مقرر کی ہے وہ مجھے رپورٹ دیگی۔ لیکن خود پرنس کو بھی بعض چیزوں کی طرف توجہ کرنی چاہیئے مجھے دہلی میں ہز ہائینس جام صاحب سے یہ معلوم ہوا کہ آپ کی طرف سے بہت معمولی لوگ اس کام متعین ہیں کہ آپ کے واسطے قرضہ لائیں۔ اس سے بدنامی ہو رہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ میرے ایجنٹ نہیں ہیں۔ بلکہ چھوٹے پرنس کے ہیں اور وہ اپنے آپ کو پرنس آف حیدرآباد کہتے ہیں۔ پھر کچھ اور خانگی مسائل پر گفتگو کر کے چلا آیا۔

اسی روز بہادر یار جنگ مرحوم مجھ سے ملے۔ جو نمائندہ جماعت بنانے کے سلسلہ میں اُن سے کہا تھا کہ سر اکبر حیدری کے زمانہ کا دبا ہوا معاہدہ واپس کر دیں۔ اس پر انہوں نے کہا کہ علی یاور جنگ کی تجویز کو تو مسلمان ماننے کو تیار نہیں ہے مگر ایک اور میٹنگ کرونگا اور بجائے اس معاہدہ کے دوسری تجویز پیش کرونگا کہ اس پر غور دوبارہ کیا جائے۔ وہ تجویز یہ تھی کہ مسلمان (اکیاون) فیصدی کے معاہدہ کو واپس کر دیں مگر رائیوں میں اُنہیں مساوات دیدیجائے اور پھر مخلوط انتخاب ہو۔

پھر کہنے لگے کہ "اب تیسری بار مجھے پھر وزارت کا OFFER کیا گیا ہے کیا آپ سے اور سرکار سے ایسا ذکر آیا تھا۔ میں نے کہا کہ آپ کا نام لیکر تو میں نے ذکر نہیں کیا۔ لیکن یہ اکثر عرض کیا ہے کہ حیدرآباد کی گورنمنٹ اگر (RESPONSIBLE) نہ ہو تو (RESPONSIVE) تو ہو اور پبلک کے نمائندوں کو موقعہ ملنا چاہیئے کہ وہ حکومت میں حصّہ لے سکیں۔ بہادر یار جنگ مرحوم نے مجھے نام نہیں بتایا کہ انہیں وزارت کی دعوت کس نے دی۔ مگر جیسا کہ میں نے اُس زمانہ میں سُنا تھا غالباً غلام محمد صاحب مرحوم

نے اُن سے ایسی بات چیت کی۔ اس لئے کہ نظام تو ایسا نہیں کر سکتے تھے کہ بغیر میرے مشورہ کے کسی کو وزارت کی دعوت دیں۔ چونکہ حکومت ہند سے بھی دریافت کرنا ہوتا ہے اس واسطے صدر اعظم کا اتفاق کرنا ضروری تھا۔

میں چاہتا تھا کہ عوام کے قائدین اور لیڈر بھی شریک وزارت ہوں گو مستقبل کا چہرہ ہنوز بہت غبار آلودہ تھا مگر آنے والے تغیرات کی جھلکیاں نظر آتی تھیں۔ مگر جو کچھ ہوا وہ میرے وہم و گمان سے بھی زیادہ ہوا۔ مجھے ایسے انقلاب عظیم کا وہم و گمان بھی نہ تھا ہاں یہ یقین تھا کہ جب حیدرآباد کے چار طرف خود مختار جمہوری حکومتیں ہونگی تو حیدرآباد کے لوگ بھی صبر نہ کر سکیں گے۔

۸ر جولائی ۴۳ء کو سرکار میں حاضر ہوا۔ سال نو میں برٹش خطابات کے متعلق گفتگو رہی اینڈرسن (پولیس کا ہیڈ) کے C.I.E. سے سرکار کو اتفاق تھا۔ مہدی یار جنگ وزیر تعلیمات سے اتفاق تھا۔ مگر یزدانی مرحوم (ناظم آثار قدیمہ) کے K سے اتفاق نہ تھا۔ اور فرمایا کہ بڑے جاگیرداروں کو یہ خطاب نہ ملے اور ناظم آثار قدیمہ کو ملے۔ یہ ٹھیک نہ ہوگا۔ پھر میں نے اس خط کی کاپی جو میں نے لارڈ لنلتھگو کو لکھا تھا اور ان کا جواب پیش کیا اُن کے جواب سے تو خوش تھے مگر مجھ سے بار بار کہتے تھے کہ تم ولیسرائے کو مائی ڈیر لکھتے ہو۔ میں نے کہا جی ہاں۔ تو فرمایا کہ یہ حق تو ریاست کے پرنس کو دیا گیا ہے۔ میں نے کہا کہ میں تو اسی طرح لکھتا ہوں۔

۱۱ر جولائی ۴۳ء کو سرکار میں حاضری ہوئی۔ میں نے عرض کیا کہ چند جاگیرداریکیوں نہ سرکار میں ایک معروضہ داخل کریں کہ وہ حضور والا اور حضور کے بزرگوں کو اپنا محسن اور مربی تصور کرتے ہیں اور اخبارات میں بعض جاگیرداروں کے متعلق جو لکھا گیا ہے وہ اُسے پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ سرکار نے اسے پسند کیا اور فرمایا کہ راجہ دھرم کرن کے ذریعہ

سے یہ کام مناسب ہوگا۔

راجہ دھرم کرن ممبری کابینہ کے ایک ممبر تھے۔ نظام کے بڑے وفادار تھے یہ ان چند خاندانوں میں سے ایک خاندان تھا کہ جو دہلی سے آصف جاہ اوّل کے ساتھ آئے اور یہ اپنے آپ کو "آصف جاہی" کہتے تھے۔

پھر سر جگدیش پرشاد اور سر لواسنو کا ذکر آیا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین یہ بھی گفتگو آئی کہ اعلیٰ حضرت انہیں پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ انہیں انگریزوں کا طرفدار سمجھتے تھے۔ والیان ملک عام طور پر اور حضور نظام خاص طور پر انگریزی حکومت کی مداخلت کی وجہ سے حکومت ہند سے دل میں ناخوش رہتے تھے۔ انہیں یہ خیال تک نہیں آتا تھا کہ انگریزی حکومت ہی بحیثیت والیان ملک انکی قیام و بقا کی ضامن تھی۔ میں یہ چاہتا تھا کہ اعلیٰ حضرت ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم کا کوئی منصب مقرر کر دیں۔ جو بطور جاگیر نسلاً بعد نسلاً ملا کرے مگر نظام نے منظور نہیں کیا۔

۱۵ جولائی ۱۹۴۳ء کونسل کے بعد میں گرگسن سے جو پولیس اور جنرل ایڈ منسٹریشن کے صیغہ کا وزیر تھا۔ باتیں کرتا رہا۔ میرے روزنامچہ میں درج ہے اشفاق کے واسطے یہ طے ہو گیا کہ انہیں ڈپٹی سکریٹری ہوم ڈپارٹمنٹ کر دیا جائے۔ گو مجھے کام میں دقت ہو گی مگر اشفاق کو بہت اچھی جگہ مل جائے گی۔

اشفاق پولیس میں۔ ڈی۔ ایس۔ پی۔ تھے۔ یہ نواب فخر یار جنگ مرحوم کے بیٹے تھے جو میرے زمانہ سے پہلے وزیر مال حکومت حیدر آباد میں تھے میں نے انہیں بطور .A.D.C اپنے اسٹاف میں لیا تھا۔ یہ علی گڑھ کے تعلیم یافتہ تھے۔ نہایت ذی ہوش محنت کش اور وفاشعار شخصیت کے حامل تھے۔ مجھے ان سے حیدر آباد کے قیام میں بڑی مدد ملی ان کی یاد محبت اور تشکر کے ساتھ میرے دل میں ہمیشہ قایم رہیگی۔

پھر کچھ بہادر یار جنگ مرحوم کا ذکر آیا۔ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ مرحوم اُردو میں بہت اچھی تقریر کرتے تھے۔ روزنامچہ کی عبارت یہ ہے "میں نے گرگسن سے کہا کہ اگر اس وقت گورنمنٹ آف انڈیا نے یہ چاہا کہ انہیں پشاور جانے کی اجازت دی جائے تو کیا پوزیشن ہوگی۔ انہیں (بہادر یار جنگ) کو یہ کہنے کا موقعہ ہوگا کہ اپنی ضرورت کے واسطے تو مجھ سے تقریر کراتے ہیں اور ویسے پابندی لاحق کرتے ہیں۔ گرگسن نے کہا کہ اس میں جناح کی بھی ضرورت ہے کہ لیگ (الکشن) جیتے۔ تو میں نے کہا کہ وبسرائے کو بھی تو اس کی ضرورت ہے کہ اورنگ زیب خاں کی منسٹری جیتے اور آج آپ کو جناح کا اتنا خیال ہو گیا اور جب اُنہوں نے لیگ میں تقریر کرنے کو کہا" تو آپ خلاف تھے۔ میں متحیر رہ گیا جب آج نیم سرکاری سے مجھے معلوم ہوا کہ نظام نے خود بہادر یار جنگ سے وزارت کے متعلق کہا۔ مگر اُنہوں نے انکار کیا۔

میرے زمانہ قیام میں جہاں تک یاد ہے۔ تین بار اس کا موقعہ ملا۔ جب کبھی محل میں کوئی صاحبزادی یا صاحبزادہ پیدا ہوتا۔ میں ایک عرضداشت اور چند تحائف پیش کرتا اور نظام ایک ذاتی گرامی نامے سے مجھے سرفراز کرتے۔

۱۵ / جولائی ۱۹۴۳ء سرکار میں حاضر ہوا منجملہ اور باتوں کے میں نے اس کا بھی ذکر کیا کہ ریزیڈنٹ یہ دریافت کر رہا تھا کہ مہاراجہ کشن پرشاد کی جاگیر کا قصہ طے ہوا یا نہیں۔ مناسب ہوگا کہ اس پر جلد حکم صادر فرمایا جائے۔ چنانچہ خواجہ پرشاد کو وارث تسلیم کرنے کے متعلق دفتر پیشی نے مجھے اطلاع دی کہ رمضان یا شوال کے مہینہ میں فرمان جاری ہو جائیگا۔

مہاراجہ کشن پرشاد ایک اعلیٰ ترین شخصیت کے حامل تھے۔ حیدرآباد میں ایسی شخصیت دوسری نہ تھی۔ یہ ایک بڑے جاگیردار تھے۔ دوبار جہاں

تک مجھے یاد ہے صدر اعظم بھی رہے۔ ان کی فیاضی اور سخاوت مشہور تھی صوفی مزاج تھے۔ درویشوں کے بڑے معتقد تھے۔ اجمیر شریف اکثر حاضر ہوتے تھے۔ خلق اور انکسار کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ وہ ہر مذہب کا یکساں احترام کرتے تھے۔ اُن کی ہندو بیوی بھی تھیں اور ایک مسلمان بھی تھیں۔ جن کا نام غوثیہ بیگم تھا۔ اُن کے بچے ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ ان کے گھر میں دونوں مذاہب کے تہوار ہوتے تھے۔ ہولی، دیپاولی جنم اشٹمی جس اہتمام سے منائی جاتی تھیں اُسی اہتمام سے عید۔ بقرعید اور شب برات منائی جاتی تھی۔ آج کی زبان میں یہ صحیح معنوں میں سیکولر تھے۔

ان کی وراثت میں دشواری یہ تھی کہ ان کے بڑے بیٹے سب مسلمان تھے اور خواجہ پرشاد سب سے چھوٹے بیٹے ہندو تھے۔ لیکن یہ جاگیر ایک ہندو خاندان کی تھی۔ لہذا خواجہ پرشاد کو وارث جاگیر مانا گیا اور دوسرے بیٹوں کے حسب رواج جاگیر سے تنخواہیں مقرر ہوگئیں۔ ان بیٹوں میں ایک بیٹے اعلیٰ حضرت کے داماد بھی تھے۔

یکم اگست ۴۳ء کو ریزیڈنٹ فون کر کے خود میرے یہاں آگئے۔ اول تو مجھے مدعو کیا کہ میں اُس ڈنر میں شریک ہوں جو وہ شہزادی درشہوار کے لئے دینگے جس میں وہ اُنہیں قیصر ہند میڈل حکومت کی طرف سے دینگے یہ تمغہ سماجی خدمات کے واسطے دیا جاتا تھا۔

ان کی خواہش تھی کہ میں آرامود آئنگر۔ زین اور علی یاور جنگ کو وزارت میں لوں زین کے متعلق تو میں خود سرکار سے کہہ چکا تھا کہ سید عبدالعزیز کے بجائے انہیں لیا جائے۔ لیکن دوسرے حضرات کے متعلق میں نے کہا کہ غور کرونگا۔

۱۵ اگست ۴۳ء کو میں ریزیڈنٹ سے ملا۔ ایک بات مجھے بہت سبق آموز اور دلچسپ معلوم ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ شہزادی نیلوفر پرنس معظم جاہ

کی ترکی بیگم) اپنے کسی عزیز کو تیس پونڈ ماہوار حکومت ہند کے ذریعہ سے مصر بھجوانی تھیں جن کا نام پرنسس ھامی تھا۔ یہ غریب اپنا پیٹ کاٹ کر کسی اپنے مفلوک الحال غریب الدیار عزیز کو مصر سے ان تیس پونڈ میں سے پانچ پونڈ فرانس روانہ کردیتی ہیں۔ لہذا آئندہ حیدرآباد سے پچیس پونڈ ماہوار جایا کریں۔ میرے روزنامچہ میں یہ عبارت لکھی ہے۔

"یہ دو مثال اس ذہنیت کی تصویر پیش کرتی ہیں جو ایک ترک جیسی شریف قوم کی ذہنیت ہے اور جو ہماری گورنمنٹ کی ذہنیت ہے۔ ایک وہ شہزادی ہے کہ جو اپنی روٹی میں سے ٹکڑا توڑ کر اپنے کسی غریب عزیز کو بھیجتی ہے۔ اور ایک وہ حکومت ہے جو سزاً اتنا ٹکڑا کم کردیتی ہے۔ گویا مردود ہٹلر کی لڑائی کا مدار انہیں پانچ پونڈ پر ہے"۔

۱۹ ستمبر ۴۳ء کو ریزیڈنسی میں ڈنر تھا جس میں انہیں قیصر ہند سنہری تمغہ دیا گیا۔ مجھے افسوس ہے کہ روزنامچہ دو تہینہ نہیں لکھا جا سکا۔

اسی زمانہ میں مجھے اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ کوئی قابل اعتماد افسر خفیہ پولیس میں ایسا ہو کہ جو کسی پارٹی سے متعلق نہ ہو اور صحیح حالات حکومت کے سامنے پیش کرے۔ میں نے محمد مظہر صاحب ریٹائرڈ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کو اس ملازمت پر لیا۔ یہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے چھوٹے بھائی تھے۔ بڑے راست باز، متدین اور صاحب کردار شخص تھے حیدرآباد آنے کے کچھ روز بعد ہی بیمار ہو گئے۔ مگر جتنے روز بر سرکار رہے۔ مجھے مدد ملی اور مرحوم کی یاد تشکر کے ساتھ میرے دل میں موجود ہے۔

۱۷ نومبر ۴۳ء کو سرکار میں حاضر ہوا۔ گفتگو زیادہ تر پرنس مکرم جاہ کی تعلیم کے متعلق ہوتی رہی۔ سرکار نے کہا "کہ ریزیڈنٹ سے اور مجھ سے گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ ایک عمدہ انگریز گارجین اور ایک عمدہ گارجین ہندوستانی رہے۔ اور مکرم جاہ کو ان کے ماں باپ سے علیحدہ ایک مکان میں حیدرآباد

ہی میں بالفعل رکھا جائے۔ تو ریزیڈنٹ نے کہا کہ مجھے جملہ حالات پر غور کرنے کے بعد اس سے اتفاق ہے۔" پھر اعلیٰ حضرت نے یہ بھی ریزیڈنٹ سے کہا کہ آپ مجھے معاف فرمائیں۔ میں بحیثیت دوست کے آپ سے کہتا ہوں کہ مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب اور یہ دونوں کبھی ایک نہ ہو سکیں گے اسے سرکار بار بار فرماتے تھے۔ ملاقات ختم ہونے کے بعد جب میں سوار ہونے کو تھا تو کاظم یار جنگ نے مجھ سے کہا کہ سرکار نے ریزیڈنٹ کی گفتگو جو بیان کی ہے۔ اس میں "کچھ سچ ہے اور کچھ" میں اُن کا لفظ دہرانا نہیں چاہتا۔ جس کا منشاء تھا کہ کچھ حاشیہ تھا۔ بہر حال یہ ایک حیدرآباد کی بدقسمتی تھی۔

اسی زمانہ میں عثمانیہ یونیورسٹی کے لڑکوں سے ریل میں جھگڑا ہوا اور ریلوے پولیس جو برٹش حکومت کی تھی ایک فریق ہوگئی۔ جو لڑکا خاص پُرخطاوار تھا۔ اُسے لڑکوں نے گرفتار نہ ہونے دیا اور وہ مفرور ہوگیا۔ ریزیڈنٹ کو اس پر اصرار کہ خاطی لڑکا حاضر کیا جائے۔

۹ ارنومبر ۴۳ء کے روزنامچہ میں اس کا ذکر ہے۔ میں نے شاہ منزل میں میٹنگ کی۔ علی یاور جنگ سے لڑکوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ مفرور لڑکے کو حاضر کر دیں گے۔ مگر یہ وعدہ مرہون وفا نہ ہوا میں نے اس میٹنگ میں D.P.I. (ناظم تعلیمات) کو بھی بلایا تھا اس واسطے کہ اس شورش میں یونیورسٹی کے علاوہ بھی لڑکے شریک تھے۔ اس میٹنگ میں یہ طے ہوا کہ مفرور لڑکے کو گرفتار کرکے ریزیڈنٹ کے حوالہ کیا جائے۔ میں نے کہا کہ یونیورسٹی کونسل کے اتفاق کے بعد یہ حکم جاری ہو اور پانچ بجے یونیورسٹی کونسل کا جلسہ کیا جائے۔ میرا یہ خیال تھا کہ ہم یونیورسٹی سے سزا دلوائیں اور مفرور کو گرفتار کرکے ریزیڈنسی کی عدالت کے سپرد نہ کریں۔ غلام محمد مرحوم اور نواب علی یاور جنگ کو میری رائے سے اختلاف تھا۔ مگر غلام محمد مرحوم نے کہا کہ میں اوّل ریزیڈنٹ سے

مشورہ کرلوں۔ چنانچہ میں نے اُن سے مل کر اس پر راضی کرلیا کہ اگر ہم خود سزا دیدیں گے تو وہ مقدمہ واپس لے لیں گے۔ ریزیڈنسی سے واپس آکر یونیورسٹی کونسل کی میٹنگ میں یہ طے ہوا کہ مفرور لڑکے سے اپیل کی جائے کہ وہ خود حاضر ہو جائے۔ ورنہ یونیورسٹی اُسے سزا دیگی۔ اور اس واقعہ پر اظہار افسوس کیا۔ پی۔ وی۔ سی نے یہ تجویز پیش کی کہ اگر لڑکے واپس ہوں تو انہیں اس وقت تک نہ لیا جائے جب تک وہ فرداً فرداً معافی نہ مانگیں اور D.P.I بھی اسے پسند کر رہے تھے۔ سوائے بیگم زین یار جنگ مرحومہ کے کسی نے بھی یہ نہ کہا کہ یہ قابل عمل نہیں۔ مجھے اتفاق نہ تھا۔ D.P.I کا یہ خیال تھا کہ جتنے لڑکے ان کے اسکولوں سے متعلق اس شورش میں شریک ہیں انہیں رسٹی کیٹ کر دیا جائے۔ میں نے پوچھا کہ اُن کی کیا تعداد ہوگی۔ کہنے لگے آٹھ سو میں نے اس تجویز کو بھی مسترد کر دیا۔

۲۴ر نومبر ۴۳ء کی شب کو بہادر یار جنگ مرحوم میرے پاس آئے۔ مسٹر گرگسن بھی بیٹھے تھے۔ انہوں نے یہ کہا کہ اگر میں خود لڑکوں کو خطاب کروں تو وہ مفرور لڑکے کو حاضر کر دیں گے۔ میں نے کہا کہ اگر آپ کو یقین ہے کہ وہ میرے کہنے پر ملزم لڑکے کو حاضر کر دیں گے تو میں انہیں خطاب کرنے کو تیار ہوں۔ چنانچہ دوسرے روز ۲۵ر تاریخ کو میں نے لڑکوں کے سامنے تقریر کی اور ملزم لڑکے کو حاضر کر دیا گیا۔ میرے روزنامچہ میں یہ عبارت درج ہے "خدا کا شکر ہے اس وقت تو یہ معاملہ ختم ہوگیا"۔ لیکن میں نے اس کا احساس کیا کہ طلباء میں ڈسپلن کا فقدان تھا۔ ان نوعمر طلباء میں تہذیب نفس اور احساس فرق مراتب کی کمی تھی جو حیدرآباد کے مستقبل کے واسطے مضر ثابت ہوگی۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ اساتذہ کو بجائے محبت طلباء سے نفرت ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ گورنمنٹ انہیں سزا دے اور سخت سے سخت سزا دے۔

۴ر دسمبر ۴۳ء کو میں پھر ریزیڈنٹ سے ملا۔ نواب علی یاور جنگ بھی ساتھ

تھے۔ اور باتوں کے بعد یونیورسٹی کے لڑکے کا ذکر آیا۔ انہوں نے اس پر رضامندی دیدی کہ سکندر آباد کی عدالت میں اس لڑکے کو نیک چلنی کی ضمانت لیکر چھوڑ دے اور ہم ایک سال کے واسطے اسے یونیورسٹی سے نکالدیں۔ پھر وہ بہادر یار جنگ مرحوم کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ میں انکی صفائی کے متعلق کہتا رہا۔ ریزیڈنٹ نے کہا کہ وہ بہادر یار جنگ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ ایک روز میں انہیں اور بہادر یار جنگ کو چائے پر بلالوں گا۔

۵ دسمبر ۴۳ء کو میں پھر ریزیڈنٹ سے ملا اور یہ طے کرلیا کہ یونیورسٹی کے اس لڑکے سے جو ملزم تھا نیک چلنی کے مچلکہ بھی نہ لئے جائیں اور اسے یوں ہی چھوڑ دیا جائے۔ ریزیڈنٹ نے مجھ سے کاظم یار جنگ کی شکایت کی کہ وہ برٹش حکومت کے خلاف باتیں کرتے ہیں۔ میں ان کی صفائی میں کہتا رہا۔ ان سے معلوم ہوا کہ نواب ذوالقدر جنگ نے ان سے کہا۔

آج شب کو بیگم شاہ نواز کا ڈنر تھا۔ یہ میری مہمان تھیں میں نے ریزیڈنٹ کو بھی مدعو کیا تھا۔ ڈنر کے بعد کہنے لگے کہ کسی لیڈی کے سامنے یہ کہنا مشکل ہے کہ بہت سے کام ایسے ہیں کہ جنہیں عورتیں مثل مردوں کے نہیں کر سکتیں پھر کہنے لگے کہ بیگم شاہ نواز ان سے یہ کہہ رہی تھیں کہ ڈپلو میٹک کام عورتیں مردوں سے بہتر کرسکتی ہیں۔ آپ کی کیا رائے ہے میں نے کہا کہ ہاں یہ سچ ہے بشرطیکہ دوسری حکومت اپنی ڈپلومیٹک بلاز میں فقط مردوں ہی کو رکھے اور اگر دونوں طرف سے عورتیں ہی ہوئیں تو زلف پیچاں کی تمام پیچیدگیاں بین الاقوامی تعلقات میں اس طرح پیدا ہونگی کہ سلجھانا مشکل ہوجائے گا اس پر بہت دیر تک ہنستے رہے۔ بیگم شاہ نواز نہایت ذکی اور ذی ہوش خاتون ہیں۔ سر میاں محمد شفیع مرحوم کی صاحبزادی ہیں گول میز کانفرنس کی ممبر تھیں انگریزی اور اردو میں بہت

اچھی تقریر کرتی تھیں۔ پاکستان بننے کے بعد ملنا نہیں ہوا مجھ پر بہت کرم فرماتی تھیں۔ خدا انہیں ہمیشہ خوش رکھے۔

۱۲ر دسمبر ۴۳ء کو میں نے ریزیڈنٹ کو چاء پر بلایا اور بہادر یار جنگ مرحوم کو بھی مجھے نہیں معلوم کہ ان میں کیا گفتگو ہوئی۔ میں ٹینس کھیلتا رہا مگر بہادر یار جنگ بہت ممنون تھے اور کہنے لگے کہ جتنا رابطہ مقامی حضرات سے میں نے پیدا کیا اس سے قبل کبھی نہیں ہوا۔

بہادر یار جنگ مسلمانان حیدرآباد کے حقیقتاً لیڈر تھے اردو کی تقریر بہت پر اثر ہوتی تھی بہت معاملہ فہم اور دور اندیش تھے اگر ان کی یکایک موت نے حیدرآباد کو ان کی خدمات سے محروم نہ کیا ہوتا تو اتحاد المسلمین کو وہ ایسی غلط پالیسی اختیار نہ کرنے دیتے کہ جس کا انجام پولیس ایکشن ہوا ہے

۲۱ر دسمبر ۴۳ء کو مجھ سے ریزیڈنٹ نے کہا۔ کیا یہ سچ ہے کہ علی یاور جنگ کو وزیر بنانے کے لئے سر عقیل نے بیس ہزار دئے اور نواب ظہیر یار جنگ سے پچاس ہزار مانگے جا رہے ہیں۔ میں نے کہا۔ میرے خیال میں یہ خبر بے بنیاد ہیں۔

اسی روز اتفاق سے میں نے نواب ذوالقدر جنگ کو کھانے پر بلایا تھا۔ دوران گفتگو ان سے معلوم ہوا کہ انہوں نے ریزیڈنٹ سے کہا تھا کہ بیس ہزار علی یاور جنگ کی وزارت کے واسطے اور پچاس ہزار نواب ظہیر یار جنگ کی وزارت کے واسطے مطلوب ہیں۔ انہوں نے یہ بھی ریزیڈنٹ سے کہا کہ سرکار ریزیڈنٹ کو پسند نہیں کرتے۔ خدا رحم فرمائے ان لوگوں کی عجیب حالت ہے۔ سرکار کو متنبہ کرنا بھی دشوار۔ جو عرض کیا جائے وہ فوراً ظاہر ہو جاتا ہے اور فوراً مشتہر ہو جاتا ہے۔

۲۲ر دسمبر ۴۳ء کو مہاراجہ کپور تھلہ آئے۔ میں انہیں اسٹیشن پر لینے گیا۔ شاہ منزل میں میرے ہی پاس مقیم ہوئے شب کو میرے ساتھ ڈنر میں شریک

ہوئے۔ ۲۳ر دسمبر کو اعلیٰ حضرت نے کنگ کوٹھی میں لنچ دیا جس کے بعد فوٹو لیا گیا۔ لنچ کے بعد میں نے یہ عرض کیا کہ گرانی کی وجہ سے سرکار نے شاہزادگان کی سول لسٹ میں ڈھائی ہزار روپیہ ماہوار اضافہ پرنس اعظم جاہ اور معظم جاہ کے واسطے منظور فرما لیا تو اس موقع پر کیا ہی کچھ الاؤنس بسالت جاہ کے لئے بھی منظور فرمایا جائے یہ اعلیٰ حضرت کے سوتیلے بھائی ہیں مگر سرکار نے منظور نہیں کیا۔ سرکار کے فرمانے کا منشاء یہ تھا کہ بسالت جاہ کی ماہواری سول لسٹ کے سلسلہ میں حکومت ہند سے یہ طے ہو گیا ہے کہ رقم مقررہ سے زیادہ کے وہ مستحق نہیں ہیں جہاں تک مجھے یاد ہے انہیں پانچ ہزار روپیہ ماہوار ملتے تھے یہ غالباً نظام مرحوم میر محبوب علی خاں کے انتقال کے بعد ۱۹۱۱ء یا ۱۲ء میں حکومت ہند سے طے ہوا ہوگا مجھے افسوس ہوا۔ سوال حق کا نہ تھا یہ تو فراخدلی اور صلہ رحمی کا سوال تھا۔

مہاراجہ کپورتھلہ بڑی زبردست شخصیت کے حامل تھے وہ اردو اور انگریزی دونوں میں بہت اچھی تقریر کرتے تھے اور فرنچ تو بالکل اہل زبان کی طرح بولتے تھے۔ میں ایک بار کپورتھلہ ان کے پاس مقیم تھا۔ اپنے محل کی مجھے خود سیر کرا رہے تھے۔ ان کی ایک بیوی اندلیسی تھیں جن کی تصویر مجھے دکھائی تصویر پر مہاراج کے ہاتھ کا لکھا ہوا یہ شعر تھا۔

آفاقہا گردیدہ ام ۔ مہر بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام ۔ لیکن تو چیزے دیگری

میرے اوپر بہت کرم فرماتے تھے۔ ان کے صاحبزادے مہاراجکمار جیت سنگھ کو جب میں یو۔پی میں ہوم ممبر تھا حکومت کی کابینہ میں بحیثیت وزیر لینے میں مدد دی تھی مہاراج وسیع النظر تھے۔ کپورتھلہ میں ان کی بنائی ہوئی سنگ مرمر کی مسجد، گردوارہ اور مندر آج تک اس کے شاہد ہیں کہ وہ فرقہ وارانہ تنگ نظری سے متاثر نہ تھے۔ مہاراجہ شام کو مرغابی کے

شکار کے واسطے گئے ایک جھیل تھی جو بہت کم چوڑی تھی مگر لمبی ایک میل سے
زیادہ ہوگی۔ کنارے پر پیڑ تھا اس میں BLUE HEADED MALLARD
(نیل سر) مرغابیاں رہتی تھیں۔ میں اور مہاراج دو کشتیوں میں سوار تھے سامنے پیڑ سے
مرغابیاں اُڑتی تھیں اور فائر ہوتے تھے۔ بہت آسان اور پُر لطف شکار تھا۔

شب کو محل میں ڈنر ہوا جس میں مہاراج کا پورا خاندان شامل ہوا۔
میں اور مہاراج جب داخل ہوئے تو سب ایک حلقہ میں کھڑے ہو گئے فرداً
فرداً مہاراج نے ملایا جب میں مہاراج کنوار کرم جیت کے پاس پہونچا تو
اُن کی بیوی میرے پاؤں چھونے کو جھکیں میں نے اُن کے سر پر ہاتھ رکھا۔ مہاراج
کا تعجب رفع کرنے کے لئے میں نے بتایا کہ کمارانی میرے ہی خاندان کی
ہیں اور رشتہ کے اعتبار سے میں ان کا نانا ہوں۔

صاحبزادے بسالت جاہ حضور نظام کے سوتیلے بھائی ہیں۔ حیدرآباد
مرحوم کی مہمان نوازی۔ اخلاق اور سیر چشمی کے بہترین نمونہ ہیں۔ پولیس ایکشن
کے بعد حیدرآباد سے ترک سکونت کرکے بنگلور رہنے لگے ہیں۔

۲۳ر دسمبر سنہ ۴۳ء کو شام کی گاڑی سے چل کر ۲۵ر دسمبر کو چھتاری آیا اور
۲۶ر دسمبر کو نور نظر ابن سعید سلمہٗ کی بارات لیکر علی گڈھ گیا نظیر محمد خاں مرحوم
کی لڑکی صدیقہ سلمہا سے بخیر و خوبی شادی ہوئی۔ یہ لڑکی میری پھوپی کی بیٹی
کی بیٹی ہے۔ خدا کا شکر ہے ابن سعید سلمہٗ کے تین بچے ہیں۔ جاوید سعید۔
ہمایوں اور نجم۔ باری تعالیٰ ان سب کو خوش رکھے۔

میں عیسوی سال اور تاریخیں اپنے روزنامچہ سے لکھ رہا ہوں ورنہ حیدر
آباد میں تو جنتری کا وہ حساب اور مہینوں کے وہ نام سرکاری احکام اور
کاغذات میں لکھے جاتے تھے کہ جو کبھی ایران میں اسلام کا ستارہ چمکنے
سے پہلے رائج تھے۔ مہینوں کے نام بہمن۔ دے۔ اسفندیار وغیرہ تھے میں
نے چاہا تھا کہ عیسوی سن اور رومن مہینوں کو رائج کروں مگر نظام نے پسند

نہیں فرمایا لیکن اتنی اصلاح ہو گئی کہ ان مہینوں کی تاریخیں اور انگریزی مہینوں کی تاریخیں ایک کر دی گئیں یعنی پہلی جنوری کو ایرانی مہینے کی پہلی تاریخ ہو۔

یہ لکھ چکا ہوں کہ مہاراجہ کشن پرشاد کا جانشین اُن کے سب سے چھوٹے بیٹے خواجہ پرشاد کو نظام نے بنایا کیونکہ یہ جاگیر ایک ہندو خاندان کی تھی اور مہاراجہ کے سب سے بڑے بیٹے مسلمان تھے خواجہ پرشاد میرے پاس آئے بہت شکر گذار تھے میں نے کہا جائیے اور واپس آ کر اپنی جاگیر کا انتظام کیجئے۔ بمبئی کے اخبار میں کچھ ہی روز بعد یہ خبر شائع ہوئی کہ خواجہ پرشاد تاج ہوٹل میں مقیم تھے شب میں شاید اپنے کمرے کے دریچہ سے گرے اور انتقال ہو گیا۔ حیدرآباد سے فوراً آدمی بمبئی گئے مگر وہاں کی پولیس کو کچھ پتہ نہ چلا کہ وہ کیسے گرے۔ شبہ یہ کیا گیا کہ شاید نشہ کی حالت میں ایسا ہوا

۱۴ر جنوری ۱۹۴۴ء کو دہلی میں سر فرانسس وائلی سے ملا۔ خواجہ پرشاد کے بعد جاگیر کا کیا ہو اس پر گفتگو ہوئی۔ اس میں دشواری یہ تھی کہ مہاراج کشن پرشاد کا کوئی ہندو لڑکا نہ تھا۔ مجھے یاد ہے کہ آخر کار یہ جاگیر مہاراجہ کی بیٹی کے بیٹے کو دی گئی۔ میں وہی پرانی کہانی دہرا تا رہا جو نظام کی بڑی خواہش تھی کہ انگریز افسران کو ہٹایا جائے اور حیدرآباد کی خدمات کے سلسلہ میں انہیں کیا صلہ دیا جائے۔ مجھے سر فرانسس کی گفتگو سے یہ اندازہ ہوا کہ تسلی آمیز باتیں بہت مگر نتیجہ خیز کم۔ اس کا شکوہ کیا۔ یہ تو دنیا کا دستور ہے ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہیگا۔

۲۱ر جنوری ۱۹۴۴ء کو ریزیڈنٹ سے خواجہ پرشاد کے انتقال اور ان کے جانشین کے متعلق بات چیت ہوئی۔ اُن کا یہ خیال تھا کہ کسی ہندو کو ہونا چاہیے مجھے بھی اس سے اتفاق تھا کیونکہ یہ ہندو خاندان کی جاگیر تھی مگر ہو کون۔ مہاراجہ کی بیٹی کا بیٹا تھا اس پر نظر پڑتی تھی۔

۲ر فروری ۱۹۴۸ء کو ریزیڈنٹ نے مجھ سے کہا کہ بہادر یار جنگ اُن سے ملے اور دفتر پیشی کی بہت شکایت کی۔ کاظم یار جنگ کی شکایت حیدرآباد میں عام تھی مگر نظام کو اتنا بھروسہ اُن پر تھا کہ اُنہیں علیحدہ کرنے کو تیار نہ تھے۔ مجھے کئی بار ایسا اتفاق ہوا کہ نظام کسی تجویز کے خلاف تھے اور حکومت اُسے ضروری خیال کرتی تھی۔ میں نے کاظم یار جنگ کو بلایا کہا تو دو چار روز میں سرکار کا فرمان آگیا۔

ریزیڈنٹ بجا طور پر اس طرف توجہ دلاتے تھے کہ پبلک کے نمائندوں کو بھی گورنمنٹ میں جگہ دی جائے مگر سرکار اسے دل سے ناپسند کرتے تھے۔ والیان ملک عام طور پر اسے ناپسند کرتے تھے لیکن آج یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر تمام والیان ملک نے فیڈریشن میں شرکت کر لی ہوتی اور رائے عامہ کے نمائندوں کو شریک حکومت کر لیا ہوتا تو ممکن ہے کہ ان کی رعایا اس انقلاب میں اُن کی محافظ بنجاتی۔

ریزیڈنٹ آر اموداآئینگر کو چاہتے ہیں کہ میں گورنمنٹ میں لوں مجھے اتفاق ہے یہ ایک تجربہ کار وکیل ہیں۔ بہت ذی ہوش اور معتدل پالیسی کے حامی سرکار کو راضی کرنا ہوگا۔ میں نے ریزیڈنٹ سے کہا کہ مسلمانوں میں بہادر یار جنگ اس قابل ہیں کہ اُن کو گورنمنٹ میں جگہ دی جائے۔ اُنہوں نے کہا کہ اس میں جلدی نہ کی جائے وہ دہلی سے مشورہ کریں گے۔

۲ر فروری ۱۹۴۸ء کو ٹنڈا کے ہاں (جو نظام ریلوے کے جنرل منیجر تھے) ڈنر تھا میں اور ذرائع سے بھی سُن رہا تھا مگر آج گرگسن نے مجھ سے کہ غلام محمد نے بہادر یار جنگ سے کہا کہ وہ اُن کے واسطے وزارت کے تقرر کی کوشش کریں گے۔ گرگسن اس پر بہت برہم تھا کہ برٹش گورنمنٹ کے ملازم کو جسے عارضی طور پر ریاست کو دیا گیا ایسی مداخلت اور ایسے وعدے کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

۴ر فروری ۴۸ء کو سرکار میں حاضر ہوا۔ پبلک کے نمائندے حکومت میں لینے کے متعلق گفتگو رہی۔ نظام فرمانے لگے کہ اس سے پہلے ریزیڈنٹ کے زمانہ میں یہ طے ہو چکا ہے کہ ایسی تبدیلی جنگ کے بعد کی جائے پھر فرمایا کہ بہادر خاں کو ریزیڈنٹ نے کیوں بلایا مجھ سے تو کہا تھا کہ میں اُنہیں انٹرویو نہیں دے سکتا۔ میں نے کہا کہ بہادر خاں کی خواہش پر بلایا ہوگا۔ اسی روز دوپہر کو بہادر خاں (بہادر یار جنگ) مجھ سے ملنے آئے ریزیڈنٹ سے جو بات چیت ہوئی تھی اُس کا ذکر کرتے رہے۔ پھر مجھ سے کہا کہ سرکار نے مقصود علی خاں (سرکاری طبیب) کو اُن کے پاس بھیجا تھا وہ یہ پیام لائے تھے کہ ریزیڈنٹ بہادر یار جنگ سے ملنے کو تیار نہ تھے بہادر یار جنگ نے جو خط انٹرویو ریزیڈنسی سے آیا تھا وہ مقصود علی خاں کو دکھایا اور اس پر افسوس کرتے رہے کہ سرکار ایسی غلط بیانی سے کام لیتے ہیں "ممکن ہے کہ اُن کی بدگمانی صحیح نہ ہو" ریزیڈنٹ نے خود بلانے سے انکار کیا ہوگا۔ مگر بہادر یار جنگ کی خواہش پر ملاقات کی۔ باتوں میں اُن سے اس کی تصدیق ہو گئی کہ غلام محمد نے ان سے نہ صرف یہ کہا کہ وہ وزارت قبول کریں بلکہ یہ بھی کہا کہ فلاں فلاں صیغے اُنہیں دئے جائیں مجھے بہت افسوس ہوا۔ یہ بحیثیت صدر اعظم میرا حق تھا کہ میں اپنی کابینہ میں جسے مناسب سمجھوں لوں۔ غلام محمد صاحب میرے لائے ہوئے تھے مجھے اُن سے یہ توقع نہ تھی کہ بغیر میرے علم و اطلاع کے وہ یہاں کے کسی لیڈر سے سازباز کریں گے بہرحال یہ ایک پرانی کہانی ہے۔ آج اور خاصکر اُس آخری ملاقات کے بعد جو اُن کی علالت کے زمانہ میں پاکستان میں ہوئی۔ میرا دل علی گڑھ کے ایک بھائی کی محبت کی یاد سے پُر ہے اور اس کی جدائی کا صدمہ ہے

۵ر فروری ۴۸ء کو گرگسن آئے سب سے پہلے تو انہوں نے مجھ سے یہ کہا کہ غلام محمد کی اس میں کیا مصلحت ہے کہ وہ بہادر خاں کو بڑھانا چاہتے

ہیں۔ میں خاموش ہو گیا۔ پھر انہوں نے (ممکن ہے ریزیڈنٹ کے اشارہ پر) مجھ سے پوچھا کہ ستمبر میں میرے تین سال ختم ہوتے ہیں اس کے بعد میں حیدرآباد رہوں گا یا نہیں۔ میں نے کہا میں خود اس کا خواہشمند نہیں ہوں لیکن اگر حکومت ہند چاہے گی تو مجھے انکار نہیں اور اگر وہ کسی دوسرے کا بھیجنا مناسب خیال کریں تو مجھے اصرار نہیں۔ حیدرآباد کے حضرات اور ریزیڈنٹ دونوں یہ چاہتے تھے کہ سر عقیل اور سر مہدی یار جنگ مرحومین کو ریٹائر کر دیا جائے۔ چنانچہ ریزیڈنٹ اور بہادر یار جنگ نے مجھ سے بھی کہا اور ریزیڈنٹ نے نظام سے بھی کہا یہ خواہش اس وجہ سے نہ تھی کہ دونوں حضرات کے کردار پر شبہ تھا فقط پیرانہ سالی کی وجہ سے یہ خیال ذہنوں میں تھا اور میں خود اس تجویز کا دل سے طرفدار تھا سرکار اس تجویز سے اس لئے گھبراتے تھے کہ سر عقیل مرحوم سب سے پرانے وزیر تھے اسی لئے میری غیر موجودگی میں وہ بحیثیت وائس پریذیڈنٹ کام کرتے تھے۔ اگر وہ ریٹائر ہوں تو سینیئر ممبر انگریز ہوتا تھا اور میری عدم موجودگی میں وہ پریسیڈنٹ ہوتا۔ میں نے یہ رائے دی کہ سرکار سر عقیل جنگ مرحوم کو مستقل وائس پریسیڈنٹ کر دیں اور وہ فقط پائیگاہوں کے انچارج ہوں گورنمنٹ کا کوئی صیغہ اُن کے پاس نہ ہو جب میں چاہوں انہیں وزراء کی کونسل میں بلا لوں اور میری غیر موجودگی میں صدارت کریں سرکار نے اسے پسند کیا۔

۲۳ فروری ۴۷ء کو اوّل نو ریزیڈنٹ سے خطابات پر گفتگو ہوئی وہ گرگسن کو C. I. E اور رائیڈرسن (انسپکٹر جنرل پولیس) کو C. B. E دینا چاہتے تھے میں نے اشفاق اور سی۔ پی۔ تارا پور والا کے نام خان بہادری کے لئے دئے۔ نظام کے اختیارات سے قیود ہٹانے کا سوال زیر بحث رہا مسٹر کنھر لودین کا یہ خیال تھا کہ حکومت ہند اس پر راضی ہو جائے گی کہ سوائے

انگریز ممبر کے تقرر کے۔ ہندوستانی وزراء کے تقرر میں برٹش گورنمنٹ دخل نہ دے۔ اور وزراء کا تقرر قطعاً صدر اعظم کے ہاتھ میں ہو اور پیشی کے سکریٹری کا بھی انتخاب صدر اعظم ہی کے ہاتھ میں ہو۔

یہ تجویز اصولاً غلط نہ تھی۔ ہر گورنمنٹ میں ممبران کا بحیثیت منسٹر یا پرائم منسٹر مقرر کرتا ہے گورنر کو اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا اسی طرح بادشاہ یا پریسیڈنٹ کو وزراء کے تقرر میں مداخلت نہیں ہوتی لیکن میری دشواری یہ تھی کہ ایسی شکل میں قدرتاً نظام کو یہ یقین ہو جاتا کہ میں نے بجائے اُن کے اختیارات پر سے قیود ہٹانے کے اس کی کوشش کی کہ جملہ اختیارات میرے ہاتھ میں آجائیں اور جو کچھ اس سلسلے میں کہتا رہا وہ دھوکا تھا اسے میرے ضمیر نے گوارہ نہ کیا اور میں نے یہ کہکر ٹالا کہ اس وقت تو یہ بتایئے کہ جنگی خدمات کے صلہ میں نظام کو کیا خطاب دیا جائے۔ اس موقعہ پر ان قیود کو ہٹا لینا ہی مناسب ہوگا۔ مجھ سے کہنے لگے کہ آپ بتائیں کہ اُنہیں کیا خطاب دیا جائے۔ میں نے کہا کہ نظام ہز مجسٹی کا خطاب چاہتے ہیں ریزیڈنٹ نے کہا کہ یہ ناممکن ہے اس میں بادشاہ سے برابری ہوگی میں نے کہا کہ ہندوستان کے تو وہ شہنشاہ ہیں اور شہنشاہ کے ماتحت بادشاہ ہونے ضروری ہیں۔ مگر اُن کا خیال تھا کہ اس میں کامیابی کی اُمید نہیں میں نے کہا کہ اُنہیں شاہ دکن یا حیدرآباد کہا جائے انہوں نے کہا کہ یہ ممکن ہے مگر ہز مجسٹی نہیں ہوگا کوئی اور مثلاً HIS SYRIAN HIGHNESS وغیرہ ہوگا مگر ہوا یہ کہ جنگ کے ختم ہونے پر سرکار کو CHAIN OF VICTORIA CROSS دی گئی۔ انگلستان میں یہ بھی بڑا اعزاز ہے کہ اکثر خود مختار بادشاہوں کو دیا جاتا ہے مگر حضور نظام کو اس کی مسرت نہیں ہوئی اور مجھے بھی اس سے خاص خوشی نہیں ہوئی۔

۷ ربارچ ۱۹۲۸ء سر کلاڈ آکن لیک جو کمانڈر ان چیف تھے۔ میرے مہمان

تھے۔ میں نے سرکار سے عرض کیا کہ انہیں چار پر بلالیں۔ بہت پس و پیش کے بعد مان لیا لیکن سرکار اتنے مشکوک المزاج تھے کہ فرمانے لگے کہ مجھ سے کیوں ملنے آرہا ہے۔ میں کیا کہتا کہ برٹش حکومت کا کمانڈران چیف حیدرآباد آئے تو اُسے نظام سے ضرور ملنا چاہئے اور سرکار بھی کھانے یا چائے پر مدعو کرنا چاہیئے۔

پھر رشید نواز جنگ کا ذکر کیا۔ اُن کا قصہ یہ تھا کہ رشید نواز جنگ سرکار کے داماد تھے۔ سلطان الملک امیر پائیگاہ کا انتقال ہو گیا۔ رشید نواز جنگ اُن کے پوتے تھے۔ تعلیم تربیت کے لحاظ سے اپنے خاندان میں ممتاز تھے۔ سرکار چاہتے تھے کہ امیر پائیگاہ انہیں بنایا جائے۔ سلطان الملک مرحوم کے بڑے بیٹے ابوالفتح خاں زندہ تھے وہ کہتے تھے کہ اسلامی قانون کے مطابق بیٹے کے ہوتے ہوئے پوتا محروم ہے۔ جاگیروں کی وراثت میں اسلامی قانون کی پابندی نہ تھی بلکہ رواج یہ تھا کہ نظام اُسی خاندان میں سے جسے چاہیں امیر پائیگاہ تسلیم کریں تصوّر یہ تھا کہ نظام نے دوبارہ عطیہ دیا۔ ابوالفتح خاں کا وکیل اسلامی قانون پر استدلال کر رہا تھا۔ میں نے کہا قانون شریعت اگر نافذ کیا جائے تو پورا نافذ کیا جائے یعنی امیر پائیگاہ مرحوم کے جتنے بیٹے و بیٹیاں اور بیویاں ہیں سب کو وراثت قانون شریعت کے مطابق ملے گی۔ تنہا ابوالفتح خاں کو کیسے ملے گی۔ چنانچہ رشید نواز جنگ کے متعلق سفارش کی گئی جس سے سرکار مطمئن ہو گئے۔ پھر سرکار نے فرمایا کہ سالگرہ کے موقعہ پر بہادر جنگ کی جاگیر واپس کر دی جائے ریزیڈنٹ سے کہنا کہ میری بھی یہی رائے ہے۔ میں نے کہا کہ سرکار کی پوزیشن بالکل صاف ہے سرکار نے جو کچھ کیا اپنے صدراعظم کے مشورہ کے بعد کیا۔ سرکار مطمئن ہو گئے۔

۱۶ مارچ ۴۷ئہ کو میں ریزیڈنٹ سے ملا۔ رشید نواز جنگ کا

امیر پائیگاہ بنانا اور بہادر جنگ کی واپسی جاگیر کے متعلق گفتگو کی۔ بعدہٗ کمانڈران چیف کے حیدرآباد آنے کا ذکر آیا۔ ریزیڈنٹ نے کہا کہ میں بصیغۂ راز تم سے کہتا ہوں کہ C. in C. اور پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ میں یہ جھگڑا ہے کہ C. in C. جس ریاست میں چاہتے ہیں جاتے ہیں اور جہاں چاہتے ہیں قیام کرتے ہیں پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ سے مشورہ نہیں کرتے آخر میں کہنے لگے۔ دہلی تو چاہتی ہے کہ تم یہاں رہو اور اگر تم اس پر تیار نہیں ہو تو وہ وہاں (EMPLOY) کریں۔ تمہاری کیا رائے ہے۔ میں نے وہی جواب دیا جو گرگسن سے ایک دو روز قبل کہہ چکا تھا جس کا منشا یہ تھا کہ مجھے کوئی دلچسپی نہیں جہاں میری خدمات مناسب ہوں حکومت ہند خود تجویز کرے۔ چونکہ میرا تقرر تین سال کے لئے ہوا تھا اور اگست میں تین سال ختم ہوتے تھے تو دہلی اس پر غور کر رہی تھی کہ آئندہ صدر اعظم حیدرآباد میں کون ہو۔ حیدرآباد میں صالح حیدری مرحوم کا نام لیا جا رہا تھا۔ اخبارات میں مختلف خبریں آ رہی تھیں۔

۲۴ مارچ ۴۴ء کے اخبار نظام گزٹ میں نظام کا ایک فرمان شائع ہوا جس میں میری خدمات صدارت کو "پسندیدہ اور قابل قدر" الفاظ سے تعبیر کر کے یہ کہا گیا تھا کہ میرا تقرر تین سال کے واسطے نہیں بلکہ پانچ سال کے واسطے ہوا تھا جس میں ڈھائی سال باقی ہیں اور عوام کو متنبہ کیا تھا کہ جب تک نذری باغ (دفتر پیشی) یا باب حکومت سے کوئی خبر مصدقہ نہ ہو یقین نہ کریں۔ یہ فرمان یکایک آیا۔ بہرحال میں نے عرض داشت کے ذریعہ اظہار تشکر کیا اور سرکار کے حکم سے میری عرض داشت معہ سرکار کے فارسی نوٹ کے۔ ۲۲ مارچ ۴۴ء کے روز صبح دکن اخبار میں شائع کر دی گئی جو حسب ذیل ہے۔

بہ پیشگاہ بندگان اعلیٰ حضرت پیر و مرشد جہاں پناہ ظل سبحانی
سلطان دکن مدظلہ العالی خلد اللہ ملکہٗ۔
بعد آستانی بوسی مؤدبانہ عرض ہے
شاہا

فدوی جاں نثار کی نظر سے آج کا نظام گزٹ گذرا۔ اس میں جس غلط افواہ کی صحت فرمائی گئی ہے اور جاں نثار کی ناچیز خدمات کے متعلق "پسندیدہ اور قابل قدر" کے جو الفاظ استعمال فرمائے گئے ہیں وہ اس جاں نثار کے لئے ہمیشہ فخر و مباہات کا باعث رہیں گے۔ خدا اس جاں نثار کو اس کی توفیق عطا فرمائے کہ وہ اپنے مالک مجازی کا اعتماد آئندہ اس سے زیادہ حاصل کر سکے اور ملک کی ایسی خدمت انجام دے سکے جس سے اہل ملک کو طمانیت حاصل ہو اور جاں نثار کا بھی ضمیر مطمئن ہو سکے۔

ایسی غلط افواہیں صحافت کی کامیابی کا راز ہوا کرتی ہیں وہ اس قسم کے شوشے چھوڑ کر اس کا اندازہ کرتے ہیں کہ اس واقعہ کی کہاں تک حقیقت ہے یہ ہی غالباً اس افواہ کا منشا تھا جس کو حضرت حکیم السیاست کی دور رس نظر نے فوراً تاڑ لیا اور صرف اس کی تردید ہی نہیں فرمائی بلکہ دنیا پر یہ ثابت فرما دیا کہ ذات ہمایونی اپنے خادموں کی خدمت کی تنہا قدر ہی نہیں بلکہ دنیا پر اس کی شخصیت کو اور اجاگر کر دیتی ہے سوائے اس کے یہ فدوی جاں نثار اور کیا عرض کرے کہ

نازندہ ام۔ بندہ ام

الٰہی آفتاب عمر و دولت و اقبال تاباں و درخشاں باد

معروضہ ۵ ربیع الاول شریف ۱۳۶۲ھ

عرضی فدوی جاں نثار

احمد سعید

سرکار کا نوٹ
ما این تحریر را کہ از قلم یک صاحب کردار و ذی عزت آمدہ۔
و ہم در زمانۂ گذشتہ در برٹش انڈیا بہ خدمات جلیلہ فائز بود
بہ نظر استحسان بینیم۔

۲۶ مارچ ۴۴ء آج سہ پہر کو اعلیٰ حضرت اور پرنس آف برار نے شاہ منزل تشریف لاکر میری عزت افزائی فرمائی۔ ابن سعید خاں کی شادی کی مبارکباد کے سلسلہ میں تشریف آوری ہوئی۔ ہوشں یار جنگ۔ زین یار جنگ اور شہید یار جنگ بھی حاضر تھے میں نے اور ابن سعید خاں نے نذریں پیش کیں۔ چائے نوشی۔ گلپوشی اور پان و عطر حیدرآباد کے رواج کے مطابق پیش کئے گئے۔

۱۲ اپریل ۴۴ء کو میں چھتاری ہوتا ہوا حیدرآباد سے دہلی پہونچا۔
۱۹ اپریل کو سر فرانسس وائلی سے ملاقات ہوئی۔ میں نے اُن سے ریزیڈنٹ کی بیوی لیڈی لوتھین کے متعلق کہا کہ انہیں قیصر ہند میڈل جنگی خدمات کے سلسلہ میں ملنا چاہئے۔ اُنہوں نے کہا کہ جون کے مہینہ میں بادشاہ کی سالگرہ پر اُمید ہے کہ مل جائے گا۔ پھر خلاف مزاج بہت کھل کر باتیں کرنے لگے۔ کہنے لگے کہ سر آرتھر اپنی بیوی کو بہت ڈانٹتے ہیں۔ پھر کہا میں تم سے کوئی راز نہیں رکھتا۔ لیکن باوجود ان کی (سر آرتھر لوتھین) قابلیت کے میں اُنہیں پسند نہیں کرتا۔ پھر انکم ٹیکس جو برٹش انڈیا میں رائج تھا۔ اُس سے ملازمان حکومت کو جو دشواریاں تھیں اُس کا ذکر کیا۔ میں نے کہا کہ یہ کچھ نامناسب نہ ہوگا اگر میں کل وائسرائے سے اس کا ذکر کردوں۔ اُنہوں نے کہا کہ بالکل مناسب ہوگا آپ کو بحیثیت EX. GOVERNOR کے یہ حق ہے کہ آپ گورنمنٹ کی پالیسی پر تنقید کریں۔ پھر پرنس مکرم جاہ کے ڈون اسکول میں بحیثیت بورڈر جانے کی بات چیت ہوئی۔ میں نے کہا کہ سرکار کو وائسرائے لکھیں۔ پھر برار کی واپسی وغیرہ کی گفتگو رہی۔

۲۰ / اپریل ۴۶ء میں آج ویسرائے سے ملا۔ دہلی میں یہ عام خیال تھا کہ لارڈ ویول کی اپنی کوئی رائے نہیں ہے وہ بالکل اپنے مشیروں کے ہاتھ میں ہیں۔ آج کی ملاقات میں مجھے یقین ہو گیا کہ یہ سچ ہے سوائے اس کے کہ پرنس مکرم جاہ کے متعلق تو انہوں نے کہا کہ اچھا ہو کہ وہ بورڈنگ میں رہیں باقی تمام باتوں پر مثلاً انکم ٹیکس اور انفلیشن (کثرت زر) کا اثر ملازمان سرکار پر۔ ریاستوں کا مستقبل اور معاہدوں کے تحت مستقبل میں حفاظت۔ ایسی چیزوں پر وہ نوٹ لکھتے رہے مگر زبان سے کچھ نہ کہا مجھے اُن سے بارہا ملنے کا موقعہ ہوا۔ میرے خیال میں وہ ایک زبردست جنرل تھے وہ سیدھی اور صاف باتیں پسند کرتے تھے۔ سیاسی جوڑ توڑ اور پیچیدہ باتیں۔ کجا ے نمائی۔ کجا می زنی انہیں پسند نہ تھی۔ مجھے یاد ہے اور اس زمانہ کے تذکرہ نویسوں نے اسے لکھا ہے کہ وہ مہاتما گاندھی جی۔ مسٹر جناح اور دوسرے سیاسی لیڈروں سے یہ کہتے تھے کہ وہ ایک سپاہی تھے اور سیاسی پیچ و خم اُن کی سمجھ میں نہیں آتے۔

اُسی زمانہ میں کاظم یار جنگ میرے پاس آئے اور کہا کہ سرکار نے ایک خط ریزیڈنٹ کو لکھا ہے کہ عبداللہ خاں کسمنڈی جن کا گذشتہ زمانہ میں حیدرآباد سے اخراج کیا گیا تھا۔ انہیں اور ظفر علی خاں کو پھر آنے کی اجازت ہو۔ اُن کا یہ خیال تھا کہ اسے روکا جائے میرے پاس ریزیڈنسی سے سرکار کے خط کی نقل اور جو ریزیڈنٹ نے جواب دیا وہ پہلے ہی آچکا تھا۔ میں خاموش ہو گیا۔ عبداللہ خاں کسمنڈی نے مجھے بھی ایک خط لکھا تھا جس کی نقل سرکار کو بھی بھیجی تھی۔ میں نے اس کا ایک مختصر جواب دیدیا۔

۱۲ / جون ۴۶ء کو میں اوٹی پہاڑ پر گیا۔ ریزیڈنٹ کے پاس مقیم

تھا۔ مجھے یہ پہاڑ بہت پسند آیا۔ موٹر آسانی سے ہر جگہ جا سکتی ہے۔ ریزیڈنٹ سے حسب ذیل گفتگو رہی۔ اس زمانہ میں ریلوے پر جنگ کی وجہ سے اتنا کام تھا کہ گورنمنٹ نے سیلون چلانا بند کر دیا تھا۔ میں نے کہا کہ پرنس آف برار، معظم جاہ۔ بسالت جاہ۔ اور مجھے اس حکم سے مستثنیٰ کیا جائے۔ برٹش گورنمنٹ نے منظور کر لیا۔ پھر عبداللہ خاں کمنڈی کا ذکر آیا! انہوں نے مجھے اُن کا فائل دکھایا جس سے مجھے یقین ہو گیا کہ سرکار نے اُن کے متعلق ریزیڈنٹ کو خط لکھنے میں غلطی کی۔

پھر RAILWAY JURISDICTION اور سکندرآباد کی واپسی کا ذکر آیا۔ میں اسے بعجلت چاہتا تھا۔ پھر انگریز افسران کے بجائے ہندوستانیوں کو مقرر کرنے پر میں نے اصرار کیا اور اس پر بہت طویل گفتگو رہی ریزیڈنٹ نے کہا نواب صاحب میرے علم میں ہے کہ ایک مرتبہ نواب ولی الدولہ اور سر اکبر آنکھوں میں آنسو بھرے آئے اور اس پر زور دیا کہ یہاں کام بغیر انگریز افسروں کے نہیں چلے گا۔ بہر نوع مجھے امید ہے کہ DIRECTOR OF REVENUE آئندہ کوئی ہندوستانی ہو سکے گا۔

۲۶ جون ۱۹۴۴ء ۲۵ جون کو میرے یہاں مسٹر راما مورتی کا ڈنر تھا۔ یہ مدراس کے گورنر کے مشیر تھے۔ دریائے تنگبھدرا میں بند لگا کر نہر نکالنے کا مسئلہ اور مدراس و حیدرآباد کے درمیان پانی کی تقسیم کا مسئلہ زیر بحث تھا۔ جس کا تصفیہ بخیر و خوبی ہو گیا۔ حیدرآباد کے نمائندے نواب علی نواز جنگ تھے جو انجینیر ہونے کے اعتبار سے بڑے بلند پایہ ماہر فن تھے۔

ڈنر کے بعد مجھے اطلاع ملی کہ بہادر یار جنگ۔ ہاشم علی خاں کے یہاں کھانے پر گئے تھے۔ کھانے کے بعد حقّہ آیا جوں ہی اُس کا کش لیا۔

دل کی حرکت بند ہوگئی۔ مجھے ان کے انتقال کا افسوس ہوا یہ اچھے معاملہ فہم تھے۔ حیدرآباد میں عموماً اور وہاں کے مسلمانوں پر خصوصاً ان کا بہت اثر تھا۔ میں صبح کو اُن کے مکان پر تعزیت کے واسطے گیا۔ اُسی وقت سرکار بھی تشریف لائے۔ تجہیز و تکفین میں شریک ہوا۔ بہت بڑا مجمع تھا۔

پھر اعلیٰ حضرت کے پاس حاضر ہوا۔ مجھے زین یار جنگ سے سرکار کے خیالات معلوم ہو چکے تھے۔ سرکار نے فرمایا کہ بتائیے تمہاری رائے اُن کی موت کے متعلق کیا ہے۔ میں نے کہا کہ ان کے انتقال سے سرکار کا ایک بڑا خادم اُٹھ گیا۔ لیکن خدا کا کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ فرمایا ان کے عروج سے ضرور فتنہ کا اندیشہ تھا بعدہٗ اور کچھ مرحوم کے متعلق فرماتے رہے۔ ۳۰ جون کو جب میں ریذیڈنٹ سے ملا تو ریذیڈنٹ نے بھی بہادر یار جنگ کے انتقال کے متعلق وہی خیالات ظاہر کیئے کہ جو نظام کے تھے اُنہوں نے کہا ذاتی طور سے مجھے افسوس ہے لیکن یہاں کے انٹرسٹ کے پیش نظر یہ بُرا نہ ہوا۔

۲ جولائی ۱۹۴۴ء آج حکیم مقصود علی خاں جو سرکار کے طبیب خاص تھے ایک نجی خط بیوہ بہادر یار جنگ کا لائے جس میں مرحوم کی موت کی وجہ پر اشتباہ کیا تھا اور یہ خواہش کی تھی کہ مرحوم کی جاگیر تاحیات اُن کے نام کر دی جائے۔ گو یہ پرائیویٹ خط تھا مگر چونکہ زہر خورانی کا شبہ کیا تھا۔ میں نے پولیس ممبر گرگسن اور رابنڈرسن ناظم پولیس کو بتایا کہ وہ اس نظر سے بھی دیکھیں۔ اُسی روز علی یاور جنگ میرے یہاں لنچ پر آئے اور کہا کہ جس زمانہ میں ہم لوگ حیدرآباد سے باہر تھے یہاں کسی بڑی سازش کی گرم خبر پھیلی تھی اور انہوں نے ناظم پولیس سے اس کا ذکر کیا تھا میں نے جب ناظم پولیس سے دریافت کیا تو اس نے کہا کہ علی یاور جنگ نے ذکر کیا تھا مگر ناظم پولیس کو اس کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ ہوشس نے بھی مجھ سے کہا کہ

بہادر یار جنگ کے ذریعہ سے کوئی گہری سازش ہونے والی تھی ان حضرات کا منشاء یہ تھا کہ غلام محمد اور بہادر یار جنگ ملکر کوئی سازش میرے خلاف کرنے والے تھے۔ واللہ اعلم۔

نواب علی نواز جنگ کی شخصیت بھی ایسی تھی کہ حیدرآباد کی کہانی نامکمل رہے اگر ان کا ذکر نہ ہو۔ یہ ایک وظیفہ یاب انجنیر تھے مزاج بہت تیز تھا۔ لیکن اپنے فن کے اعتبار سے اُنہیں بڑے پایہ کا انجنیر خیال کیا جاتا تھا ان کی قابلیت کا یقین مجھے اس سے ہوا کہ میرے ایک دوست سر ولیم اسٹیمپ جو یو۔ پی سے چیف انجنیری سے ریٹائر ہوئے تھے اور اس زمانہ میں حکومت ہند نے اُنہیں مشیر کی حیثیت سے پھر بلایا تھا حیدرآباد آئے جہاں تک مجھے یاد ہے اسی تنگبھدرا کے پانی کے قضیہ میں آئے تھے میں نے اُن سے پوچھا کہ یہاں علی نواز جنگ کے بلند پایہ انجنیر ہونے کی بڑی شہرت ہے آپ کا کیا خیال ہے سر ولیم نے کہا کہ

"NAWAB SAHIB, WHAT ALI NAWAZ JUNG DOES NOT KNOW IN ENGINEERING IS NOT WORTH KNOWING."

اس سے اندازہ ہوا کہ اُن کا فنی اعتبار سے کیا مرتبہ تھا۔

۵ اگست ۱۹۴۸ء دہلی سے واپسی پر سرکار میں حاضر ہوا۔ وہاں کی کہانی دُہرائی جس میں خاص بات یہ تھی کہ برٹش گورنمنٹ سکندرآباد کے لوگوں پر انکم ٹیکس لگانا چاہتی تھی دوسرے یہ کہ ہمارے کارخانوں سے جو برٹش انڈیا میں چیزیں خریدی جائیں اُن کی قیمت برٹش انڈیا میں ادا ہو مطلب یہ تھا کہ آمدنی کسی شخص کو اگر برٹش انڈیا میں ہوگی تو وہاں کا ٹیکس لگانے کا حق بھی برٹش گورنمنٹ کو ہوگا۔ حیدرآباد کی حکومت اس کی مخالف تھی میرا استدلال یہ تھا کہ سکندرآباد کی ملکیت برٹش کو نہیں دی گئی ہے فقط فوج رکھنے کا حق دیا ہے۔ ورنہ ہم وزیر ہند کو اپیل کریں گے۔

۱۳ اگست ۴۴ء کبھی کبھی حیدرآباد میں صدر اعظم کو ایسے کام بھی سپرد کر دیئے جاتے تھے جن کا تعلق اس کے فرائض منصبی سے دور کا بھی نہ ہوتا۔ آج سرکار نے کہا کہ اُن کے ایک صاحبزادے نے اپنی بیوی کی شکایت سرکار میں کی ان کی بیگم صاحبہ نے اپنے بیٹے کو کسی بات پر سرزنش کیا۔ اسی پر میاں بیوی میں کچھ تیز گفتگو ہو گئی اور "دیوانہ" کا لفظ استعمال کیا گیا۔ مجھے ارشاد ہوا کہ میں بسہولت اس قصہ کو ختم کرا دوں۔ اول تو ایک خانگی قصہ کو سرکار کے علم میں لانا ہی نامناسب تھا اور اگر ایسی غلطی کی بھی گئی تو اعلیٰ حضرت خود بحیثیت باپ اور بزرگ خاندان مناسب پیرائے میں مداخلت فرماتے۔ صدر اعظم غریب ان خانگی امور میں کہاں آتا ہے مگر۔

ایں ہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر

۱۶ ستمبر ۴۴ء کو ریزیڈنٹ سے بڑی طویل گفتگو رہی۔ وہ خود ہی ملنے آ گئے۔ چونکہ ویسرائے آنے والے تھے۔ وہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ نظام اُن سے کیا بات چیت کریں گے۔ تاکہ ویسرائے جوابات کے لئے تیار ہو جائیں۔ بعدہٗ حیدرآباد کے واسطے بندرگاہ۔ برار اور جو اضلاع اس سے پہلے دیئے تھے کی گفتگو ہوئی۔ ریزیڈنٹ کو ہمارے مطالبات سے ہمدردی تھی مگر وہ بجا طور پر یہ کہتے تھے کہ اگر برار حیدرآباد میں شامل ہوا تو پوری ریاست کے لئے مصیبت ہو جائے گا۔ وہاں کے لوگوں کا سیاسی نقطہ نظر بالکل مختلف ہے۔ پھر گوا کی بندرگاہ کا ذکر آیا میں نے کہا ہم خریدنے کو تیار ہیں اگر پرتگال سے معاملہ ہو جائے۔

جب میں سرکار میں حاضر ہوا تو میں نے یہ ذکر کیا اور یہ مشورہ دیا کہ سرکار کا جواب یہ ہونا چاہیئے کہ جب میں دہلی سے واپس آؤں گا تب یہ بتایا جائے گا۔

ظہیر یار جنگ کو سرکار نے وزیر بنانا منظور کر لیا ۔ ریزیڈنٹ سے میں پہلے ہی طے کر چکا تھا سرکار سے جو گفتگو ہوئی تھی اُسے اسی پیرایہ میں ریزیڈنٹ کو لکھ کر بھیجدیا جس سے اُسے یہ غلط فہمی ہوئی کہ اُس سے چھپا کر ہم دہلی میں کچھ کرنا چاہتے ہیں ۔ میں نے اس غلط فہمی کو دور کیا ۔ میں نے سرکار سے بارہا کہا کہ وہ ریزیڈنٹ سے خود خط کتابت نہ فرمائیں مگر سرکار قبول نہیں کرتے جس سے دشواریاں پیدا ہو جاتی ہیں ۔

۲۲ ستمبر ۴۴ئہ میں ریزیڈنٹ سے ملا ۔ وائسرائے کے پروگرام پر گفتگو رہی بعدہٗ سرکار کے مطالبات کا ذکر آیا وہ اس کی سفارش کرنے کو تیار ہیں کہ چھوٹا سا حصّہ برٹش انڈیا کا جو حیدرآباد اور لینٹر کے درمیان ہے حیدرآباد کو دیدیا جائے ۔ جس کا طول نقشہ میں ساٹھ میل کے قریب اور چوڑائی تقریباً بیس میل معلوم ہوتی ہے ۔ وہ اس پر بھی تیار رہے کہ ایک بندرگاہ بھی حیدرآباد کو دیا جائے ۔ میں نے کہا کہ کوشش کیجئے ۔ گو دل میں سوچ رہا کہ خدا جانے نظام مانیں گے یا نہیں مگر میں جانتا تھا کہ برار کی واپسی سے کوئی فائدہ نہیں بلکہ نقصان ہوگا یہ تجاویز زیادہ مفید ہیں ۔

ریاست لینٹر میں گرگسن جو پولیس اور مالگذاری کا وزیر تھا ۔ ایک زمانہ میں جب راجہ نابالغ تھا بحیثیت کارجین یا ایجنٹ رہ چکا تھا ۔ گرگسن نے یہاں تک مجھے یاد ہے راجہ سے بھی بات چیت کی تھی ۔ ہماری تجاویز یہ تھیں کہ حیدرآباد ۔ راجہ صاحب کی راجدھانی تک ریل بنالے اور اس میں تقریباً پچیس لاکھ روپیہ کے حصّے اُنہیں مفت دے اور لوہے کی کان پر کام شروع ہو تو اُنہیں حق مالکانہ دیا جائے مگر اب تو یہ مصرعہ دھرانے کو دل چاہتا ہے ۔

ما در چہ خیالم و فلک در چہ خیال

حیدرآباد میں گزٹ کو جریدہ کہا جاتا تھا ۔ ایک پرانا گزٹ یا جریدہ میں نظر

ہے جس میں اعلیٰ حضرت نے مجھے "سعید الملک" کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔
اس جریدہ کے صفحہ کے ایک طرف معتمد باب حکومت یعنی کیبنٹ سکریٹری کی
طرف سے اعلان اور دوسری طرف فرمان ہے۔

جریدہ غیر معمولی

جلد ۷۶ - حیدرآباد دکن - ۲۸ - تیر ۱۳۵۴ف م ۲۰ جمادی الثانی سنہ ۱۳۶۴ھ
یوم شنبہ - نمبر ۴

بارگاہ جہاں پناہی سے بتقریب سالگرہ ہمایونی - عالی جناب کرنل
نواب سر احمد سعید خاں بہادر صدر اعظم باب حکومت کو خطاب مرحمت ہونے
کے متعلق جو فرمان عطوفت نشان مورخہ ۲۰ جمادی الثانی سنہ ۱۳۶۴ھ شرف صدور
لایا ہے وہ بغرض اطلاع عام شائع کرنے کی عزت حاصل کی جاتی ہے۔

اشفاق احمد
معتمد صدر اعظم بہادر و کونسل

فرمان

میری سالگرہ کے موقعہ پر (یکم رجب) میں نے نواب احمد سعید خاں صاحب
نواب چھتاری کو اُن کی وفادارانہ خدمات کے مد نظر سعید الملک کا خطاب
دیا ہے۔

جریدہ غیر معمولی میں طبع کیا جائے
۲۰ جمادی الثانی سنہ ۱۳۶۴ھ

اعلیٰ حضرت بندگان عالی متعالی مدظلہم العالی
(شرح دستخط مبارک)

پرنسس در شہوار دہلی میں مجھ سے ملیں اُن سے یہ معلوم ہو کر بہت افسوس

ہوا کہ اُن کے والد کا فرانس میں انتقال ہو گیا۔ یہ ٹرکی کے آخری سلطان اور خلیفہ تھے مصطفیٰ کمال کے انقلاب کے بعد انہیں معہ اُن کے خاندان کے ملک سے نکال دیا گیا تھا۔ مجھے بہت افسوس ہوا۔ گو اب یہ غریب الدیار پیرس میں رہتے تھے۔ جمہوری ترک حکومت نے اُن کا کوئی مقررہ تک نہ کیا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے۔ حیدر آباد سے ایک ماہوار رقم انہیں ملتی تھی۔ شاید پانچ ہزار روپیہ ماہوار۔ لیکن آل عثمان کا ماضی میرے سامنے آگیا اور بے ساختہ یہ مصرعہ یاد آیا۔

"یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانہ کی خاک"

شہزادی کی یہ خواہش تھی کہ برٹش گورنمنٹ انہیں کسی طرح پیرس پہونچا دے۔

۱۷ اکتوبر ۴۴ء آج میں پرنس اعظم جاہ سے ملا اور میں نے اُن سے کہا کہ آپ شہزادی صاحبہ سے یہ کہئے کہ میں بھی تمہارے ساتھ فرانس چلنے کو تیار ہوں اس سے زن و شوہر کے تعلقات بہتر ہونگے۔ مجھے ریزیڈنٹ سے معلوم ہوا کہ پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ نے لکھا ہے کہ پیرس کی حالت اس قابل نہیں کہ وہ شہزادی درشہوار کو بھیجنے کی ذمہ داری لے سکیں۔ لہٰذا خان بہادر اشفاق صاحب کو ولایت بھیجا گیا یہ حیدر آباد کے بہترین افسروں میں تھے علاوہ علمی قابلیت کے وفاشعاری اور صداقت اُن کا طغرا بہ امتیاز تھا مجھے ان سے بہت مدد ملی۔

۴ نومبر ۴۴ء کو میں سرکار کے پاس حاضر ہوا۔ اعلیٰ حضرت نے مجھے وہ وصیت نامہ دکھایا جو خلیفہ مرحوم نے اپنی بیٹی شاہزادی درشہوار کو دیا تھا۔ اس میں مرحوم نے یہ خواہش کی تھی کہ انہیں شام میں دفن نہ کیا جائے جہاں سلطان عبدالوحید خاں مرحوم دفن ہیں اس لئے کہ اُن کی ہی پالیسی سے یہ تمام مصیبت آل عثمان پر آئی انہیں ہندوستان میں یا

بیروت میں دفن کیا جائے۔ مرحوم نے یہ بھی لکھا تھا کہ اس کے متعلق مفصل گفتگو اپنے داماد ہز ہائینس پرنس اعظم جاہ سے کی ہے۔

مجھ سے اعلیٰ حضرت نے یہ بھی فرمایا کہ ہز ہائنس پرنس اعظم جاہ نے یہ کہا کہ جس گفتگو کا ذکر شہزادہ اعظم جاہ سے خلیفہ مرحوم نے اپنے وصیت نامہ میں کیا ہے اس کا منشاء یہ تھا کہ خلیفہ مرحوم کے بعد شہزادہ اعظم جاہ کو خلیفۃ المسلمین ہونا چاہیئے۔ اعلیٰ حضرت نے میری رائے دریافت کی میرے ذہن میں یکایک یہ شعر آیا۔

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب دیکھئے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں

خلافت کوئی جاگیر تو تھی نہیں کہ خلیفہ کا بیٹا نہ ہو تو داماد کو ورثہ میں ملے امیر المومنین تو وہی شخص ہو سکتا ہے جس کے سامنے مسلمانان عالم کا سر محبت اور عقیدت کے جذبات سے جھکے جس کی عظمت وشوکت قوت وہیبت کا سکہ شاہان اسلام کے دلوں پر بیٹھا ہو۔ جو نہ صرف رموز حکمرانی اور جہاں بنا ہی کا ماہر ہو بلکہ بوقت ضرورت ملک گیری سے بھی عاری نہ ہو اور جس کی شمشیر حفاظت اسلام کے لئے بے نیام رہے۔ میں نے عرض کیا کہ خلافت اگر کوئی مفید چیز ہوتی تو خود ترک اسے کیوں چھوڑتے اور حیدر آباد کی تو چند در چند دشواریاں ہیں ہم کوئی اقدام بغیر برٹش حکومت کے مشورہ نہیں کر سکتے ہیں اس سے الگ ہی رہنا مناسب ہے۔

تاریخ صحیح یاد نہیں مگر جنوری ۱۹۴۵ء میں وایسرائے دورے پر تشریف لائے سر فرانسس وائلی بھی (سیاسی مشیر) اُن کے ساتھ تھے حسب دستور سرکار نے کچھ تحائف جن کی قیمت تقریباً پانچ ہزار تھی وایسرائے کو بھیجے اور وایسرائے نے تحائف سرکار کو دیئے۔ حسب معمول سرکار نے ڈنر دیا۔

میں نے ایٹ ہوم دیا اور کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں ہوئی۔
اُسی زمانہ میں نواب ذوالقدر جنگ مرحوم میرے پاس آئے نظام میر محبوب علی خاں مرحوم کے بہت سے خط اپنے والد کے نام کے مجھے دکھائے جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نظام مرحوم کو ان کے والد سرور جنگ مرحوم سے بہت تعلق تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک خط میں نظام مرحوم نے سرور جنگ کو لکھا تھا" لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ میں آپ سے نہ ملا کروں. لیکن میں نے نہ کبھی ایسا کیا نہ کرتا ہوں اور نہ کروں گا۔

ان خطوط سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وقار الامراء جو مدار المہام یا وزیر اعظم تھے ان پر نظام مرحوم کو اعتماد نہ تھا اور سرور جنگ ایسی ترکیب کرتے رہتے تھے جن سے نظام اور وزیر اعظم کے تعلقات خراب رہیں۔ مگر یہ قصہ پارینہ ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حیدرآباد میں اس طرح کی سازشیں ایک مرض مزمنہ ہو گئی تھیں۔

لیاقت علی خاں مرحوم مدراس کے دورے کو جا رہے تھے اُنہوں نے مجھے لکھا کہ وہ حیدرآباد آنا چاہتے ہیں۔ میں نے لکھا کہ بخوشی آئیے لیکن وہ چونکہ سیاسی ضرورت سے دورہ کر رہے تھے۔ میں نے اُنہیں حکومت کا مہمان نہیں بنایا اپنے مہمان کی حیثیت سے اُنہیں رکھا۔ لیاقت علی خاں اعلیٰ حضرت سے بھی ملے۔

۲۲ فروری ۱۹۴۵ء میں سرکار میں حاضر ہوا تو سرکار نے کہا کہ مجھے لیاقت علی خاں کی صورت دیکھ کر یہ خیال آیا کہ اگر یہی حال پاکستان کا ہوگا کہ جس صورت میں یہ ہیں تو" خدا حافظ" پھر سرکار نے کہا کہ گاندھی جی کے مرنے کے بعد کانگریس اور جناح کے مرنے کے بعد مسلم لیگ میں یہ مضبوطی باقی نہیں رہے گی۔

تاریخ درج نہیں لیکن جون ۱۹۴۵ء کو میں اوٹی پہاڑ گیا اور ریزیڈنٹ

ریاست ہی کے مکان میں مقیم تھے وہیں میں ٹھہرا۔ میں نے ایک خط کی صورت میں اپنی تجاویز سرکار کو کوئی خطاب اور دوسرے مطالبات کے متعلق دی۔ میں نے انہیں بتایا کہ نظام نے اس سے اتفاق کر لیا تھا کہ راجہ دھرم کرن کے بجائے آرمودا آئینگر وزیر ہوں مجھے تو پہلے سے اتفاق تھا مگر اعلیٰ حضرت برابر پس و پیش کر رہے تھے۔ ریزیڈنٹ اس پر بہت خوش ہوئے۔

آرامودا آئینگر ایک بہت تجربہ کار وکیل تھے بہت اچھی قانونی قابلیت کے علاوہ بہت دوراندیش اور معاملہ فہم ہیں مزاج میں اعتدال اور مصلحت بینی دونوں کا امتزاج ہے۔

میں نے اس ملاقات میں ریزیڈنٹ سے صاف صاف پوچھا کہ آخر اس کی کیا وجوہات ہیں کہ باوجود حیدرآباد کی اتنی زبردست جنگی خدمات کے برٹش گورنمنٹ کا طرز اگر مخاصمانہ نہیں تو مخالفانہ ضرور تھا انہوں نے کہا کہ منجملہ اور باتوں کے اس کی ایک وجہ خود اعلیٰ حضرت کا مزاج تھا۔ کسی گذشتہ زمانہ میں اعلیٰ حضرت نے یہ کوشش کی تھی کہ انگریز ملازمان کو ایک ساتھ نکال دیا جائے۔ میں نے کہا کہ اب ہندوستان کی آزادی یقینی ہے تو پھر ان باتوں کا کیا موقعہ ہے اس بار ریزیڈنٹ بہت دل برداشتہ تھے جس کی وجہ یہ تھی کہ سرفرانسس وائلی کے بجائے ان سے جونیر کو جن کا نام کورفیلڈ تھا۔ مشیر سیاسی مقرر کیا گیا جیسا کہ کچھ عرصہ سے سُن رہا تھا اور پرنس آف برار نے بھی کہا تھا مجھے ان سے تصدیق ہوئی کہ نظام میری میعاد ختم ہونے پر سرمرزا اسماعیل کو میرا جانشین کرنا چاہتے ہیں مگر برٹش گورنمنٹ ابھی متذبذب ہے۔

میں نے شروع سے یہ ارادہ کر لیا تھا کہ کسی معاملہ میں اعلیٰ حضرت پر حکومت ہند سے دباؤ دلوانے کی کوشش نہیں کرونگا۔ گو اس سے

مجھے دشواریاں ہوئیں اور پرانا طرز کاربراری کے لئے آسان تھا مگر مجھے یہ
پسند نہ تھا کہ نظام کے کسی فعل کا شکوہ مشیر سیاسی یا ویسرائے سے کروں
اور اس طرح اعلیٰ حضرت پر دباؤ ڈلوایا جائے۔ میں نے شروع ملازمت
میں یہ ادارہ کر لیا تھا جس پر خدا نے اپنے کرم سے مجھے قائم رکھا۔

چنانچہ سر فرانسس وائلی جب مشیر سیاسی کے عہدہ سے سبکدوش
ہو کر رخصت پر ولایت جانے لگے تو میں نے اپنے دوستانہ تعلقات
کی بنا پر انہیں لکھا کہ میں اُن سے خدا حافظ کہنے دہلی آؤں اس کے جواب
میں انہوں نے لکھا کہ میرے زمانہ میں انہیں کوئی تشویش یا نزد حیدرآباد
کے متعلق نہیں ہوا۔ (نقل خط سر فرانسس وائلی اگلے صفحہ پر ہے)

۱۳ جولائی ۱۹۴۵ء میں اور غلام محمد مرحوم ریزیڈنٹ سے ملے سب سے
پہلے تو اس پر گفتگو ہوئی کہ حکومت ہند کو سکندرآباد میں انکم ٹیکس لگانے
کا حق نہیں۔ سکندرآباد برٹش انڈیا کا کوئی حصہ نہ تھا بلکہ فوج رکھنے کی
غرض سے اُسے دیا گیا تھا۔ ریزیڈنٹ اسے مانتے تھے۔ اس کے بعد
اصلاحات کا مسئلہ زیر بحث رہا۔ جیسا کہ پہلے بھی لکھ چکا ہوں۔ سر اکبر مرحوم
کے زمانہ میں ایک تحریر مسلمانان حیدرآباد کو دیدی گئی اور جہاں تک
مجھے یاد ہے اعلیٰ حضرت کی طرف سے اُنہیں اطمینان دلایا گیا کہ آئندہ
اسمبلی (مقننہ) میں اُن کی نشست اکیاون فیصدی ہوگی۔ مسلمان اس
تحریر کو واپس دینے کو تیار نہ تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ وعدہ خلاف انصاف
اور ناقابل عمل تھا۔ ستاسی فیصدی کو انچاس اور تیرہ فیصدی کو اکیاون
نشست کیسے دی جا سکتی تھیں۔ ہندو اس پر تیار تھے کہ ہندو اور مسلمان
ممبروں کی تعداد برابر ہو اور دوسرے اقوام و ملل کے نمائندے اس کے
علاوہ۔ لیکن پوری اسمبلی میں مسلمانوں کی اکثریت وہ ماننے کو بجا طور پر
تیار نہ تھے۔ نتیجہ یہ کہ اصلاحات کو جاری کرنا بغیر سخت خلل و خلش کے

Copy of Sir Francis Wyllie's letter.

New Delhi.
2-7-45.

Dear Nawab Sahib,

I thank you of your letter of the 22nd of June. I am much touched by your offer to come here to say goodby before I go to England, This is in keeping of the high standard of courtesy which you show in all your action. It is true that I would like to have a talk with you before I go but you must on no account attempt to make the journey. I am leaving Delhi on the 9th by Air & there would in fact hardly be enough time for you to get here before then any-way.

Will you please therefore take this letter as goodby ? It is really only Aurevoir for I shall look forward to seeing you in Oudh.

I would like how ever to say now how much I have admired your handling of Hyderabad Affairs during these last difficult years As a result of your being there Hyderabad has never given me a moment's anxiety during the two years I have been Political Adviser; about the dignity which you have imported into the hole business I will say nothing to you personally for fear you might get conceited!

I shall look forward to seeing you very soon after I come back to India, in the mean time I send you very kind good wishes.

Yours sincerely
Wyllie.

ناممکن ہوگیا۔ غلام محمد مرحوم نے یہ تجویز رکھی کہ اسمبلی بجائے انتخاب کے
نامزدگی کے ذریعہ بروئے کار آئے تاکہ اکیاون فیصدی کے قضیہ سے
نجات ملے۔ اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ مسلمانوں کا یہ فعل
کس قدر فراست اور مآل اندیشی کے خلاف تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے
نامزدگی کے ذریعہ سے مقننہ بنائی گئی۔ میرے پرانے کاغذات میں جو
نقشہ ملا اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندو ہیں اور مسلمان ہیں اور پائیگاہ
و صرف خاص کے ممبر اس کے علاوہ۔

۲۲ جولائی ۱۹۴۵ء آج ریزیڈنٹ شام کو آئے۔ بہت دیر تک گفتگو
کرتے رہے کہتے تھے کہ نظام سر مرزا اسماعیل کو صدر اعظم کی حیثیت سے
لانے پر بہت مصر ہیں اور گورنمنٹ آف انڈیا کو تذبذب ہے۔ ان کا یہ
خیال ہے کہ میں ہی یہاں رہوں۔ میری رائے دریافت کی۔ میں نے
کہا کہ اگر نظام کسی اور شخص کو چاہتے ہیں تو ایسی شکل میں میرا یہاں رہنا مناسب
نہ ہوگا میری مدت پانچ سال ختم ہو رہی ہے۔ حکمراں کی خواہش کے خلاف
رہنے میں کوئی لطف نہیں رہتا۔ یوں تو ہر صدر اعظم ویسرائے کی منشاء سے مقرر
ہوتا تھا مگر نظام کی منشاء کے خلاف مسلط ہونا مجھے پسند نہ تھا۔

اس زمانہ میں غلام محمد مرحوم کچھ بیمار ہو گئے تھے اور رخصت پر تھے
لیاقت جنگ جو فنانس کے سکریٹری تھے وہ بحیثیت منسٹر کام کر رہے تھے
اور چونکہ غلام محمد مرحوم کی مدت تقرر بھی ختم کے قریب تھی میں نے یہ خیال
کر رکھا تھا کہ زاہد حسین مرحوم کو دہلی سے فنانس منسٹر کی حیثیت سے لاؤں

۴ اگست ۱۹۴۵ء کو ریزیڈنٹ سے ملا اُن سے معلوم ہوا کہ سرکار نے
انہیں لکھا ہے کہ اگر جنگ ختم نہیں ہوتی تو وہ مجھے چند ماہ یا ایک سال کی
توسیع دینا چاہتے ہیں ورنہ مرزا اسماعیل کو بلانے کی خواہشمند ہیں کہ ریزیڈنٹ
نے کہا کہ دہلی کی خواہش ہے کہ میں توسیع قبول کروں۔ ریزیڈنٹ نے

مجھ سے کہا کہ سرکار نے یہ بھی لکھا ہے کہ میں وزارت عظمیٰ سے سبکدوش ہونے کے بعد بحیثیت چیف مشیر (چیف ایڈوائزر) پرنس آف برار سے منسلک ہو جاؤں۔ ریزیڈنٹ نے مجھ سے پوچھا کہ اس دوسری تجویز کے متعلق میری کیا رائے تھی۔ میں نے کہا کہ چیف ایڈوائزر کی تجویز بالکل نامناسب ہے وزارت عظمیٰ سے سبکدوش ہونے کے بعد میرا حیدرآباد کا قیام میرے جانشین کے واسطے خلجان کا باعث ہو سکتا ہے۔ چونکہ حیدرآباد کے مسلمان سر مرزا کو ناپسند کرتے ہیں ایسی صورت میں میرا نام لیکر سازشیں شروع ہو جائیں گی۔ میں نے کہا کہ اگر نظام نے مجھ سے دریافت کیا تو میں یہی کہوں گا۔ ریزیڈنٹ کو میری رائے سے اتفاق تھا۔ مجھ سے کہنے لگے کہ نظام سے ضرور کہنا۔

۸ ۱٫۱ اکتوبر ۱۹۴۵ء کو سرکار نے ایک خط کا مسودہ مجھے دکھایا جسے وہ ریزیڈنٹ کو بھیجنا چاہتے تھے اس میں انہوں نے C. P. کی گورنری کے متعلق میری سفارش اور صالح حیدری مرحوم کی مخالفت کی تھی۔ میں نے سرکار کی قدر افزائی کا شکریہ ادا کرنے کے بعد کہا کہ میرے متعلق جو تحریر ہے اُسے حذف کر دیا جائے اس واسطے کہ یہ خیال کیا جائے گا کہ میں نے اپنے ذاتی نفع کی وجہ سے نظام کو حیدری کے خلاف آمادہ کیا اور اگر سرکار کی کسی تجویز کو نامنظور کیا گیا تو مجھے افسوس ہوگا۔ نظام نے مان لیا۔

اول تو نظام کو ایسی مداخلت کا حق نہ تھا اور ہوتا بھی تو میرے سر اکبر صالح حیدری مرحوم اور اُن کے والد سر اکبر حیدری مرحوم سے ہمیشہ دوستانہ رہے ہیں اس تجویز سے کیسے اتفاق کر سکتا تھا۔

سکندر آباد کی واپسی

یکم دسمبر ۴۵ء۔ آخر کار ایک عرصہ کی گفت و شنید کے بعد جس میں ملٹری ڈپارٹمنٹ نے مخالف پہلو اختیار کیا) سکندر آباد کی واپسی ہو گئی۔

برٹش حکومت ہر کام سلیقہ سے کرتی تھی۔ باضابطہ ایک معاہدہ لکھا گیا جس میں سکندر آباد کے تمام اداروں کے جملہ حقوق کی حفاظت تھی جس کی ایک نقل میرے پاس ہے۔ یکم دسمبر کو حیدر آباد ریزیڈنسی گیا۔ پولیٹیکل یونیفارم میں نے بھی اور ریزیڈنٹ نے بھی پہنا۔ میرے ساتھ معین نواز جنگ اور میرے A.P.C سلمان مرحوم تھے۔ ریزیڈنٹ اور ان کے سکریٹری موٹر تک مجھے لینے آئے۔

گارڈ آف آنر نے سلامی دی۔ کمرے میں جا کر میں نے اور ریزیڈنٹ نے معاہدے پر دستخط کئے۔ جس کا فوٹو لیا گیا۔ جو میرے نشست کے کمرے میں اس روز کی یاد دلاتی رہتی ہے۔

سکندر آباد دراصل حیدر آباد ہی کا ایک حصہ ہے۔ ممکن ہے ڈیڑھ سو دو سو برس پہلے یہ دو شہر ہوں مگر اب یہ حیدر آباد ہی کا حصہ ہے۔ یہاں انگریزی فوج۔ پولیس۔ عدالتیں۔ جیل۔ سب برٹش حکومت کے تھے۔ قوانین بھی وہیں کے نافذ ہوتے تھے۔ اس اعتبار سے یہ برٹش انڈیا کا ایک ٹکڑا حیدر آباد میں تھا ظاہر ہے کہ اپنی ریاست گاہ یا دارالسلطنت میں ایک حصہ شہر کا اگر دوسری زبردست طاقت کے قبضہ میں ہو تو دو عملی پیدا ہوتی تھی اور کمزور طاقت کے اقتدار کو نقصان ہوتا تھا۔ مجھے بھی اس سے مسرت ہوئی اور نظام بھی خوش ہوئے کہ حیدر آباد کے پہلو میں جو کانٹا تھا نکل گیا۔

جنوری ۱۹۴۶ء میں آریہ سماج کے لوگوں نے ایک میٹنگ کی خواہش کی جنہیں قیود و شرائط کے ساتھ اجازت دی گئی۔ سر اکبر حیدری مرحوم کے زمانہ میں آریہ سماج نے ایک بڑی شورش کی تھی جس کے سلسلہ میں ایسے احکامات جاری ہوئے تھے کہ دوران جنگ کوئی میٹنگ حیدرآباد میں نہ ہو۔ اب جبکہ جرمنی آخری سانس لے رہا تھا اور یورپ کی جنگ تقریباً ختم ہوگئی تھی۔ حکومت حیدرآباد نے قیود و شرائط کے ساتھ اجازت دی۔ علاوہ ازیں پورے ہندوستان میں آزادی کی لہریں اٹھ رہی تھیں عوام کے طبائع انقلابی مد و جزر سے متاثر ہو رہے تھے اس لئے زباں بندی کے احکامات کا نافذ رہنا خلاف مصلحت تھا۔

اسی زمانہ میں خاکساروں کا بھی ایک جلسہ ہوا اور آریہ سماج و خاکسار دونوں ہی جلسوں میں قابل اعتراض تقریریں ہوئیں جن پر قانون کے تحت کارروائی کی گئی اور سرکار میں پوری اطلاع بذریعہ عرضداشت دیدی گئی آریہ سماج کے جلسے میں تقریریں فرقہ وارانہ تھیں۔ گو اجازت ایک مذہبی جلسہ کی مانگی گئی تھی چنانچہ پورن چند جو پنجاب سے ایک لیڈر آئے تھے جن کی تقریر قابل اعتراض تھی انہیں ریاست بدر کر دیا گیا اور نرائن سکسینہ جو حیدرآباد کے تھے ان پر مقدمہ چلا گیا۔

خاکسار عبدالجبار المسلم کو اپنی تقریر تسلیم تھی جس میں انہوں نے کہا تھا کہ افسران ریاکار ہیں جو اپنے کو تفضیلیہ کہتے ہیں۔ اس میں اشارہ ذات ہمایونی کی طرف تھا انہیں فوراً حیدرآباد ڈفنس قواعد کے تحت گرفتار کر لیا گیا۔

پہلی صفر ۱۳۶۴ھ کو ایک یادداشت کے ذریعہ تمام واقعات نظام کے حضور میں پیش کر دئیے گئے حکومت نے اپنا نقطۂ نظر بھی سرکار کے حضور میں پیش کر دیا جو کم و بیش یہ تھا۔

ان دونوں شورشوں میں ایک یہ چیز مشترک ہے۔ آریہ سماج
اور خاکسار دونوں کی تنظیم پورے ہندوستان میں تھی دوسرے یہ کہ یہ
واقعات ایسے تھے کہ مقامی اخبارات بھی اپنے اپنے فرقہ کی تائید میں
شریک ہو جاتے۔ جہاں تک خاکساروں کا تعلق کونسل کے یہ بھی پیش نظر
رہا کہ اس تقریر میں ذات ہمایونی کے معتقدات کی طرف اشارہ تھا اس
زیادہ سخت احکامات ممکن تھے لیکن بغیر ان نتائج پر غور کئے ہوئے کہ
کوئی فعل یا حکم ایسا نہ ہو جو پورے ہندوستان میں شورش کی وجہ بن سکے
جس میں حکمراں کے عقائد کو زیر بحث لانے کی کوشش کی جائے۔ کوئی حکم
نافذ کرنا یا اعلیٰ حضرت کو ایسا مشورہ دینا خلاف عقیدت اور وفاداری
ہوتا۔

۱۹ فروری ۴۶ء میرے دہلی سے واپسی پر شام کو سر عقیل جنگ آئے
اور وہ نیم سرکاری جو بصیغہ راز آیا تھا مجھے دکھایا جس سے مجھے تکلیف ہوئی
جس کی نقل بجنسہ حسب ذیل ہے۔

یکم صفر المظفر ۱۳۶۴ھ

خدمت شریف جناب معتمد صاحب باب حکومت۔

آپکو تحریر کرنے کے لئے سرکار کا جو حکم ہوا ہے وہ حسب ذیل ہے۔

آریہ سماج کو ان کی میٹنگ کرنے اور بلا قیود و شرائط۔ گورنمنٹ نے
جو اجازت دیدی ہے اور جس کی وجہ سے حال میں جو جلسے ہوئے اس میں
مذہب اسلام پر جو حملے ناشائستہ دریدہ ذہنی سے کہے گئے ہیں یا مذہبی کتاب
دین کی جو توہین ہوئی اس پر تمام طبقۂ اسلام میں ہل چل ہے جس کا حال
یہاں کے لوکل اخبارات کے مضامین سے جو کہ شائع ہوئے مثل روز روشن
ظاہر ہے ایسی حالت میں اندیشہ اس کا ہے کہ اگر گورنمنٹ استقلال و جرأت
سے کام نہ کرے گی اور کوئی فتنہ یہاں پیدا ہو جائے گا تو پھر مجھ کو کونسل کو

DISOLVE کرکے دوسری کونسل کو مجبوراً تشکیل دینی ہوگی
کس لئے کہ بحیثیت حکمراں مجھ پر بھی اپنی حد تک ذمہ داری عائد ہوتی ہے
کہ میں بھی اپنے فرائض رکھتا ہوں۔ یعنی کہا یہ جائے گا کہ کونسل نے کمزوری
بتائی تھی اور ایسے نکات سمجھنے سے قاصر تھی تو پھر حکمراں بیٹھ کر کیا کر رہا
تھا کیوں اپنی پاور سے جو کہ اس میں INVEST تھا از روئے
کونسٹی ٹیوشن بحیثیت رئیس کام نہیں لیا۔ نظر برآں بعد واپسی پریسیڈنٹ
کونسل اس مسئلہ پر کونسل میں غور ہو کر کیا طے پاتا ہے اس سے مجھ کو ہفتہ
عشرہ میں اطلاع دی جائے کہ قریب میں ریزیڈنٹ صاحب سے گفتگو
کرنے والا ہوں۔

صدر المہام پیشی

کونسل نے حسب ذیل عرضداشت انگریزی میں پیش کی۔ مجھے اس سے
مسرت ہوئی کہ میری کابینہ کے تمام ممبران نے بلا استثنیٰ مذہب اور
قوم اس پر دستخط کر دئے۔

Secret

Hyderabad-Deccan
22nd January 1944

Your Exalted Highness,

Council have read with pain the Peshi D. O. letter dated the 1st Safar 1364 Hijri regarding the recent objectionable speaches delivered at the Arya Samaj Annual Conference and the Khaksar agitation over the arrest of Abdul Jabbar Khan Almuslim. The correct facts about these cases have already been submited through Arzdasht dated the 18th Isfandar 1354 Fasli and Council have no doubt that, in the light of these facts, your Exalted Highness has now realised that the strictures passed on the Council in these letter were completely unmerited.

2. Council moreover feel constrained most respectfully to submit that these strictures have deeply wounded the feelings of your loyal servants, the Members of the Council, and they respectfully submit that in these critical days their policy has been determined by the parmount consideration of avoiding those sharp conflicts with policical and religious group swhich have hampered the war effort in some other parts of India and of preserving law and order and gave the way for development and progress. The successful execution of such a policy involves firmness tampered with moderation and foresight - not always an easy course to follow. If judgement is passed on the policies and action of the Council without first ascertaining the observations and renarks of the Council, the results are bound to affect the interest of administration.

In the end Council respectfully beg to submit that if, in face of the facts stated in the Arzdasht referred to above, your Exalted Highness still adheres to the views expressed in the Peshi D. O. of the 1st Safar, Council would greatly prefer dissolution to continuing in office in such a situation as has now developed. They would add that the contents of such letters often leak out some how or other and are circulated as public gossip in a greatly exaggerated and distorted form. Your Exalted Highness will appreciate how impossible the work of Government can become in these circumstances.

Council regret having to make representation of this character. but their one motive in doing so is to serve the highest interests of your Exalted Highness and of the State which they have the honour to serve.

With Deep respects,

We beg to remain,

Your Exalted Highness
Most Loyal and devoted servants,

1. Sd/- Ahmad Said
2. Sd/- Akeel Jung
3. Sd/- Mehdi Yar Jung
4. Sd/- Dharam Karan
5. Sd/- Ghulam Mohamed
6. Sd/- W. V. Grigson
7. Sd/- Alam Yar Jung
8. Sd/- Zahir Yar Jung

کابینہ کے جلسوں کی روئیداد کا حال ریزیڈنٹ کو معلوم ہو ہی جاتا
تھا وزیراعظم کا مقرر کیا ہوا انگریز اسی لئے تھا جب ریزیڈنٹ کے علم
میں اس عرضداشت کا مضمون آیا تو ۲۹ جنوری کی ملاقات میں اُن سے
بات چیت ہوئی۔ اُن کا خیال تھا کہ چونکہ پریسیڈنٹ کا تقرر وزیراعظم کی
منشا سے ہوتا ہے آپ استعفی بغیر CROWN REPRESENTATIVE
کے مشورہ کے نہیں دے سکتے اور آپ کو عرضداشت میں لکھنا چاہیے تھا۔
SUBJECT TO THE APPROVAL OF CROWN REPRESENTATIVE.
میں نے کہا کہ یہ میں کیسے لکھ سکتا تھا یہ تو نظام اور حکومت ہند کے درمیان
ایک نجی معاہدہ ہے۔ حیدرآباد کے یا برٹش حکومت کے کسی آئین میں
اس کا ذکر نہیں۔ گو یہ واقعہ تھا۔ مگر آئینی اعتبار سے میں نظام کا نامزد کیا ہوا

تھا وہ یہ سن کر خاموش ہو گئے۔ اسی سلسلے میں ایک روز گرگسن میرے پاس آئے اور ایک تار جو دہلی سے آیا تھا دکھایا جس کا ماحصل یہ تھا کہ چونکہ گرگسن وائسرائے کے مقرر کردہ ہیں انہیں استعفیٰ نہیں دینا چاہیئے۔ حالانکہ جب مسودہ یادداشت کابینہ میں زیر بحث تھا تو وہ اس پر زور دیتے تھے کہ سخت الفاظ میں اظہار مقصد کیا جائے میں نے ان کی رائے سے اتفاق نہیں کیا تھا۔ میرے نزدیک کسی حالت میں بھی تہذیب۔ فرق مراتب اور آداب کے حدود سے باہر قدم رکھنا جائز نہیں۔ آج گرگسن اس سے اتفاق کر رہے تھے کہ میں نے اُن کی رائے نہ مانی اور اظہار مقصد مناسب الفاظ میں کیا۔

برٹش حکومت کے افسران کی یہ پالیسی ہر معاملے میں ہوتی تھی کہ اگر ذمہ داری کسی دوسرے پر ہے تو سخت سے سخت تجاویز یا احکامات ہوں اگر ذمہ داری اپنے اوپر آئے تو پھر بہت پس وپیش کے بعد قدم اٹھایا جائے۔

اسی دوران میں سرکار میں حاضری ہوئی۔ اعلیٰ حضرت قدر نا برہم تھے میں نے عرض کیا کہ اعلیٰ حضرت کی اطلاعات صحیح نہیں تھیں روزنامچہ کے الفاظ یہ ہیں "گفتگو خاصی گرم رہی یہاں تک نوبت پہونچی کہ" نواب صاحب میں نہیں چاہتا کہ جب آپ ڈیڑھ سال کے بعد جائیں تو میرے اور آپ کے تعلقات دوستانہ ویسے باقی نہ رہیں جو یہاں آنے سے پہلے تھے۔ میں نے بہ ادب عرض کیا کہ میری خواہش بھی یہی ہے۔ پھر دوسرے انتظامی معاملات پر گفتگو ہوتی رہی۔

عرضداشت کے جواب میں حسب ذیل نیم سرکاری آئی۔

۷ صفر المظفر ۱۳۶۴ھ

رائم

خدمت شریف عالی جناب نواب سر محمد احمد سعید خاں بہادر صدر اعظم

آپ کو تحریر کرنے کے لئے سرکار کا جو حکم ہوا ہے وہ حسب ذیل ہے۔
کونسل کی انگریزی عرضداشت مورخہ ۲۲ جنوری ۱۹۴۹ء کو میں نے بغور دیکھا اور جس طرز میں لکھی گئی ہے اُس کا جواب میرے ہاں صرف یہی ہے کہ ایسے امور سے خائف ہو کر اپنے قطعی خیالات کو بدل نہیں سکتا اور یہ مسئلہ وفاداری ملک و مالک کا نہیں ہے بلکہ صرف طرز کارروائی کونسل سے متعلق ہے اور اب سے نہیں بلکہ چند سال قبل سے یہ ہی ہے۔ (جس کے ساتھ برٹش ریزیڈنٹ کو بھی اتفاق ہے) کہ حالات زمانہ بدل جانے سے کونسل کو ازسرِ تشکیل دینا ضروری ہے۔ چنانچہ اگر جنگ نہ چھڑ جاتی یا جلد ختم ہو جاتی تو تشکیل کونسل کو التوا میں نہ رکھا جاتا تاہم اب بھی میرے زیرِ غور یہ ہی مسئلہ ہے کہ کونسل میں ایسے اشخاص شریک ہوں علاوہ رئیس، پبلک یا رعایا برایا کو بھی اطمینان ہو سکے اور یہ اس وجہ سے نہیں ہے کہ تقرر ممبران کونسل کا مسئلہ بالکلیہ رئیس کے صوابدید پر نہیں ہے بلکہ اس میں دوسرے فریق کی بھی شرکت ہے اور یہ پوئنٹ بھی ایک حد تک درست ہے۔ اور میں نے جو کچھ دفتر پیشی کے مراسلوں میں لکھا ہے تو وہ من گھڑت قصوں کو نہیں بیان کیا تھا بلکہ ان میں صداقت بھی موجود تھی۔ بہرحال میرا فرض بحیثیت حکمراں یہ ہے کہ حالات زمانہ کو دیکھ کر وقتاً فوقتاً ایسے امور میں ردّ و بدل کرتا رہوں اور یہ میرا (PREROGATIVE) ایسا ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ آخر میں اس قدر اور کہہ دینا چاہتا ہوں کہ کونسل کی وفاداری پر مجھے شبہ نہیں ہے مگر ہے تو دوسرے امور پر جس کا ذکر مراسلوں میں موجود ہے یعنی اس کے بعد یہ قصّہ ختم ہو گیا۔

۵ ؍اپریل ۱۹۴۲ء۔ اسی دوران میں ڈچپلی مسجد کا واقعہ پیش آیا جس کی انتہا اس پر ہوئی کہ حیدرآباد کے تین ہزار مسلمانوں نے آکر میرے رہائشی مکان میں آگ لگا دی یہ کیوں ہوا اور اس کی تہہ میں کس کا ہاتھ کارفرما تھا۔

میں یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن حیرت ضرور ہوئی اور اب تک ہے میرے تعلقات مسلمانوں سے بُرے نہ تھے بلکہ سر مرزا اسماعیل کے آنے کو وہاں کے مسلمان ناپسند کرتے تھے اور یہ چاہتے تھے کہ میں ہی رہوں۔ مسٹر جناح نے خود آکر سر مرزا کے تقرر کی مخالفت کی تھی جیسا کہ سر مرزا نے اپنی خود نوشت میں لکھا ہے۔ حیدر آباد سے تیس چالیس میل کے فاصلہ پر جذام کے مریضوں کا ایک شفاخانہ ہے اس گاؤں کا نام ڈچپلی ہے یہ شفاخانہ امریکن مشن کا ہے جنہیں کسی نظام سابق نے یہ زمین دی تھی۔ میں نے بھی ایک بار اسے دیکھا یہ مریضوں کی بہت خدمت کرتے تھے اور بے تکلف مریضوں کے ساتھ رہتے تھے۔ یہاں نماز کے واسطے ایک چبوترے کی اجازت بھی مشن والوں نے دیدی۔ میں نے اس چبوترے کو دیکھا تھا مسلمانوں نے وہاں مسجد بنانے کا ارادہ کیا اور مشن کے لوگوں نے مزاحمت کی مریضوں نے حیدر آباد کے مسلمانوں کو مشتعل کرنا شروع کیا ایک نیم سرکاری کے ذریعہ سے نظام نے بھی اس طرف حکومت کو بہمی کے ساتھ متوجہ کیا۔ میں نے شفاخانہ کے منتظمین اور اتحاد المسلمین کے لوگوں سے مشورہ کرکے یہ طے کردیا کہ مسجد کی تعمیر حکومت کرائے گی صرف جگہ کا تعین باقی تھا حکومت کے اس فیصلہ کے بعد میرے خیال میں کوئی اہمیت باقی نہیں رہی تھی۔ اُسی زمانہ میں ہز ہائنس آغا خاں مرحوم ہندوستان آئے تھے اور اُن کی سالگرہ اُن کے معتقدین نے اس طرح منائی تھی کہ اُنہیں ہیروں میں تولا جائے۔ چنانچہ منظر عام پر چھوٹے چھوٹے سربمہر کے تکیوں سے انہیں تولا گیا میں بھی اس تقریب میں شرکت کے واسطے بمبئی گیا مجھے ۱۳ کو واپس آنا تھا مگر ۱۴ مارچ کو واپس ہوا۔ آکر معلوم ہوا کہ حیدر آباد میں شورش بہت زیادہ ہوگئی اور ۱۳ تاریخ کو مظاہرہ کرنے لوگ اسٹیشن پر آئے تھے مگر میں بمبئی سے واپس نہ آسکا تھا۔

معین نواز جنگ میرے پاس آئے مجھ سے کہا کہ کل مسلمانوں کا جلسہ ہونے والا ہے اور عبدالرحمٰن ایڈیٹر اخبار وقت جو کہ مجلس عاملہ کے صدر ہیں مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ معین نواز جنگ خود بھی اتحاد المسلمین کے حامی تھے۔ میں نے اُن سے کہا کہ صبح کو عبدالرحمٰن مجھ سے مل لیں اب تو شام ہوگئی ہے اور اُن سے کہدیں کہ جلسہ کرنے کی ضرورت نہیں گورنمنٹ نے معاملہ طے کر دیا ہے اور کل اتحاد کے نمائندے۔ ڈیچیلی کے شفاخانہ کے مہتمم اور عیسائیوں کے نمائندے بشپ مِنڈل میرے پاس آئے ہیں۔ اب جلسے کی ضرورت نہیں ہے کل اعلان ہو جائے گا۔ معین نواز جنگ نے یہ یاد نہیں کہ خود آکر کہا یا پیام بھیجا کہ چونکہ جلسہ کا اعلان ہو چکا ہے اس واسطے ملتوی کرنا تو ممکن نہیں البتہ اس کا انتظام کر دیا ہے کہ جلسہ محض رسمی ہوگا جسے حکومت کے فیصلہ کی طرف اشارہ کر کے ختم کر دیا جائے گا۔

صبح کو مسٹر گرگسن اور دیگر ممبران کمیٹی گفتگو کر رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ عبدالرحمان معہ ایک بڑے مجمع کے شاہ منزل آرہے ہیں۔ چونکہ میں مطمئن تھا کہ مجمع کو بتایا گیا ہے کہ تصفیہ حکومت نے مسجد کی تعمیر کے متعلق کر دیا ہے پولیس سے کہدیا گیا کہ روکنے کی ضرورت نہیں اور یہی ہدایت شاہ منزل کی پولیس اور فوج کے پہرہ داروں کو کر دی گئی۔ عبدالرحمان آئے اور گفتگو میں شریک ہو گئے اور فیصلہ سے مطمئن ہو گئے۔ اُن کے ساتھ اُن کے چار ساتھی بھی تھے امام بیگ رونق نے عبدالرحمان سے کہا کہ وہ مجمع کو جا کر خوشخبری سُنا دیں اوّل تو عبدالرحمان نے یہ کہا کہ تصفیہ جب تک تحریر نہ ہو جائے اعلان بیکار ہے لیکن کچھ ہی دیر کے بعد وہ مجمع کو اطلاع دینے گئے جوں ہی وہ مجمع کے سامنے پہونچے توڑ پھوڑ آگ لگانا شروع ہو گیا۔ لوگوں نے مجھ سے خواہش کی کہ میں خود

اس تصفیہ سے انہیں مطلع کروں۔ میں نے تقریر کی مگر کوئی اثر نہ ہوا اور میرے رہائشی مکان کے ساتھ بھی توڑ پھوڑ اور آتش زنی شروع ہوگئی گویا عبدالرحمان کا مجمع کے سامنے جانا اس بات کا اشارہ تھا کہ آتش زنی اور توڑ پھوڑ کی جائے۔ گو مجمع میں لاٹھی۔ بلّم اور تلوار بھی بعض لوگوں کے پاس تھے مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جانی یا جسمانی ایذا پہونچانا مقصود نہ تھا۔ مجھ پر یا میرے متعلقین پر کوئی حملہ نہیں ہوا۔ گویا پروگرام میں آتش زنی اور دوسری قیمتی اشیاء کو برباد کرنا تھا۔ میں مع متعلقین مکان سے نکل کر کاظم یار جنگ کے یہاں موٹر سے چلا گیا۔ جب کاظم یار جنگ سے یہ واقعہ کہا تو بے ساختہ ان کی زبان سے یہ نکلا "ایں مظاہرہ تو گرگسن کے ہاں ہونے کی خبر تھی"۔ گرگسن کے ہاں بھی آتش زنی ہوئی یہ مجمع شاہ منزل نے بعد گرگسن کے ہاں پہونچا۔ کاظم یار جنگ کے اس فقرہ سے ظاہر ہو گیا کہ انہیں اس مظاہرہ کی خبر تھی اور حکومت کو کوئی اطلاع نہیں دی گئی۔

میں شام کو برابر کے مکان میں جو میرا مہمان خانہ تھا آ گیا اور کابینہ کا جلسہ ہوا اس واقعہ پر غور کیا گیا۔ اس مسجد کے متعلق جو مجلس عاملہ بنی ہوئی تھی اُسے خلاف قانون قرار دیا گیا اور جو لوگ آتش زنی کے مجمع میں شریک تھے اُن کے قائدین کے خلاف عدالتی کارروائی کا حکم دیا گیا۔

دوسرے روز صبح کو ہوش بلگرامی (ہوش یار جنگ) حضور نظام کا پیام لائے جس میں اعلیٰ حضرت نے اس واقعہ پر اظہار افسوس کیا تھا اور خاطیوں کے خلاف اظہار ناخوشی کیا تھا۔ ہوش نے راز کے طور پر یہ بھی کہا کہ "اس پردہ زنگاری میں خود بدولت کا ہاتھ تھا۔ دوسرے یا تیسرے روز عثمان ساگر کے بنگلہ پر ایک ڈنر شاید علی یاور

جنگ نے دیا تھا۔ جس میں ریزیڈنٹ سر آرتھر لوڈین بھی تھے۔ اُن کے ریزیڈنسی پولیس کی اطلاعات بھی ایسی تھیں جس سے کہ یہی پتہ چلتا تھا۔
۱۶ مارچ کو کاظم یار جنگ آئے وہ کہتے تھے کہ اگر گرگسن کو اعلیٰ حضرت کی خواہش کے مطابق علیحدہ کر دیا ہوتا تو نہ مسلمانوں میں شورش ہوتی اور نہ سرکار برہم ہوتی۔

بہرحال اب جبکہ نظام مرحوم اس دُنیا میں نہیں ہیں۔ میں کسی بات کو اُن کے خلاف یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا اور ابھی حال میں میرے ایک معتمد علیہ جن کی صداقت اور وفاداری پر مجھے اعتماد رہا ہے۔ اشفاق احمد صاحب نے مجھ سے کہا کہ پولیس ایکشن کے بعد جبکہ نظام مرحوم حکمراں نہیں رہے تھے تو انہیں گھنٹوں حاضری کا موقعہ ملتا تھا نظام مرحوم نے اُن سے خود یہ کہا کہ یہ شہرت غلط تھی کہ شاہ منزل کا یہ واقعہ اُن کے ایما سے ہوا۔

میں نے اپنا استعفٰی پیش کیا مگر جواب خلاف توقع نفی میں آیا وجہ یہ بیان کی گئی کہ چونکہ کیبنٹ ڈیلیگیشن آنے والا ہے مجھے سبکدوش نہیں کیا جا سکتا۔

اس آتش زنی کے واقعہ سے جو مالی نقصان ہوا وہ تو ہوا ہی۔ ایسے نقصانات ہوتے بھی رہتے ہیں لیکن بعض ایسی چیزیں ضائع ہوئیں کہ جن کا بدل نہیں ہو سکتا اُن میں دو چیزیں تھیں جن کا مجھے افسوس رہا۔ ایک تو لارڈ بیڈن پاؤل کی رنگین تصویر تھی جو اُنہوں نے مجھے خود دی تھی جبکہ وہ ہندوستان آل انڈیا جمہوری کی شرکت کے واسطے آئے تھے یہ ایک ایسے شخص کی یادگار تھی جس کی تحریک بوائے اسکاؤٹ آج دُنیا کے تمام مہذب ممالک میں پھیلی ہوئی ہے اور (لارڈ بیڈن پاؤل کا احترام) دُنیا کے نوعمر کرتے ہیں۔ دوسرے میری گورنری اور رہوم ممبری

کے تقرر کے احکامات یعنی (WARRANT OF APPOINTMENT)
تھے جن کو بادشاہ کے دستخطوں سے جاری کیا جاتا تھا۔ ایسی چیزوں کی قیمت
جن سے پرانی یادیں منسلک ہوں مادی اشیاء کی صورت میں نہیں ہوسکتی
ان کی قدر و قیمت جذبات پر منحصر ہوتی ہے اور جذبات وجدانی کیفیت
ہے مادی اشیاء سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ ملک و مال یا زر و جواہر سے
جذبات کی اُجڑی دنیا نہیں بسائی جاسکتی۔ بقول سعدی۔

گر صد ہزار لعل و گوہر ہمی دہی چہ سود
دل را شکستئی نہ کہ گوہر شکستی

کیبنٹ ڈیلیگیشن ہفتہ عشرہ کے بعد ہی آگیا۔ لارڈ مانکٹن اور دوسرے
مشیر کار کے ساتھ اُن سے ملاقات ہوئی اور حیدرآباد کی خواہشات
کے متعلق برار وغیرہ اور سیاسی مستقبل آزاد ہندوستان میں زیر بحث رہا
جس پر ایک نوٹ بھی دیا گیا۔

میں نے ایک عرضداشت مورخہ ۲۶ جمادی الثانی ۱۳۶۵ھ پیش
کی تاکہ مجھے سبکدوشی جلد از جلد مل جائے۔ بعض کاغذات صغیر صاحب
مرحوم کے آتشزدگی سے بچ گئے اس عرضداشت کی نقل مل گئی۔
جو حسب ذیل ہے۔

عالیجاہا۔

فرمان عطوفت نشان (راز) مرقومہ ۲۴ ربیع الثانی ۱۳۶۵ھ کے
جواب میں فدوی جاں نثار نے حضرت ظل سبحانی کی بارگاہ عالی میں ۲۶ ربیع الثانی سن دوران کو دہلی سے جو معروضہ ادب پیش کرنے کی عزت حاصل
کی تھی اس میں منجملہ دوسرے امور کے منشاء خسروی کی تعمیل میں اسوقت
رخصت مستحقہ سے استفادہ کا ارادہ ترک کرنے کی جانب بھی اشارہ کیا
گیا تھا لیکن کیبنٹ ڈیلیگیشن کے فیصلہ کے اعلان کے بعد حالات بدل

گئے ہیں اور ان تبدیل شدہ حالات کی موجودگی میں فدوی کے نزدیک یہ بڑی فرض ناشناسی ہوگی اگر یہ عرض نہ کرے کہ اس کے رخصت پر جانے کے پروگرام میں تبدیلی ضروری ہے۔

کیبنٹ ڈیلیگیشن اپنا مفروضہ فرض کا ایک باب ختم کر چکا اب مستقبل کی تعمیر کا کام وائسرائے اور مجلس دستور ساز یعنی کانسٹی ٹیوشن اسمبلی کے ہاتھ میں ہے۔

اس دولت ابد مدت کے مطالبات کا جہاں تک تعلق ہے وہ بحمداللہ حضرت پیر و مرشد کی رہنمائی میں صاف و واضح اور غیر مبہم پیرایہ میں وائسرائے اور ڈیلیگیشن کے روبرو باضابطہ طریقہ سے پیش کر دیئے گئے ہیں۔ فدوی کو اس باب میں تفصیلات عرض کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ دہلی اور شملہ کے قیام کے زمانہ میں جو کچھ ہوا وہ حضرت جہاں پناہی کے ضمیر منیر پر خوب روشن ہے۔ اس ضمن میں آئندہ جو کچھ ہوگا وہ طویل گفت و شنید یعنی (NEGOTIATION) کے ذریعہ سے طے پائیگا اور عجب نہیں کہ اس فرض کے لئے ڈیڑھ دو ماہ بعد تبادلہ خیالات اور گفت و شنید کا سلسلہ از سر نو شروع ہو۔

گفت و شنید کے اس نئے دور کی اہمیت کے متعلق جس پر ہمارے مطالبات کا مدار ہے جاں نثار کو کسی قسم کا اشارہ کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ اس حقیقت کو ذات ہمایونی سے بہتر کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ اب جبکہ نئے پریسیڈنٹ کونسل کے آنے میں صرف تین ماہ باقی رہ گئے ہیں تو فدوی جاں نثار بصد ادب یہ عرض کرنے کی اجازت چاہے گا کہ مفاد ریاست کے مدنظر اسے یکم جولائی سے رخصت مستحقہ سے استفادہ کرنے اور اس کے بعد پریسیڈنٹ کونسل کی صدارت سے سبکدوش ہونے کی اجازت عطا فرمائی جائے۔

رسم است کہ مالکان تحریر۔ آزاد کنند بندۂ پیر۔
پانچ سال تک حلقہ بگوش کی نعمت سے بہرہ اندوز ہونے کے بعد
اب کچھ دن آرام کی شدید ضرورت کے احساس کے باوجود اگر ان
پچھلے دو ماہ میں حالات میں کوئی خاص تبدیلی پیدا نہ ہوتی تو فدوی کے
لئے آخیر اگست ۱۹۴۶ء تک پورا زمانہ ملازمت حیدرآباد میں بسر کرنا
عین باعث عزت ہوتا لیکن گفت و شنید کے آنے والے نئے دور
میں نئے حالات کا پوری طرح مقابلہ کرنے اور تاج آصفی کی خدمت
انجام دینے کی غرض سے اپنے آپ کو تیار کرنے کے لئے۔ فدوی جاں نثار
کی رائے ناقص میں یہ انتہائی ضروری ہے کہ نئے پرائم منسٹر گفت و
شنید کا دوسرا سلسلہ شروع ہونے سے اتنے پہلے اپنی خدمت کا جائزہ
لے لیں کہ وہ دوران میں ریاست کے داخلی معاملات اور خارجی مسائل
دونوں کا اچھی طرح مطالعہ کرنے کے بعد ان پر پوری طرح عبور حاصل
کر لیں اور اس طرح اپنے آپ کو ان نئے حالات میں اپنی اہم ذمہ داریوں
کو پوری طرح عہدہ برآ ہونے کے قابل بنا سکیں تاکہ گفت شنید کے
نئے دور میں پالیسی کا تسلسل اور یکسانیت قایم رہ سکے۔
بہ وجوہ بالا فدوی جاں نثار کی ناقص رائے میں اب اس کے
سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ قابل غور کے بعد بارگاہ جہاں پناہی میں یہ
معروضہ پیش کرنے کی عزت حاصل کرے۔ جاں نثار کو امید ہے کہ
اس ریاست ابد مدت کے مفاد کے پیش نظر اس کے معروضات
کو شرف پذیرائی اور درخواست کو عزت قبول عطا فرمائی جائیگی۔
الٰہی آفتاب دولت و اقبال ہمایونی تا دور شمس و قمر تاباں و درخشاں باد۔

زیادہ حد ادب   فدوی جاں نثار۔ سعید الملک

۲۶ جمادی الثانی سنہ ۱۳۶۵ھ

اس درخواست کو نظام مرحوم نے قبول فرما لیا اور حسب ذیل مراسلہ (ثانی) مورخہ ۱۷ رجب موصول ہوا۔

سعید الملک المخاطب نواب صاحب چھتاری۔

جیسا کہ میں نے ۴ رجب دوران انٹرویو میں کہا تھا کہ سر مرزا اسمٰعیل بعض مجبوریوں کی وجہ سے یکم جولائی کو یہاں آکر خدمت کا جائزہ حاصل نہیں کر سکتے لہذا وہ یکم اگست کو آ سکتے ہیں (نہ کہ یکم دسمبر کو جیسا کہ خیال کیا گیا تھا درمیانی حالات بدل جانے سے قبل) ایسی حالت میں اگر آپ اواخر (یعنی چوتھے ہفتہ جولائی) تک یہاں نہیں ٹھہر سکتے ہیں تو آپ کو ماہ جولائی کے اوائل یا اواخر سے جیسا کہ مناسب سمجھا جائے میں سبکدوش از خدمت ہونے کی اجازت دیتا ہوں۔ البتہ جائزہ کا قطعی تصفیہ رزیڈنٹ صاحب او ٹی سے اواخر جون میں آنے کے بعد ہوگا۔ گو سر مرزا اسمٰعیل کا تقرر قطعی طور پر قرار پا چکا ہے اور اعلان ماہ جولائی میں ہوگا۔

دیگر۔ آپ سبکدوش از خدمت ہونے کے بعد بھی اگر کوئی اہم مسائل ریاست حیدرآباد کے سود و بہبود سے متعلق پیش آئے تو میں ضرورت محسوس کرنے پر آپ کو طلب کر کے گفتگو کروں گا کہ آپ نے پانچ سال تک یہاں اہم خدمت انجام دی ہے جس کو میں قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ اس کے سوا ہر سال یکم رجب کے سالانہ ڈنر میں شرکت کے لئے مدعو کروں گا بہر حال جو حالات کہ اس وقت قائم ہیں میرے اور آپ کے درمیان دوستانہ طریقہ پر اس میں فرق نہ آئے گا بلکہ بدستور قائم رہیں گے۔

ف۔ جس صورت میں اگر برار واپس مل جائے تو گورنری کی خدمت

پر سب سے اوّل اس کا آفر آپ کو دونگا تاکہ دوسری شکل سے آپ
سلطنت آصف جاہی کی خدمت انجام دیں اور اس کام کے لئے آپ
سے بہتر کوئی اور شخص مجھ کو نہیں ملے گا و بس

آصف سابع

حضور نظام نے یہ بھی پیام بھیجا کہ مکان کی آتشزدگی کے سلسلہ
میں میرا جو نقصان ہوا ہے اسے بتا یا جائے تاکہ ریاست اس کی
ادائیگی کر دے۔

میں نے کوئی مطالبہ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ لیکن اعلیٰ حضرت نے
خود ڈیڑھ لاکھ روپیہ مجھے اور پچھتر ہزار گرگسن کو دیا۔

صحیح تاریخ یاد نہیں لیکن ۱۴ یا ۱۵ کو میں حیدر آباد سے روانہ ہوا۔
چلنے سے پہلے ان تمام مقدمات کو جو میرے مکان کی آتشزنی کے
سلسلہ میں چلائے گئے تھے اُن کی واپسی کا حکم دیدیا تاکہ ملزمان رہا
کر دئے جائیں۔

حیدر آباد کی تہذیب اور کلچر

حیدر آباد کی تہذیب - آداب مجلس - آداب دربار اور زرق برق تہذیب
مغلیہ سلطنت کی تہذیب و تمدن کی ایک دھندلی سی تصویر تھی اعلیٰ حضرت
میر عثمان علی خاں مرحوم تو دربار داری کے شائق نہ تھے لیکن ان کے والد
مرحوم نظام میر محبوب علی خاں کے واقعات اور کہانیاں لوگ حیدر آباد
میں مزے لے لیکر بہت محبت سے بیان کرتے تھے طبعاً بڑے سخی اور بلند نظر

حکمراں تھے لوگ بغیر امتیاز مذہب و ملت انہیں بڑے ادب اور محبت سے یاد کرتے تھے۔ اُن کے زمانہ کے واقعات "الف لیلیٰ" کی کہانیاں معلوم ہوتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بار وہ گھوڑے پر سوار ہوئے ہاتھ میں ایک انگشتری تھی اور شاید ڈھیلی تھی جب نظام نے باگیں ہاتھ میں لیں تو انگوٹھی انگلی سے نکل کر زمین پر گر پڑی سائیس نے بصد ادب اٹھا کر پیش کی تو نظام نے کہا "زمین پر گری چیز پیش کرتا ہے"۔ اور ہاتھ کا اشارہ کیا جس کے معنی یہ تھے کہ سائیس کو عطا کر دی گئی۔

کہا جاتا ہے کہ حیدرآباد میں نمائش تھی۔ نظام مرحوم کے جانے کی خبر تھی اور برابر انتظار ہو رہا تھا۔ ایک روز یکایک کسی چھوٹے دروازہ سے فلک نما محل سے برآمد ہو کر تنہا سڑک پر آ گئے اور تانگہ والے سے جو سڑک پر ملا کہا کہ نمائش لے چل جب نمائش گاہ کے قریب آ گئے تو پولیس نے تانگہ روکا۔ چونکہ حضور نظام کے آنے کی خبر تھی۔ نظام اُتر کر افسران کے سامنے آ گئے۔ ساری نمائش میں ہل چل مچ گئی۔ نظام نے متعینہ افسر کو حکم دیا کہ تانگے کو اپنے ساتھ لے جاؤ اور خزانہ سے نظام کی ہموزن چاندی تانگے والے کو دلوادو۔

فلک نما محل کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وقارالامرا صدر اعظم وقت نے بنایا تھا اور نظام محبوب علی خاں مرحوم سے یہ التجا کی کہ وہ مع بیگمات مہمان ہو کر سرفراز فرمائیں کچھ روز کے بعد نظام آئے۔ ایک ہفتہ قیام فرمایا۔ اور وقارالامرا سے چلتے وقت کہا کہ یہ بہت اچھا محل ہے ہمیں پسند آیا۔ وقارالامرا نے فوراً نذر پیش کی جس کے معنی یہ تھے کہ یہ محل نذر کرتا ہوں۔ اس زمانہ کے دربار کے امرا اتنے بلند حوصلہ تھے۔ مجھے یقین ہے کہ

نظام مرحوم نے اس کی قیمت ادا کر دی ہوگی مگر وقار الامرا کی حوصلہ مندی اور اپنے آقا کے ساتھ عقیدت قابل داد ہے۔ میں نے اس محل بارہا دیکھا ہے۔ ویسرائے یا کوئی شہزادہ آتا تھا تو اسی محل میں قیام ہوتا۔ محل وقوع ایک پہاڑی پر ہے جہاں سے پورے حیدرآباد کا نظارہ پیش نظر رہتا ہے اس کی آرائش پرانی تصاویر اور قیمتی اشیاء سے کی گئی ہے۔ میں نے اس میں ایک چھوٹا سا طوطا دیکھا جو ایک شیشہ کے بکس میں رکھا تھا وہ زمرد کے ٹکڑوں سے بنایا گیا تھا وہ پوچ و آنکھیں یاقوت کی تھیں۔ ریزیار جنگ مرحوم نے وہ کمرہ بھی دکھایا جہاں نظام مرحوم پر فالج کا حملہ ہوا اور باعث انتقال ہوا۔ اُن کی سخاوت اور داد و دہش کے قصے حیدرآباد میں بہت مشہور تھے۔ مجھ سے خود نظام میر عثمان علی خاں مرحوم نے کہا کہ جب اُن کے والد کا انتقال ہوا ہے تو صرف خاص پر ریاست کا پینتالیس لاکھ قرضہ تھا۔

عموماً اہلِ دربار حکمراں کی ہر بات پر آمنّا و صدقنا کہتے ہیں لیکن اُن کے درباریوں میں ایسے کردار اور بصیرت کے لوگ بھی تھے جیسے عماد الملک۔ ایک بار نظام محبوب علی خاں مرحوم ٹہل رہے تھے اور درباری دست بستہ کھڑے تھے (نظام کے سامنے کوئی بغیر دستار کے نہیں جاتا تھا اور جب تک اجازت نہ دیں کھڑا رہتا تھا البتہ مہمان اس آداب سے مستثنیٰ تھے) نظام مرحوم نے فرمایا کہ ہماری رعایا ہمارے متعلق کیا خیال کرتی ہے درباریوں نے تعریف شروع کر دی عماد الملک چپ کھڑے رہے نظام نے آخر اُن کی طرف توجہ کی اور کہا کہ آپ کچھ نہیں کہتے اُنہوں نے کہا کہ حضور کی رعایا یہ کہتی ہے کہ ہمارا مالک بالکل بے خبر

ہے اور انتظام ریاست کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا نظام برہم ہو گئے اور سامنے سے ہٹ جانے کا حکم دیا یہ سلام کرکے چلے آئے اور گھر آ کر اسباب باندھنا شروع کر دیا۔ کچھ دیر کے بعد ایک خادم آیا اور دوسرے روز اُن کی حاضری کا حکم سُنایا۔ یہ حاضر ہوئے نظام اُنہیں مولوی صاحب کہا کرتے تھے نظام نے کہا کہ وہ اُن کی صاف گوئی کی قدر کرتے ہیں مگر ایسی بات مجمع میں نہیں کہنی چاہیئے عماد الملک نے کہا کہ سرکار ایسا سوال بھی مجمع میں نہ فرمائیں۔

اُس زمانے میں اس کردار کے لوگ بھی دربار میں تھے۔

اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں مرحوم جن کے زمانہ میں مجھے حیدر آباد کی خدمت کا موقع ملا۔ بہت سادہ مزاج اور کفایت شعار تھے لیکن اُن کی کفایت شعاری اور سادہ مزاجی فقط اُن کے ذاتی بود و باش اور رہن سہن سے متعلق تھی۔ تصویر کا دوسرا رخ یہ بھی تھا کہ سر راس مسعود مرحوم کے زمانہ میں مسلم یونیورسٹی کو دس لاکھ دئے۔ میرے زمانہ میں جب ڈاکٹر سر ضیاء الدین اور پروفیسر ہادی حسن مرحومین حیدر آباد میڈیکل کالج کے سلسلہ میں آئے تو میری عرضداشت پر دس لاکھ کا عطیہ منظور فرمایا۔ بنارس یونیورسٹی کو پانچ لاکھ کا عطیہ منظور کیا گیا۔ اگر کسی ملازم کا انتقال ادائے فرض کے سلسلہ میں کسی وجہ سے ہو جاتا تو میری عرضداشت میں قانون مجریہ کے مطابق نصف پنشن کی سفارش مرحوم ملازم کی بیوہ کے متعلق ہوتی مگر سرکار ہمیشہ پوری مستحقہ پنشن جو اس ملازم کی ہوتی منظور فرماتے معترضین اُن کی زندگی کے ایک ہی پہلو کو دیکھتے تھے۔

میرے خیال میں اہل دول اگر ذاتی عیش و آرام اور شان و شوکت

پر کم خرچ کریں اور مخلوق کی خدمت پر زیادہ۔ تو یہ ایک اچھی صفت ہے انقلاب زمانہ نے یہ ثابت کر دیا کہ اگر نظام مرحوم کے ذاتی خزانہ میں روپیہ نہ ہوتا اور مختلف ٹرسٹوں کو قایم نہ کیا ہوتا تو آج چھ کروڑ کا خیراتی ٹرسٹ کیسے بنتا جس سے سینکڑوں ادارے اور اشخاص مستفید ہوتے ہیں اور آصفی خاندان کس طرح زندگی بسر کرتا۔ جن کے الگ الگ ٹرسٹ ہیں۔

امراء کا معیار زندگی بہت بلند تھا۔ برٹش انڈیا کے مقابلے میں ہاں کا معیار زندگی عام طور پر بھی اونچا تھا۔ وجہ ظاہر ہے کہ انکم ٹیکس نہ تھا۔ زمین پر لگان برٹش انڈیا سے نسبتاً کم تھا۔ امراء پائیگاہ پر کوئی مالگذاری نہ تھی۔ اُن کی جاگیریں ٹیکس یا مالگذاری سے مستثنیٰ تھیں جہاں تک مجھے یاد ہے نواب ظہیر یار جنگ مرحوم جو آخری امیر آسمان جاہی پائیگاہ کے تھے اُن کی آمدنی بائیس لاکھ کے قریب تھی۔

امراء کے مکانوں پر ملازمان اور متعلقین وہی آداب برتتے تھے جو نظام کے ہاں ملحوظ رکھے جاتے دستار اور بکلوس لگا کر جاگیردار کے سامنے آتے تھے۔ ان گھرانوں میں پرانے زمانہ کی چیزیں اور شاہان سلف کے عطیات قابل دید تھے۔ سالار جنگ مرحوم کو خاص طور پر ایسی چیزوں کا شوق تھا اور اب حیدرآباد میں سالار جنگ میوزیم میں ان چیزوں میں سے بیشتر موجود ہیں۔ ایک روز سالار جنگ مرحوم نے خود مجھے ان چیزوں کو دکھایا تھا بعض اشیاء میں نے میوزیم میں نہیں پائے مثلاً اُن کے پاس اچکن کے سات بٹن تھے اور ہر بٹن ایک ایک الماس کا تھا نورجہاں کا خنجر تھا اور دوسری بہت سی چیزیں قابل دید تھیں مجھے ایک سنگ مرمر کا قدآدم اسٹیچو بہت پسند تھا یہ ایک خاتون نقاب پوش کا اسٹیچو ہے اور کمال یہ ہے کہ نقاب میں سے صورت کی جھلک نظر آتی ہے۔

وہاں فرق مراتب یعنی (PROTOCAL) کا بڑا احساس تھا۔

جب پہلی بار حیدرآباد سے واپسی کی کہانی ختم ہوگئی تو میرا خیال یہ تھا کہ اب آئندہ شاید نہ لکھ سکوں گا۔ لیکن حیات مستعار کے کاٹنے کے لئے کوئی شغل ہونا چاہیے۔ فکر معاش اور یاد رفتگان ہی مشاغل باقی رہ گئے ہیں۔ ذکر بتاں سے تو کوئی دلچسپی رہی نہیں بیتے ہوئے دنوں کی یاد کو پھر تازہ کر رہا ہوں۔

حیدرآباد کی کہانی افسوسناک ہے اور پر حسرت بھی۔ حسرت اس پر ہے کہ جو کچھ اور جتنا حیدرآباد کو بچا لینا ممکن تھا وہ بھی نہ ہو سکا میرا خیال یہ ہرگز نہیں کہ حیدرآباد اسی حیثیت سے قائم رہ سکتا تھا۔ جمہوریت کا سیلاب جب پورے ہندوستان میں آگیا تو حیدرآباد میں شخصی حکومت اور اقلیت کی حکمرانی کیسے ممکن تھی۔ لیکن جو ذلت۔ خونریزی اور تباہی ہوئی وہ نہ ہوتی۔ وعدے تو بہت سے کئے جا رہے تھے مگر جب دوسرے والیان ملک کی کہانی پر نظر ڈالتا ہوں تو یقین ہو جاتا ہے کہ "وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہوگیا" جو وعدے مجھ سے کئے جا رہے تھے وہ بھی زیادہ روز قائم نہ رہتے تاہم جو کچھ ہوتا بتدریج ہوتا اور حیدرآباد کی دنیا پولیس ایکشن کے قیامت خیز دھماکے سے نہ بدلتی۔ ممکن ہے کہ کشمیر کی طرح چند روز کے واسطے حیدرآباد کی بھی مخصوص صورت قائم رہتی۔ لیکن اب تو والیان ملک کے ساتھ وہ عہد و پیمان کہ جو (Constitution) آئین میں درج کرائے گئے تھے۔ ان کے قیام کی بھی کوئی امید نہیں تو پھر کسی سیاسی وعدے پر کیا اعتبار کیا جائے۔ حیدرآباد کی واپسی پر کسی سیاسی کشمکش میں تو میں نے حصہ نہیں لیا لیکن کنارے سے کھڑے ہو کر سیاسی مدوجزر کا تماشہ دیکھتا رہا۔

اس زمانے میں ایک سخت بحرانی کیفیت ہندوستان سے

باشندوں پر طاری تھی - آنے والے واقعات سایہ فگن تھے اور لوگ پرچھائیوں کو دیکھتے تھے - اور گھبراتے تھے - ایک عجیب ہیجان تھا - بلا تفریق مذہب و ملت ہر شخص آنے والے انقلاب کے نتائج کو سمجھنے سے قاصر تھا - برٹش حکومت کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ ہندوستان کو آزادی دینی ناگزیر ہے - میرے خیال میں سب سے زیادہ جس چیز نے انگریز کو مجبور کر دیا وہ ملازمین سرکار اور خاصکر فوج، ہوائی فوج اور دریائی بیڑے کا طرز عمل تھا - فوج کے متعلق تو I.N.A کا طرز عمل اس کا ثبوت تھا کہ فوج کی وفاداری پہ انگریز بھروسہ نہیں کر سکتا - پھر لال قلعہ میں جو مقدمہ چلایا گیا وہ ایک اہم سیاسی غلطی ثابت ہوئی لوگوں کی عام ہمدردیاں انہی فوجی افسران کے ساتھ تھیں جو اس مقدمہ میں ماخوذ تھے - جنرل شاہ نواز اور ان کے ساتھی فوجی ہیرو بن گئے تھے اور ان کی ہمدردی میں سخت ایجیٹیشن ہوا - اور گورنمنٹ کو معاف کرنا پڑا دوسری طرف اسی زمانہ میں ہوائی فوج اور دریائی بیڑے کے افسران نے اسٹرائیک کیا مجھے ۱۷ اگست ۴۶ء کی ملاقات میں گورنر یو-پی نے کہا کہ گورنروں کی کانفرنس میں انھوں نے کہا کہ انھیں اپنی پولیس پر بھروسہ ہے لیکن آئندہ کب تک پولیس کی حالت قابل اعتماد رہے گی یہ نہیں کہا جا سکتا ان سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آسام اور بہار کی حکومتوں کو اپنی پولیس پر بھروسہ نہیں رہا تھا -

دوسری طرف ولایت میں پارلیمنٹ کے انتخاب کا نتیجہ بالکل خلاف توقع ہوا - مسٹر چرچل کی پارٹی کو شکست ہوئی باوجود اس کے کہ جنگ میں کامیابی کا سہرا انھیں کے سر پہ تھا مگر برٹش قوم اب شہنشاہی کی پولس سے متنفر ہو گئی تھی - اب وہ امپیریلزم کے خلاف

سکے۔ میرے خیال میں یہ اسباب تھے کہ جو انگریز ہندوستان آزاد کرنے پر مجبور ہوا۔

ہندوستان کے لوگوں کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ کوئی بڑا انقلاب آرہا ہے۔ ہر جماعت ان غیر متعین حالات سے پریشان تھی۔ اور قدرتاً یہ جاننا چاہتی تھی کہ ہندوستان میں آزادی کے بعد کیا انتظام کیا ہوگا۔ دہلی میں جو گفت و شنید ہو رہی تھی اس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ لیگ اور کانگریس کی ملی جلی حکومت ہوگی۔ ہندوستان کی تقسیم سامنے نہ تھی اور مسلمان زیادہ تر لیگ کے زیر اثر تھے اور ظاہر ہے کہ مسلمان یہ سمجھتا تھا ہر گورنمنٹ میں مسلم لیگ اور کانگریس شریک ہونگے اور جداگانہ انتخاب کے ہوتے ہوئے اس کے سوا مسلمان کو چارہ بھی نہ تھا کہ وہ لیگ کے ساتھ جائے۔ کوئی دوسری سیاسی جماعت میدان میں ایسی منظم نہ تھی۔

اس زمانے میں مسٹر جناح نے اس پر اصرار کیا کہ کانگریس اپنے حصے کے ممبروں میں کسی مسلمان کو نہ لے۔ ظاہر ہے کہ جناح کا یہ مطالبہ غیر منصفانہ تھا۔ ہر پارٹی کو اختیار ہے کہ بلا قید مذہب و ملت جس شخص کو چاہیں اپنی حکومت میں لے لیں۔ اس کشمکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم لیگ کی شرکت کے بغیر کانگریس نے حکومت بنائی بنگال۔ بمبئی اور دوسرے مقامات پر خونریز بلوے شروع ہو گئے مجھے اس پر اصرار تھا کہ دونوں پارٹیاں جب تک راضی نہ ہوں پر امن تبدیلی حکومت میں نہ ہو سکے گی۔ دونوں کو ملا کر حکومت بنتے تاکہ ہندو اور مسلمان دونوں ہی مطمئن رہیں۔ مگر لارڈ ویول نے ایک پارٹی کی حکومت بنائی اور مسلم لیگ نے پاس کیا جس کا نتیجہ تمام ملک میں خوں ریزی ہوئی۔ کلکتہ، بمبئی،

مشرقی بنگال، گڈھ مکٹیسر ہر جگہ بیمانہ قتل و غارت شروع ہو گیا۔
جس سے عورت اور بچے بھی نہ بچ سکے۔ اس سے مجھے قلبی تکلیف ہوئی
اور میں نے انگریزی خطابات واپس کئے۔ ہمارے ملک کے بعض
بھائی آج کل مسلمانوں پر یہ الزام دیتے ہیں کہ ملک کی تقسیم کے وہ
ہی تنہا طرفدار ہیں۔ مگر واقعات پر غور کیا جائے کہ حالات کیوں اور
کس طرح بدلتے چلے گئے تو یہ صاف ظاہر ہو جائے گا کہ مسلمان اور
مسلم لیگ کا یہ مطالبہ صرف بھاؤ تاؤ کرنے کے لئے تھا۔ ورنہ انگریزی
حکومت اور ملک کی اکثریت دونوں کی مخالفت کے بعد اس کا
یقین کہ ملک تقسیم ہو جائے گا کیسے ممکن تھا۔ گو میں حیدرآباد سے
وابستہ ہونے کی وجہ سے ہندوستان کی سیاست میں دخیل نہ تھا
اور ۱۹۴۱ء کے بعد میری دلچسپی فقط حیدرآباد کے مستقبل تک محدود
تھی لیکن جب واقعات پر نظر ڈالی جائے اور سچائی کی تلاش مقصود
ہو تو حقیقت صاف طور پر ظاہر ہو جاتی ہے۔ اگر لیگ اور مسٹر جناح
کو یہ یقین ہوتا کہ پاکستان ہی ان کا مطمح نظر اور مقصد ہے تو پھر ۱۶ جو
ن کو کیبنٹ مشن کی تجویز لیگ منظور نہ کرتی مگر لیگ نے منظور کی۔ اگر
جناح کو پاکستان بننے کا یقین ہوتا تو عارضی حکومت میں 5.5.2 کی
کا فارمولا لیگ منظور نہ کرتی اور کچھ روز کے بعد جواہر لال جی کی حکومت
میں شریک نہ ہوتی۔ لیگ نے کیبنٹ مشن کی تجویز مان لی تھی جس کا
مقصد دو (zone) الگ الگ بننے کا تھا۔ اور یہ علاقائی حکومتیں
مرکزی حکومت میں شریک ہوتیں کہ جس میں ڈیفنس۔ خارجہ پالیسی
اور رسل و رسائل کے شعبہ شامل ہوتے۔ مسلم لیگ نے کیبنٹ مشن کی تجویز
کو 6 جون ۱۹۴۶ء کو مان لیا اور کانگریس نے ۶ جولائی کو بظاہر مان
لیا لیکن الفاظ کے معانی اس طرح بیان کئے کہ تجویز بالکل مسخ ہو گئی

مولانا ابوالکلام مرحوم نے اپنی کتاب (India wins Freedom
میں بھی اس کا ذکر کیا ہے اور (H.V. Hodson) نے اپنی کتاب
(The great devide) میں بھی اس کا تذکرہ کیا ہے۔ اس
کتاب کے صفحہ 162 اور 163 کا کچھ حصہ بجنسہ نقل کر رہا ہوں۔
جو بمبئی میں پنڈت جی نے کہا تھا۔

"At the final session of the All India Committee and afterwords at a Press Conference, Pandit Nehru declared that the Congress had not accepted any plan long or short; it had committed itself to participation in the proposed Constituent Assembly, but to no more............

The miss on proviso about proper arrangement for Minorities was a domestic Indian problem "we accept no outsider's interference with it, certainly not the Birtish Government's" asked at the Press Conference whether he meant that the Cabinet Mission Plan could be modified, Nehru replied that the Congress regarded itself as free to change or modify the Plan in the Constituent Assembly as it thought fit."

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسٹر جناح نے اس پر احتجاج کیا اور کہا کہ
کیبنٹ مشن کی تجاویز کو پنڈت جواہر لال نے مسترد کر دیا اور 27 جولائی
کو لیگ کی کونسل کی میٹنگ میں یہ تجویز کیا کہ کانگریس اپنی اکثریت کے
ذریعہ مشن کی تجاویز کو بدلنا چاہتی ہے اور (Constituent
Assembly) میں اپنی اکثریت سے ایسا کرنا چاہتی ہے۔ لہذا مسلم
لیگ نے جو منظوری مشن کی تجاویز کو دی تھی اسے واپس لیتی ہے
اور اس طرح ہندوستان کی اکائی قائم رکھنے کا ایک سنہرا موقع نکل گیا

وائسرائے لارڈ ویول اور وزیر ہند دونوں ان حالات سے پریشان ہوئے اور تجویز یہ پائی کہ لندن بلا کر مسئلہ کو صاف کیا جائے چنانچہ پنڈت جی سردار بلدیو سنگھ جناح اور لیاقت علی خاں لندن گئے اور اس کے بعد وزیر ہند نے 6 دسمبر کو ایک بیان دیا۔ H.V. Hodson نے اپنی کتاب میں وزیر ہند کے اسی بیان کو ان الفاظ میں لکھا ہے۔

"That the Cabinet Missions's view, which had bee confirmed by legal advice, had always been, in effect, that of the Muslim League as to the power of sections to decide by majority vote. This interpretation "must therefore be considered as an essential part of the Scheme of May 16. It should therefore be accepted by all parties to the Constituent Assembly."

آگے چل کر اتنا اور فقرہ بڑھا دیا کہ اگر باوجود اس کے کچھ بتایا گیا ہے۔ اگر (Constituan Assembly) چاہے تو اس بنیادی پائنٹ کا منشا فیڈرل کورٹ کے پاس بھیج کر ان سے معلوم کرے۔ لیکن پنڈت جی نے 5 جنوری ۱۹۴۷ء کو A.I.C.C. کی میٹنگ میں یہ کہا کہ

Such a reference has become purposeless and undesirable owing to the recent announcement made by the British Government.

بہرحال مسلم لیگ اور کانگریس کے ان جھگڑوں کا انجام ملک کی تقسیم اور لاکھوں خاندانوں کی بربادی ہو گیا۔

آنکھیں کہیں ہیں دل ہی نے ہم کو کیا خراب
اور دل کہے ہے آنکھوں نے مجھ کو ڈبو دیا
جھگڑا کسی کا کچھ نہیں اسے وردِ عشق میں
دونوں کی ضد سے خاک میں ہم کو ملا دیا

کانگریس اور مسلم لیگ نے کچھ بھی کہا ہو۔ آج ہندوستان کے مسلمان سے یہ کہنا کہ ۹۰ فی صدی مسلمان نے تقسیم کی موافقت میں رائے دی نہ صرف غلط ہے بلکہ ناممکن ہے۔ آج جو نوعمر مسلمان اکیس ۲۱ یا بائیس ۲۲ برس کے ہیں وہ تو ۱۹۴۶ میں پیدا نہیں ہوئے تھے یا اپنی ماؤں کی گود میں دودھ پیتے تھے۔ آج ان کی تعداد مسلمان مردم شماری کے اعتبار سے بائیس یا اکیس فی صدی ہوگی۔ ان کا کیا قصور اور ان پر کیوں الزام دیا جائے۔ جن مسلمانوں کی ۴۲ سال سے اس وقت کم ہے۔ اس زمانہ میں انھیں رائے دینے کا حق ہی نہ تھا۔ ان کی عمر اکیس سال سے کم تھی۔ ان کی تعداد بھی اکیس یا بائیس فیصدی مسلمانان ہند میں ہوگی۔

اب رہے کانگریسی مسلمان ان کی تعداد بھی ملک میں خاصی تھی کم از کم دس پندرہ فیصدی ان کی تعداد بھی ہوسکتی ہے۔ اس طرح تقریباً 55 فیصدی مسلمان تو ایسے ہیں کہ وہ مسلم لیگ کو رائے دے ہی نہیں سکتے تھے۔

علاوہ بریں ۱۹۴۶ء میں ہر بالغ کو رائے دینے کا حق ہی نہ تھا۔ دس روپیہ کا زمین کا لگان دیتا ہو یا جہاں تک مجھے یاد ہے پچاس روپیہ انکم ٹیکس دیتا ہو۔ یا شاید میٹرک یا مڈل پاس ہو۔ لہذا باقی ماندہ 45 فی صدی میں رائے دینے والوں کی تعداد تو تین چار فیصدی ہوگی۔ اس لئے کہ مسلمان تعلیمی اور اقتصادی دونوں اعتبار سے پس ماندہ

ہیں۔ اور جو اس خیال کے لوگ تھے ان میں سے یقیناً بہت بڑا حصہ
پاکستان چلا گیا۔ اس تفصیل کے بعد ہندوستان کے موجودہ مسلمانوں
کو تقسیم ملک کا ذمہ دار ٹھہرانا ناانصافی کی انتہا ہے۔

میں اپنی کہانی کہتے کہتے سیاسی حالات بیان کرنے لگا۔ مگر سیاسی
معاملات سے کنارہ کشی بھی ممکن نہیں۔ زندگی کے ہر پہلو پر ان کا اثر
پڑتا ہے۔ اور اس زمانے کے سیاسی بحران کا نتیجہ تو سارے ملک
پر اثر انداز تھا۔ میری رائے میں جنگ کے بعد انگریز قوم کچھ اس قدر
تھک گئی تھی کہ وہ یہ چاہتی تھی کہ جس طرح بھی ہو ہندوستان کے
نظم و نسق کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائے۔ دوسری طرف امریکہ
کا دوستانہ دباؤ ہندوستان کی آزادی کے واسطے مجبور کر رہا تھا۔
برٹش حکومت کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ ہندوستان سے ہٹ
جانے کے بعد نہر سویز کے اس طرف اس کا کہیں بھی پاؤں نہ جم سکے گا۔
طاقت جہاں ہاتھ سے نکلی تو پھر نکلتی ہی چلی جاتی ہے۔ ۱۳ر اکتوبر سنہ ۴۶ء
کو میرے ساتھ ایک جانکاہ واقعہ ہوا۔ میرے ماموں زاد بھائی راؤ
عبدالحمید خاں مرحوم کا انتقال ہو گیا۔ مجھے مرحوم سے بہت محبت تھی
خدا مغفرت کرے۔

یو۔ پی کی حکومت نے زمینداری کو ختم کرنے کا قانون بنانا شروع
کیا۔ مجھے اس سے تو اتفاق تھا کہ زمینداری زیادہ روز قائم نہیں رہ سکتی
مگر یو۔ پی کی حکومت نے جس طرح ختم کیا مجھے اس سے اختلاف تھا۔
چونکہ زمیندار پارٹی نے الیکشن میں سوائے سترہ سال کانگریس یا سوراج
پارٹی کا کامیابی سے مقابلہ کیا تھا۔ کانگریس کی اس تجویز میں انتقامی
جذبہ تھا۔ میری یہ تجویز تھی کہ ایک مناسب قیمت تجویز کر دی جائے
اور جو کاشتکار قیمت ادا کر دے اپنی زمین کا مالک ہو جائے۔

میں نے پنڈت گوبند بلب پنتھ سے جو یو۔ پی کے چیف منسٹر تھے یہ کہا مگر انھوں نے نہ مانا اور جواب میں یہ کہا کہ اس کا ذرا بھی اثر نہیں ہوگا۔
جس کا اثر یہ ہوا کہ دیہاتی زندگی کے نظم میں ایک خلا پیدا ہو گیا زمیندار کی جگہ کوئی دوسری طاقت پیدا نہ ہو سکی اور جرائم کی زیادتی ہو گئی اور اب ہر پولیس آفیسر یہ کہتا ہے کہ زمیندار کے ..... ہٹنے سے دیہاتی رقبہ میں قتل اور ڈکیتی کی تعداد میں بہت اضافہ ہو گیا۔
میں جولائی ۴۶ء کے پندرہ سولہ تک تو حیدرآباد میں ہی تھا پھر چند ماہ کے واسطے علی گڑھ آ گیا اور ۴۷ء جون میں پھر حیدرآباد چلا گیا۔ میرا علم ہندوستانی سیاست کے متعلق ذاتی نہیں ہے بلکہ ان کتابوں اور اخباروں سے ہے کہ جو اس زمانہ کے حالات سے بھرے ہوئے ہیں۔ خاص کر مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب (India wins freedom) اور مینن کی کتاب اور (H.V. Hodson) کی کتاب (The great divide) آخر الذکر کتاب سے بہت مدد ملی۔ میں ایک روزنامچہ بھی لکھتا تھا اس سے بھی بہت سی یادیں تازہ ہو گئیں۔ ۲ اکتوبر ۴۶ء کو میری بیٹی تسنیم کو خدا نے بیٹی عطا فرمائی۔ باری تعالیٰ خوش رکھے۔
کانگریس نے تنہا گورنمنٹ بنائی تھی۔ مسلم لیگ نے شرکت سے انکار کیا تھا۔ مگر ویسرائے سے مزید خط و کتابت کے بعد آخر کار مسلم لیگ نے حکومت میں شرکت منظور کر لی اور پندرہ اکتوبر ۴۶ء کو یہ اعلان ہوا کہ مسٹر سرت چندر بوس، سر شفاعت احمد اور سید علی ظہیر کہ جو کانگریس کی وزارت میں شریک تھے۔ انھوں نے استعفے دیا اور مسلم لیگ کی طرف سے حسب ذیل حضرات شریک حکومت ہو گئے
نواب زادہ لیاقت علی خاں، عبدالرب نشتر، غضنفر علی خاں

چندریگر، اور جگندر ناتھ منڈل۔
آخرالذکر ایک شڈول کاسٹ کا ممبر تھا کہ جسے لیگ نے اس واسطے شریک کیا کہ کانگریس نے مولانا ابوالکلام کو گورنمنٹ میں لیا تھا۔
سر ناظم الدین اور نواب اسمٰعیل خاں کو بہت ناامیدی ہوئی اور مجھے بھی تعجب ہوا۔ میں اس نتیجہ پر آیا کہ مسٹر جناح نے ایسی ٹیم بنائی ہے کہ جو اپنی رائے سے کچھ نہ کرے اور جناح صاحب کے حکم کی تعمیل کرے۔

آنچہ استاد ازل گفت ہماں میگویم

۱۰ جنوری ۱۹۴۶ء کو دہلی میں نواب زادہ لیاقت علی خاں کے دفتر گیا۔ وہ ولایت میں اپنی کامیابی پر بہت خوش تھے۔ وہ بادشاہ اور چرچل سے بھی ملے تھے۔ اس پر مطمئن تھے کہ برٹش گورنمنٹ نے یہ مان لیا (Cabenit Mission) کی تجاویز کا مطلب یہی ہے کہ جو مسلم لیگ کہتی ہے۔ ان سے یہ بھی معلوم ہوا کہ گورنمنٹ میں کوئی اتحاد عمل نہیں ہے۔ یہاں تک کہ منسٹر اور پارٹیاں بھی الگ الگ ہوتی ہیں۔ ایک دوسرے سے کانگریس اور لیگ کے نمائندوں میں ملاقات بھی نہیں ہوتیں۔ بجائے شرکت عمل کے دو مخالف گروہ آمنے سامنے رہتے ہیں مجھے حیرت ہوئی کہ یہ حکومت کب تک اور کیسے چلے گی۔
مسٹر جناح مرحوم کی شخصیت ایک اہم شخصیت تھی کہ جس نے ہندوستان کی تاریخ بدل دی۔ ایک نیا ملک پاکستان پیدا کر دیا۔ ان کی قانونی قابلیت۔ ارادہ کی پختگی۔ کردار کی مضبوطی ایسی تھی کہ جسے ان کے موافق اور مخالف سب ہی تسلیم کرتے ہیں مگر وہ ایک

اچھے جنرل تھے کہ جس وقت تک لڑائی رہے اپنی فوج کو ہمت دلا نے آگے بڑھانے اور جنگ جاری رکھنے کا جوش اور ولولہ ان کے دلوں میں پیدا کر سکتے تھے لیکن جنگ ختم ہونے کے بعد صلح کرنے اور ڈپلومیٹک انداز بیان سے حریف کا دل ہاتھ میں لینے کی قابلیت کی کمی تھی۔ وہ بہت خود دار تھے مگر ان کی خود داری خودی کی حد تک پہنچی تھی۔ ان کے تعلقات (Lord Mount Batten) سے شگفتہ نہیں رہے۔ اور اسی واسطے مصالحت نہ ہو سکی۔ اگر مسٹر جناح اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے مراسم اچھے ہوتے تو میرے خیال میں بہت سی دشواریاں پیدا نہ ہوتیں۔ ۲۰ فروری ۱۹۴۷ء کو لارڈ ویول وائسرائے کی لڑکی کی شادی تھی اور سوئے اتفاق کہ اسی تاریخ کو اس کا اعلان کیا گیا کہ انھیں واپس بلا لیا جائے گا اور ہندوستان 1948 تک آزاد ہو جائیگا۔

لارڈ ویول کو کیوں یکایک ان کا زمانہ ختم ہونے سے پہلے بلا لیا گیا اس کا کوئی ذاتی علم مجھے نہیں ہے۔ مگر (H.V. Hodson) نے اپنی کتاب (Great divide) میں جو وجہ لکھی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ان کی اس تجویز سے کہ برٹش عورتوں اور بچوں کو ہندوستان سے جلد سے جلد لے جانے کا انتظام کیا جائے۔ برٹش گورنمنٹ کو اختلاف تھا اور مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان کوئی راستہ جو دونوں کا متفقہ ہو۔ وہ نہیں نکال سکے۔

مجھے لارڈ ویول سے کافی ملنے کا موقعہ ملا۔ وہ ایک شریف مزاج مخلص اور صاف باطن جنرل تھے۔ وہ سیاست کے ماہر نہ تھے۔ وہ ذومعنی الفاظ کا استعمال نہ کرتے تھے۔ اور نہ اسے پسند کرتے تھے وہ خود ہندوستان کے سیاسی لیڈروں سے یہ کہہ دیتے تھے کہ وہ ڈپلومیٹ نہیں ہیں۔ صاف بات کہئے۔ اور ہمارے ملک میں ہر فقرے کے مستقبل

ہر فریق کی رائے کے مطابق نکالنا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا ؎

شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیرہا

وہ اس قدر صاف باطن تھے کہ جب میں ۱۹ مارچ کو ان سے الوداع کہنے گیا تو میں نے ان سے یہ دریافت کیا کہ اگر مسلم لیگ اور کانگریس میں اتفاق نہ ہوا تو ۱۹۴۸ء میں ہندوستان کی آزادی کے اعلان کے بعد حکومت کس طرح چلے گی تو انھوں نے کہا

۲۴ مارچ ۱۹۴۷ء کو

(لارڈ ماؤنٹ بیٹن) (Lord Mount Batten) دہلی آئے اور 24 مارچ کو لارڈ ویول گئے اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے چارج لیا۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن بہت ہی غیر معمولی قابلیت کے مالک تھے بہت ہی ذکی، ذہین اور فہیم تھے۔ وہ ایک اڈمرل بھی تھے اور ڈپلومیٹ بھی تھے وہ اپنے ارادے کے پکے اور مضبوط بھی تھے۔ اور اختلاف اس طرح کرتے تھے کہ جس سے مخالف فریق کے دل میں خراش نہ ہو اسے ناگواری نہ ہو، وہ ناخوشگوار بات کو بھی خوشگوار طریقہ سے کہتے تھے بقول غالب ؎

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

انھوں نے کانگریس لیڈروں کو بالکل اپنے ہاتھ میں لے لیا اور صورت حال کو اس طرح پیش کیا کہ کانگریس ملک کی تقسیم پر راضی ہو گئی پنڈت جواہر لعل نہرو سے ان کے تعلقات بہت ہی شگفتہ تھے بخلاف اس کے مسٹر جناح سے ان کے تعلقات خوشگوار نہ رہے اس کی وجہ مسٹر جناح کی مزاجی کیفیت تھی۔

اس کا احساس تو مجھے اس زمانے میں بھی تھا۔ مگر مسٹر ایچ۔ وی

ہوڈسن کی کتاب (Great divide) پڑھنے کے بعد یقین ہو گیا کہ مسٹر جناح سے قبلاً وہ خوش نہ تھے۔ اس کتاب میں ویول کے روزنامچہ کے اقتباس درج ہیں جس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے۔

۲۰ مارچ ۱۹۴۷ء کو میں جنرل آکسن لک (کمانڈر ان چیف) سے ملا۔ وہ پنجاب کے حالات سے بہت پریشان تھے۔ ان کا بجا طور پر یہ خیال تھا کہ فوجی سپاہی جب رخصت لیکر گھر جائے گا اور فرقہ وارانہ تصادم کا حال دیکھے گا تو نا ممکن ہے کہ وہ متاثر نہ ہوں۔ اور فوج کا غیر جانبدار رہنا ممکن نہ ہوگا۔

۲۹ مارچ ۱۹۴۷ء میں لکھنؤ گیا اور گورنمنٹ ہاؤس میں مقیم ہوا۔ سات بجے شام کو گورنر سے مفصل گفتگو ہوئی۔ اس زمانے میں کسی کو مستقبل کی خبر نہ تھی سیاسی مطلع اس درجہ غبار آلود ہو گیا تھا کہ کوئی بھی صاف نہیں دیکھ سکتا تھا۔ گورنر وائسرائے لارڈ ویول کے شاکی تھے وہ گورنروں سے مشورہ نہیں کرتے۔ گورنر اپنے وزراء کے بھی شاکی تھے۔ وہ اپنے وزراء میں سمپورنانند کو پسند کرتے تھے مگر پنتھ جی اور رفیع مرحوم کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مرکز کی طرح لیگ اور کانگریس کی مشترک حکومتیں صوبوں میں بھی ہونی چاہئیں۔ مجھے اس سے اتفاق تھا۔

وہ یہ کہتے تھے کہ خلیق الزماں کی یہ رائے تھی کہ ہندوستان کو تقسیم کر دیا جائے اور فوج کو بھی مذہبی اعتبار سے تقسیم کر دیا جائے۔

۵ اپریل ۱۹۴۷ء کو نوابزادہ لیاقت علی خاں سے ملا۔ وہ اس پر تیار رہیں کہ پنجاب اور بنگال کی تقسیم کے بعد بھی پاکستان قبول کر لینا ہوگا۔ خاصکر اس قتل و غارتگری کے بعد تو پاکستان کا بننا لازمی تھا۔

اسی زمانے میں اعلیٰ حضرت حضور نظام کا ایک افتخار نامہ آیا

جس کا منشا یہ تھا کہ میں ایک تحفہ بطور یادگار ملازمت پچیس سالہ سالگرہ مبارک پر پیش کروں۔ میں نے ایک بڑا سگار رکھنے کا چاندی کا بکس ہملٹن سے جو ایک مشہور انگلش جوہری کی فرم تھا بنوایا۔ اس کے اوپر سونے کے پتر پر حیدرآباد کا نقشہ اور نقشہ کے وسط میں حیدرآباد کا تاج جس میں پلاٹینم میں ہیرے جڑے تھے چسپاں کر دیا۔ سالگرہ پر مجھے طلب فرمایا تھا لیکن مجھے یہ معلوم تھا کہ حیدرآباد میں سر مرزا کی مخالفت زوروں پر تھی اور حضور نظام خود بھی حسب عادت اب خوش نہیں رہے تھے۔ لہذا ایسی حالت میں میرا جانا سر مرزا اسماعیل کو غلط فہمی پیدا کرتا۔ لوگ مجھ سے ملنے آتے اور چہ میگوئیاں شروع ہوتیں۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ سر مرزا یہ خیال کرتے کہ ان کی مخالفت کا اگر مرکز نہیں ہوں تو کم از کم مجھے اس سے اتفاق رائے ہے۔ میں نے اپنے بیٹے ابن کو مع تحفہ اور عریضہ کے بھیجا۔ سوئے مزاجی کی وجہ سے حاضری سے معذرت چاہی۔ ابن سعید نے نذر پیش کی اور تحفہ گذرانا۔ حضور نظام نے اسے بہت پسند فرمایا۔

۲۷ رمئی ۱۹۴۶ء میں لکھنؤ گیا تھا۔ میرے ایک بہت ہی عزیز دوست مہاراجہ اعجاز رسول جہانگیرآباد کا انتقال ۲۰ اور ۲۱ مئی کے درمیانی شب میں ہوگیا تھا۔ تعزیت کے سلسلے میں جہانگیرآباد جانا تھا۔ میں راجہ صاحب سلیم پور کے پاس ٹھیرا ہوا تھا۔ ہزہائینس نواب صاحب بھوپال کا تار ملا۔ فون پر علی گڈھ سے کہا گیا کہ ہزہائینس مجھے ۳۰ رمئی سے پہلے ملنے کے واسطے بلاتے ہیں۔ تار ۲۹ رکو ملا۔ میرا جانا ناممکن نہ تھا۔ میں جہانگیرآباد چلا گیا۔ بڑی مہارانی کے پاس گیا۔ انہوں نے کہا کہ ریاست کو کورٹ

ہونے سے بچالے مگر جب چھوٹی مہارانی کے پاس پہنچا تو پردے کے ادھر باوجود ان کی کوشش کے ان کی رونے اور ہچکیوں کی آواز آرہی تھی۔ ان کے بڑے لڑکے جمی جن کی عمر چار ساڑھے چار برس ہوگی۔ میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اندر آؤ امی کا کیا حال ہے۔ میرا دل تڑپ گیا۔ عجیب حالت ہوئی۔ میں سوائے دعا کے کیا کر سکتا تھا۔ خدا ان یتیم بچوں پر رحم فرمائے۔

۲۹ مئی ۱۹۴۷ء کو میں نے ہز ہائینس بھوپال کو تار دیا کہ حاضر نہ ہوسکونگا اور دہلی آکر ملوں گا۔

۳۰ مئی کو حضور نظام کا افتخار نامہ مورخہ ۲۷ مئی ملا جس میں اعلیٰ حضرت نے مجھے پھر حیدر آباد ایک سال کے واسطے طلب فرمایا تھا۔ جس کی نقل درج ذیل ہے۔

STRICTLY CONFIDENTIAL

Hyderabad (Deccan)
27 May 1947

M.O.A.K.
Nizam VII

My dear Nawab Sahib of Chhatari,

Probably you are aware of what adverse circumstances are prevailing inside and outside the country against

Sir Mirza's regime, infact due to this he has asked me to relieve him of his duties as President of the Council without further delay. In view of this I have discussed the whole question of his successor with the British Resident. I mean Mr. Herbert who specially came down from Ooty recently for this purpose.

However what was decided between him and myself was as follows :

Namely time is too short, so it is difficult to select a capable and trustworthy man from outside the state since no one is fit for such a high post in Hyderabad.

Secondly if a man is selected, he being an outsider will require knowledge of local conditions and also he will require some time to get the insight of the administration for a year or so before he begins to work; but on the other hand this delay can not be allowed since important matters are on the anvil or under consideration now which require careful handlings. Therefore the Resident's suggestion (provided I agree with him) is that you should be allowed to revert to your former position as a President of Council for a year since you are well acquainted with the affairs of the State after rendering loyal services for a period of 5 years during the critical period of war.

As to the term of appointment it was decided that you should be given the same terms which you enjoyed before

plus your Rs. 2000/- as pension. I told Resident that I entirely agree with his wise suggestion and hence this letter of mine on the subject.

(2) Will you please let me know whether you accept my offer as mentioned above. After hearing from you and in case you accept it, I shall let you know when to come to take charge from Sir Mehdiyar Jung and probably you will have to come here sometime in June or failing that early in July, as the case may be. Because the situation being critical I must handle important affairs of the State with tact and sagacity and I am sure your re-appointment will be looked up on with favour (though it may be of short duration) on all hands.

(3) I may add that both the Residents i. e. Sir Arther Lothian and Mr Herbert spoke to me in high terms about you as regard your family position and also your personal character to say nothing of the high posts you held in the times gone by.

(4) Sir Walter Monckton is here and with him you will work who is the constitutional adviser to the Hyderabad Govt. in whom I repose my confidence just in the same way as I do in you. Please treat the contents of this letter as very confidential till I announce my decision in the matter in the Gazette extraordinary in near future otherwise if it leaks

out, the fear is that dangerous perso is may spoil the situation in order to get their own ends.

Yours Sincerely
M.O.A.K.

اخباروں میں یہ خبر نو عرصہ سے گشت کر رہی تھی کہ موجودہ صدر اعظم اور نظام کے تعلقات میں کشیدگی ہو گئی ہے - مگر اتنی جلدی صدر اعظم کی تبدیلی انتظامی نقطۂ نظر سے درست نہ تھی - حیدرآباد کی بہت سی دشواریوں کی وجہ یہ بھی تھی کہ حضور نظام تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اپنے صدر اعظم سے غیر مطمئن ہو جاتے تھے اور بقول نواب مہدی یار جنگ مرحوم اپنی گورنمنٹ کے خود "Leader of Opposition" (مخالف پارٹی کے لیڈر) کے فرائض انجام دینے لگتے تھے

۳۱ مئی کو میں دہلی گیا - سر کونراڈ کورفیلڈ سے ملا - یہ پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ میں ویسرائے کے مشیر تھے پھر ان کے سکریٹری مسٹر گرفتھ سے ملا - ان دونوں کی گفتگو کا خلاصہ یہ تھا کہ عنقریب ("Para Mountcy") ختم ہو جائے گی اور نظام آزاد ہیں جیسے چاہیں رکھیں - پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ کوئی مدد نہ دے سکے گا "پیراماؤنٹسی" ایک ایسے اختیارات حکومت ہند نے اپنے ہاتھ میں رکھ لئے تھے کہ جس سے وہ والیان ملک کے داخلی اور خارجی ہر معاملے میں دخل دے سکتے تھے - والیان ملک اسے بہت ناپسند کرتے تھے مگر اسی اختلاف کے ساتھ والیان ملک کے تحفظ کی بھی حکومت ہند ذمہ دار تھی اور "پیراماؤنٹسی" کے ساتھ ساتھ ریاستیں بھی ختم ہو گئیں - خدا جانے آج والیان ملک کی کیا رائے ہے جبکہ ریاست لیتے وقت جو

عہد و پیمان ان دستوری حقوق (Privy Purse)
صرف خاص کی رقم کے واسطے کئے گئے تھے۔ وہ بھی خطرے میں ہیں
۳۱ مئی کی شام کو سر والٹر مونکٹن جو بعد کو لارڈ مانکٹن ہو گئے تھے
مجھ سے ملنے آئے میں دلی میں میڈن ہوٹل میں ٹھیرا تھا۔ سر والٹر مونکٹن
بہت بلند پایہ بیرسٹر تھے۔ یہ انگلستان کے شاہی خاندان کے مشیر
قانونی تھے اور اس زمانہ میں حیدرآباد کے مشیر بھی تھے۔ حیدرآباد سے
انھیں ایک ہزار یومیہ فیس دی جاتی تھی اور سنہ ۱۹۴۷ء اور سنہ ۱۹۴۸ء میں
انہوں وہ حیدرآباد کی قانونی خدمت کرتے رہے۔ ان سے معلوم ہوا
کہ ہز ہائینس بھوپال نے جو مجھے تار دیا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ سر والٹر
کے ذریعے ہز ای ایچ نے نواب صاحب بھوپال کو خط لکھا تھا کہ وہ
بھی مجھ پر زور دیں اور میں دوبارہ حیدرآباد چلا جاؤں۔ ان سے یہ
بھی معلوم ہوا جب ایچ ای ایچ نے سر مرزا اسماعیل کا تقرر کیا تو کسی
خط میں نواب صاحب بھوپال کو اس کی اطلاع دی تو ہز ہائینس بھوپال
نے اپنے جواب میں یہ فقرہ بھی لکھ دیا:۔

I hope he will prove loyal to your Exalted Highness

نظام نے وہ خط سر مرزا کو دکھا دیا اور
سر مرزا کو نواب صاحب بھوپال سے ناگواری ہو گئی۔

سر والٹر نے مجھ سے کہا کہ مجھے حیدرآباد واپس چلا جانا چاہیے انھوں
نے دوستانہ کرم سے یہ بھی کہا۔

"It will be a pleasure to work with you."

میں ان سے اپنی دشواریاں بیان کرتا رہا۔ چونکہ پہلے بھی سر اسٹیفرڈ
کرپس کی مشن کے زمانہ میں مشیر قانونی کی خدمت انجام دے چکے
تھے۔ میری مشکلات کو جانتے تھے۔ حیدرآباد کی مشکلات میں سب

سے بڑی وجہ تو خود نظام کی مزاجی کیفیت تھی۔ غیر متوقع تغیرات ان کے مزاج میں پیدا ہو جاتے تھے۔ مزید برآں اعلیٰ حضرت کے مزاج میں ایسے لوگوں کو درخور تھا کہ جو اس زمانہ کے عظیم انقلاب کے تقاضوں اور مصالح کو نہ سمجھ سکتے تھے اور نہ اس کی اہلیت رکھتے تھے۔ سر والٹر کو اصرار تھا کہ میں فوراً جواب دوں۔ میں نے وعدہ کیا کہ ۳ جون کو بتا سکوں گا۔ میں دو تین روز سوچنا چاہتا تھا۔

سر والٹر مانکٹن نے یہ بھی کہا کہ علی یاور جنگ اب مرزا کے مخالف تھے مجھے اس پر تعجب ہوا اور میں نے کہا:۔

"At one time he was taking forward to inmgas' coming."

پھر علی یاور جنگ آئے۔ بڑی محبت سے معانقہ کیا۔ کچھ ایسے واقعات بیان کرتے رہے کہ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کے تعلقات سر مرزا سے کچھ شگفتہ نہیں رہے۔ پھر مقبول آ گئے۔ وہ بھی یہی چاہتے تھے کہ میں اس تجویز کو مان لوں۔ ۱ جون ۱۹۴۷ء کو ہز ہائینس بھوپال ہوائی جہاز سے دہلی آ گئے۔ میں ملنے آ گیا۔ شعیب مرحوم اور خلیق الزماں سے باتیں رہیں۔ پھر ہز ہائینس سے ملا۔ وہ بھی اسی پر زور دیتے رہے کہ میں حیدرآباد چلا جاؤں۔ جب میں نے حیدرآباد کی دشواریاں بیان کیں تو کہنے لگے کہ میں خود حیدرآباد آؤں گا اور کوئی دشواری نہیں رہے گی۔

اسی روز میں باغپت چلا گیا۔ وہاں اختر لیہر نواب جمشید علی خاں اور عبدالحمید مرحوم کی لڑکی کی شادی تھی۔ میں نے وہیں سے H.E.H کے والا نامہ کی رسید تار سے دیدی۔

۳ جون ۴۷ء کو باغپت سے دہلی آیا اور لارڈ اسمے کے مکان

پھر سر والٹر مانکٹن سے کہدیا کہ میں منظور کرتا ہوں حیدرآباد چلوں گا۔
ان سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں
(Dominion status.) پر راضی ہیں۔ ان کی رائے تھی
کہ حیدرآباد کو کسی یونین میں شریک ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں
نے کہا کہ اس طرز کا بیان حیدرآباد کی طرف سے ہو سکتا ہے۔
انہوں نے جیب سے نکال کر جو مسودہ دکھایا وہ اسی روش پر تھا۔
سر والٹر ہنس کر کہنے لگے کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمہارا لکھایا مسودہ ہے۔

پھر ہز ہائینس بھوپال سے ملا۔ وہاں معلوم ہوا کہ مسٹر جناح سے
ڈھائی بجے میری ملاقات کا وقت طے ہو گیا ہے۔ میں نے ان سے
کہدیا کہ میں حیدرآباد جانے کے واسطے راضی ہوں۔ ہز ہائینس سے
یہ بھی معلوم ہوا کہ چودھری ظفر اللہ خاں کو والیان ملک کے مشیر قانونی
کی حیثیت سے رکھنا چاہتے ہیں۔

ڈھائی بجے مسٹر جناح سے ملا۔ وہ اس پر مصر تھے کہ جس قدر جلد
ممکن ہو چارج لے لوں میں نے کہا کہ جب تک چارج لینے کی تاریخ
نظام مقرر نہ کریں۔ میں چارج کیسے لے لوں۔ انھیں جلدی اس وجہ سے
تھی کہ حیدرآباد سے یہ اعلان ہو جائے کہ وہ آئین ساز جماعت میں شریک
نہ ہوگا۔ یعنی آزاد رہیگا۔

یہ بھی خدا کی شان ہے کہ جب سنہ ۴۱ء میں حیدرآباد پہلی بار گیا
اور مسٹر جناح حیدرآباد کے اسی گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے تھے
جہاں میں مقیم ہوا تو میرے تقرر کی مخالفت کی تھی اور اخبار میں اعلان
کیا کہ اگر مجھے صدر اعظم ہونے کے سلسلہ میں جلسے ہوں تو مسلم لیگ کے
لوگ شریک نہ ہوں اور میرا زمانہ پنج سالہ ختم ہونے پر یہ کہا:۔
"He was a square peg in a round hole"

اور اب میرے حیدرآباد جانے پر مصر تھے۔ شام کے سات
بجے لارڈ اسمے سے ملا۔ وہاں سر والٹر مانکٹن اور سر ایرک میول بھی
تھے۔ میں نے وائسرائے کو ان کی کامیابی پر مبارکباد دی۔

شام کو صغیر صاحب مرحوم سے سکندرآباد میں ملا۔ ان سے معلوم
ہوا کہ فرقہ وارانہ قتل و غارتگری پھر شروع ہو گئی۔ رات گئے تک علیگڑھ
آ گیا۔

۴ جون ۱۹۴۷ء کو میں نے H.E.H کے خط کا جواب پیش کیا جس
میں میں نے یہ لکھا کہ میں حاضر ہونے کو تیار ہوں گو میرا خیال کسی
ملازمت کا تھا نہ آئندہ سیاست میں حصہ لینے کا تھا۔ لیکن آپ
کا حکم دعوت فرض ہے جس سے انکار ناممکن ہے۔ حضور نظام نے
جو والا نامہ میں شرائط لکھے تھے میں نے یہ عرض کیا کہ تنخواہ یا
وقت ملازمت کے تعین کی ضرورت نہیں تنخواہ کا سوال تو حضور
کے اور میرے درمیان آتا ہی نہیں۔ رہا وقت تو جب آپ چاہیں
فرما سکتے ہیں میں واپس چلا جاؤں گا یا جب مجھے یہ ظاہر ہو کہ سرکار
کی خدمت بوجوہ احسن نہیں کر سکتا تو میں عرض کر دوں گا۔

۵ جون H.E.H کا تار ملا جس میں حکم تھا کہ ۱۰ جون تک آ کر
چارج لے لوں۔ ۶ جون ۱۹۴۷ء کو دہلی گیا اور مسز نائیڈو کے ساتھ مہاتما
جی سے ملا۔

میں نے کہا کہ مہاتما جی جب پہلی بار چھ برس ہوئے میں حیدرآباد
گیا تھا تو آپ نے مجھے مبارکباد کا خط لکھا تھا۔ اب میں پھر حیدرآباد
جا رہا ہوں۔ آپ کی آشیرباد چاہتا ہوں۔ مہاتما جی نے کہا کہ اس کی
آشیرباد اس شرط کے ساتھ ہے کہ حیدرآباد کے لوگوں کو خوش
رکھوں۔ میں نے کہا کہ مسز نائیڈو حیدرآباد کی ہیں ان سے پوچھئے

اور یو۔پی کے متعلق پنتھ جی سے پوچھئے کہ میں نے کبھی فرقہ وارانہ نظر سے کوئی کام کیا۔ یا کوئی شخص روپیہ کی صورت میں میری قیمت لگا سکا۔ جہاتماجی نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص یہ دو باتیں رکھتا ہو تو یہ تو بڑی بات ہے۔ مسز نائیڈو بہت ہی نیک مزاج خاتون تھیں انھوں نے بہت اچھے الفاظ میرے متعلق فرمائے۔

رخصت ہوتے وقت جہاتماجی نے کہا "خوش رہو اور خوش رکھو" جہاتماجی نے ایسا جامع اور پُر معانی فقرہ کہا کہ جسے میں کبھی نہ بھول سکا میں سر شنکر لال کے ہاں ٹھہرا تھا۔ علی گڈھ واپس آگیا۔ ۸ رجون کو علیگڈہ سے چل کر سر شنکر لال کے ہاں پہونچا۔ صغیر مرحوم بھی ساتھ آئے نواب سر جمشید علی خاں بھی آگئے اور ۹ رجون ۱۹۴۷ء کو ہوائی جہاز سے روانہ ہوا۔ صغیر صاحب بھی باوجود میرے منع کرنے کے ہوائی جہاز میں سوار ہو گئے ۴۵-۱۲ بجے بخیر و عافیت سے حیدرآباد پہونچے۔ ہوائی اسٹیشن پر سر والٹر مانکٹن اور نواب مہدی یار جنگ جو سر مرزا کے بعد عارضی صدر اعظم کے فرائض انجام دے رہے تھے موجود تھے اور دوسرے بہت سے حضرات تشریف لائے تھے۔ چار بجے شام کو اعلیٰ حضرت نظام نے نظری باغ میں طلب فرمایا مجھے دیکھکر فرمایا آپ آگئے۔ آپ آگئے ہیں مجھے تشویش کی۔ بہت مسرور اور مطمئن معلوم ہوتے تھے

اسی روز شام کو نسل کی میٹنگ ہوئی۔ کیبنٹ کو کونسل کہتے تھے۔ جس میں اس اعلان کے مسودہ کو طے کرنا تھا کہ نظام کی طرف سے کہا جائے عبدالرحیم جو وزراء میں اسمبلی کے نمائندے تھے اس پر زور دے رہے تھے کہ اعلان خود مختاری بھی ابھی کیا جائے۔ سر والٹر مشیر قانونی نے اس سے اختلاف کیا ان کے مشورے کا منشا قانونی صورت بیان کرنا تھا کہ برٹش حکومت کے جانے کے بعد ریاست حیدرآباد

قانوناً خود مختار رہنے کی مستحق ہے۔ اس کے معنی اعلان خود مختاری نہ تھے
۱۰ جون کو میں اور سر والٹر سرکار میں حاضر ہوئے اور اس اعلان پر
گفتگو ہوئی۔ اسی روز شام کو قاسم رضوی مجھ سے آکر ملے ان کے نام
سے کون واقف نہیں یہ اتحاد المسلمین کے صدر اور رضاکاروں کے
لیڈر تھے اور حیدر آباد کی مصائب کی ذمہ داری ان کی اور ان کی پارٹی
کی ہے۔ وہ صاف گو اور انتہا پسند معلوم ہوتے تھے۔ جوش کی بہت
زیادتی مگر ہوش اور مصلحت بینی کی کمی صاف ظاہر ہوتی تھی۔ انہوں
نے سرکار کو ایک عریضہ بھیجا جس میں یہ خواہش کی کہ اعلان خود مختاری
ابھی کیا جائے۔ وہ مزاجاً بہت جلد بدگمان ہو جاتے تھے۔

چنانچہ اس عریضہ میں یہ بھی تھا کہ چونکہ میں ایک کانگریس کی حکومت
کی رعایا ہوں لہذا کانگریس کا اثر ہونا مجھ پر لازمی ہے۔ لہذا میرے
ساتھ دو وزراء حیدر آباد کے باشندے بھی ہونے چاہئیں جب حکومت
ہند سے گفت و شنید ہو۔

انھیں اس انقلاب عظیم کا اندازہ ہی نہ تھا کہ جب برٹش حکومت
اس امپائر کو چھوڑنے پر مجبور ہو گئی تھی کہ جس امپائر پر سورج غروب نہیں
ہوتا تھا اور یہ کہا جاتا تھا کہ برٹن کی حکومت سمندر کی لہروں پر بھی ہے
تو تنہا حیدر آباد برٹش کے چلے جانے کے بعد ہندوستان کا مقابلہ
کیسے کر سکتا تھا۔ حیدر آباد میں مسلمانوں کی آبادی فقط تیرہ فی صدی۔
چاروں طرف سے کانگریس حکومتوں سے گھرا ہوا۔ خود ہتھیار بنانا تو درکنار
کارتوس تک نہیں بناتے تھے کوئی تعلق دنیا کے کسی حصہ سے نہ سمندر
کے اور نہ خشکی کے ذریعہ لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں۔

ایسی نازک صورت میں گفت و شنید کرنا آسان نہ تھا اور خود مختاری
کا اعلان کس قدر ناقابل عمل تھا۔ اسی روز شام کو کاظم یار جنگ

(منسٹر پیشی) کے ذریعہ سے سرکار کا پیام آیا کہ اعلان میں کچھ ترمیم ہے سر والٹر سے مشورہ کیا جائے وہ ترمیم بالکل وہ ہی تھی جو قاسم رضوی نے مجھے سنائی تھی۔ جب ایسے راز یوں طشت ازبام ہوں تو کیسے کام کیا جائے۔ یہی وہ دشواریاں تھیں کہ جن کی وجہ سے مجھے حیدرآباد واپس آنے میں تذبذب تھا۔ حکمراں کو رائے دینے کا حق تو انہی کو ہونا چاہیئے کہ جو اس کے نتائج اور عواقب کے ذمہ دار بھی ہوں۔ ایسے ہی لوگوں کے مشورے تھے کہ جو لائق علی صاحب کی وزارت کے زمانے میں پولیس ایکشن کی مصیبت اہل حیدرآباد پر اور ذلت حکومت وقت پر لائے۔ طاقت بغیر بغیر خطرناک ہے اور ذمہ داری بغیر طاقت مفلوج ہو جاتی ہے۔ ۱۱ رجون ۴۷ء میں اور سر والٹر سرکار میں حاضر ہوئے اور جس ترمیم کا اوپر ذکر کر چکا ہوں اسے قبول کرنے سے سر والٹر منکٹن نے بحیثیت مشیر قانونی انکار کیا اور نظام کی طرف سے بھی کوئی اصرار نہیں ہوا۔ مسٹر فینل جو ریزیڈنٹ حیدرآباد کے سکریٹری تھے لنچ پر آئے۔ اور یہ پیام لائے کہ ابھی اعلان جو کونسل نے پاس کیا تھا نہ کیا جائے۔ میں نے کہا کہ وزراء کی کونسل اسے پاس کر چکی۔ نظام سے بھی منظوری ہو گئی اب کیسے روکا جا سکتا ہے۔ باتوں سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ انھیں قلباً اختلاف نہ تھا مگر ادائیگی فرض ضروری تھا۔ میں ایک روز کے واسطے علی گڑھ چلا گیا اور وہاں سے ۱۶ جون کو دہلی گیا۔

مسٹر جناح سے ملاقات ہوئی ان کا طرز گفتگو بالکل یک طرفہ تھا وہ اس پر زور دیتے تھے کہ سر سی۔ پی راما سوامی آئر (جو ریاست ٹراونکور کے دیوان یعنی چیف منسٹر تھے) کی طرح حکومت ہند سے

مجھے بھی لڑنا چاہیئے۔

میں نے یہ بھی کہدیا کہ میں پنڈت نہرو سے بھی لڑونگا۔ بس اس پر بگڑ گئے اور کہا "تم اس مغرور سے ملکر کیوں اپنے آپ کو ذلیل کرتے ہو زمانہ میں جو کمیٹی بنا رہی گئی اس میں سب خود طے ہو جائیگا"۔ بہرحال جناح لڑائی کے موڈ میں تھے۔

شام کے ساڑھے چار بجے پنڈت جی سے ملا۔ وہ بہت خلق سے ملے۔ مگر کچھ چپ۔ چپ اور گھٹے گھٹے سے تھے۔ میں نے حیدرآباد کی پوزیشن کے متعلق کہا کہ نظام کا موجودہ طرز کوئی نئی بات نہیں ہے۔ جب برٹش حکومت نے ریاستوں کا فیڈریشن چاہا تھا تب بھی نظام نے مخالفت کی تھی مگر حیدرآباد ایسے جملہ معاملات میں معاہدے کریگا اور دوستانہ تعلقات رکھے گا وہ چپ سنتے رہے کہا کچھ نہیں۔

۱۷ جون ۴۷ء صبح سردار پٹیل سے ملا۔ مجھے ایک صفت انکی بہت پسند آئی۔ وہ مختلف نظریوں کے غلام نہ تھے۔ وہ قابل عمل نظریہ اور اصول میں اور ناقابل عمل نظریہ میں فرق کرتے تھے۔ وہ خیالی دنیا سے الگ عملی دنیا کے ماہر اور قابل عمل پروگرام کے قائل تھے۔

میں نے ان سے کہا کہ (Law and order) خراب ہو رہا ہے انھیں اتفاق تھا۔ میں نے کہا کہ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ آپ کی پارٹی کے مقامی لیڈر ملازمین سرکار کو برا بھلا کہتے ہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ پہلے ان کا کام فقط شورش پھیلانا تھا اور اب انتظام کرنا۔ اور ہر شورش کو روکنا ان کا فرض ہے انھیں اس سے اتفاق تھا۔

پھر کمیونسٹ اور سوشلسٹ کا ذکر آیا انھیں اس سے بھی اتفاق تھا کہ دونوں میں نتیجہ کے اعتبار سے چنداں فرق نہیں ہے اور اس کا

انسداد ضروری ہے ورنہ چین کا سا حال ہو جائے گا۔ پھر حیدر آباد کا ذکر آیا۔ اور جو اعلان حیدر آباد نے کیا تھا اس پر بحث ہوئی۔ سردار پٹیل نے کہا کہ اگر تمام ریاستیں خود مختار ہوں تو کام کیسے چلے گا میں نے کہا جہاں تک حیدر آباد کا تعلق ہے۔ اس مقصد کو معاہدوں کے ذریعہ سے پورا کیا جا سکتا ہے۔ چلتے وقت وہ کہنے لگے کہ اُمید ہے کہ حیدر آباد میں فرقہ وارانہ رنگ کو انتظام میں دخل نہ ہوگا۔ میں نے کہا مستقبل کے واسطے وعدے کر لینا آسان ہے مگر میرا تو ماضی کا طرز میری ضمانت ہے۔ وہ کہنے لگے جبھی تو میں نے آپ سے کہا۔ میں جانتا ہوں آپ فرقہ وارانہ طرز عمل پسند نہیں کرتے۔

اسی تاریخ کو ڈاکٹر راجندر پرشاد سے بھی ملاقات ہوئی میں نے ان سے کہا کہ جس طرح کانگریس زمینداری ختم کر رہی ہے اس طرح تو کمیونسٹ پیدا ہونگے۔ یہ زمینداری خریدی جائے۔ اور کاشتکاروں کو مالک آراضی بنا دیا جائے تو پھر کمیونزم کے واسطے گنجائش نہ رہے گی۔ اگر گورنمنٹ خود زمیندار بنی تو کاشتکار آئندہ گورنمنٹ سے بھی متنفر ہو جائے گا۔ پھر انتظامی خرابیوں اور (Law and order) کی طرف میں نے توجہ دلائی اُن کا خیال تھا کہ مسلمان ملازمین گورنمنٹ کے ساتھ تعاون نہیں کرتے میں نے کہا کہ ملازمین میں فرقہ وارانہ جذبات تو کبھی نہ تھے۔ ہاں اس وقت ہندو ہوں یا مسلمان ملازمین سرکار پریشان بہت ہیں۔ ان کا اطمینان قلب کام میں سہولت کا باعث ہوگا۔

اسی روز سردار بلدیو سنگھ سے ملا یہ کانگریس کی وزارت میں وزیر دفاع تھے ان سے ملک کی تقسیم کے متعلق جو گفتگو ہوئی اس کا خلاصہ یہ تھا کہ سکھ پاکستان کے خلاف نہیں ہیں مگر انکفیں

یہ بتایا جائے کہ پاکستان میں اُن کی کیا پوزیشن ہوگی۔ وہ کہتے تھے
کہ انھوں نے یہ مسٹر جناح سے کہا جب وہ ولایت میں تھے لیکن مسٹر
جناح نے کہا کہ "یہ مجھ پر چھوڑ دو"۔ ظاہر ہے کہ سکھوں کی اس سے
کیا اطمینان ہوتا۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ بتائیں کہ سکھ کیا چاہتے
ہیں۔ بقول اُن کے سکھوں کا مطالبہ یہ تھا کہ پاکستان کے اندر
ایک آزاد سکھ ریاست ہو اور ملازمتوں میں تحفظات دیئے جائیں

سر والٹر مونکٹن اور مینن نئے وائسرائے اور گورنر جنرل سے ملے
میں نے اسی روز کی ڈائری کے اقتباسات سے لکھ دیا ہے۔ سر والٹر
اور مینن وائسرائے سے ملے۔ اُن کی بے حد خلیق دلچسپ شخصیت ہے۔
(Lord Wavel) کے برعکس بہت باتیں کرتے ہیں۔ میں
نے جاتے ہی انھیں مبارکباد دی کہ آپ نے ایک ایسے معاملہ کو جو
اب تک مرہون کامیاب نہ ہوا تھا کامیاب بنایا اور آپ نے
دونوں حصوں سے (Dominion Status) ڈومینین
اسٹیٹس تسلیم کرا لیا اور ہندوستان اور پاکستان کامن ویلتھ
(Common Wealth) سے باہر نہ گئے اور میں نے یہ بھی
کہا کہ آئندہ یہ دونوں کامن ویلتھ سے باہر نہ جائیں گے۔ پھر وہ کہنے
لگے "میں تم سے کہتا ہوں تمہارے اور والٹر کے سامنے مجھے بات
کھل کر کہنے میں پس و پیش نہیں ہے"۔ پھر والیان ملک کے مستقبل
کے متعلق گفتگو رہی۔ اس کی تفصیل اب بیکار ہے۔ ع

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

اب نہ والیان ملک رہے نہ ریاستیں یہاں تک کہ اُن کے مقررہ
(Privy Purse) بھی باقی نہیں تو اُن کے متعلق پرانی باتیں
داستان پاستان بیکار ہیں۔

وئسرائے مجھ پر زور دیتے رہے کہ سر سی۔ پی کی طرح بار بار بیانات دیکر کانگریس کو مجبور نہ کیا جائے کہ وہ خواہ مخواہ آپ لوگوں پر حملہ کرنے پر مجبور ہوں۔"

وہ یہ بھی کہتے تھے کہ کانگریس گورنمنٹ خود اتنی پریشان اور مصروف ہے کہ انھیں کسی پر حملہ کرنے کی فرصت نہیں لیکن جب انھیں بار بار چیلنج کیا جائیگا تو وہ ریاست کی رعایا کو بھڑکائیں گے اور ریاستوں کی دشواریاں بڑھائیں گے اور اس طرح آپ کی دشواریاں بڑھیں گی۔ وئسرائے نے یہ بھی کہا کہ انھوں نے سر سی۔ پی راماسوامی آئر دیوان ٹراونکور سے بہ صاف کہدیا کہ ایسی حالت میں اُن کی وزارت اور مہاراجہ کی گدی کا رعایا کے ہاتھوں خطرہ میں آنیکا اندیشہ ہے۔" سر سی۔ پی یہ چاہتے تھے کہ ٹراونکور کو آزاد ہونا چاہئے اور اُن کی اسی پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان پر قاتلانہ حملہ کیا گیا مگر وہ بچ گئے اور مہاراجہ نے (Accession) منظور کیا یعنی ہندوستان کے ساتھ شرکت قبول کی۔

وئسرائے نے اس طرف بھی توجہ دلائی کہ حیدرآباد کے لوگوں کو سیاسی حقوق دئے جائیں۔ دوران تقریر میں انہوں نے یہ بھی کہا کہ پانسو ریاستیں ہیں ان میں تفریق کیسے ہو میں نے کہا کہ سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ جو معاہدے (Treaties) کئے گئے ہیں اُنکے اعتبار سے والیان ریاست میں فرق کیا جا سکتا ہے۔ ان سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نظام نے کوئی تار بادشاہ کو دیا تھا جو گورنمنٹ برطانیہ کے سامنے رکھا گیا مگر H.M.G. نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ ڈومینین سے زیادہ ڈومینین بنانا ممکن نہ ہوگا یہ تار اس زمانہ میں دیا گیا ہوگا جب میں کچھ زمانہ کے واسطے حیدرآباد سے چلا گیا تھا پھر وئسرائے نے

کہا "خود مختار ریاستوں کے تعلقات H.M.G. سے براہِ راست ہو سکتے ہیں۔ لیکن ایسا فوجی معاہدہ نہیں ہو سکتا جو قابلِ عمل نہ ہو" منشا یہ تھا کہ وہ کوئی فوجی امداد بوقتِ ضرورت نہ دے سکیں گے۔ ہز ایکسیلنسی نے دورانِ تقریر میں یہ بھی کہا کہ اس پر اصرار نہ کیجئے کہ H.M.G. اور ریاستوں کے تعلقات کو زیادہ صاف کیا جائے۔ اس سے ہندوستان کی سیاسی پارٹیاں ناراض ہونگی۔ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ ان باتوں کا اظہار ہو اور سیاسی جماعتیں بدگمان ہوں۔ انہوں نے اس پر زور دیا کہ نئی (Dominion) سے تعلقات قائم کرنے ہونگے۔

میں نے کہا کہ ہم اس پر تیار ہیں۔ میں نے زبانی بھی کہا ہے اور حیدرآباد سے پنڈت جواہرلال نہرو کو خط بھی لکھوں گا کہ ہم گفت و شنید کے واسطے تیار ہیں۔

وائسرائے جولائی میں حیدرآباد میں آنے کو تیار تھے مگر نظام نے بجائے جولائی کے اگست کے واسطے لکھا۔ وائسرائے نے اسی ملاقات میں کہا کہ وہ جانتے ہیں کہ نظام نے بجائے جولائی کے اگست کیوں لکھا ہے۔ مگر اگست میں اتنا کام ہوگا کہ انھیں دم مارنے کی فرصت نہ ہوگی۔ لیکن اگر پندرہ اگست کے بعد وہ ہندوستان میں رہے اور اگر ریاست حیدرآباد اور گورنمنٹ میں تعلقات دوستانہ رہے تو وہ آ سکیں گے۔

اس وقت انھیں حیدرآباد سے آنے سے روکنا ایک غلطی تھی۔ وائسرائے اگر کچھ مدد کر سکتے تھے تو وہ ۱۵ اگست سے پہلے ہی کر سکتے تھے۔ اس کے بعد وہ وائسرائے نہ تھے فقط گورنر جنرل تھے اور اپنی حکومت کی رائے پر عمل کرنا ان کا آئینی فرض تھا۔

اس وقت تک حالات ایسے تھے کہ مستقبل کا صحیح اندازہ

جہاں تک والیان ملک کا تعلق تھا نہ وبیرائے کو تھا اور نہ گورنمنٹ ہندوستان کو تھا۔ وبیرائے نے یہ بھی کہا تھا کہ نئی گورنمنٹ کو اس پر اعتراض نہ ہوگا کہ والیان ملک شاہ انگلستان سے براہ راست تعلق رکھیں اور انھیں خطابات دیئے جائیں۔ یہ ایک ایسی تجویز تھی کہ جو عمل کیے جانے کے قابل ہے یہ ہندوستان کی گورنمنٹ اور والیان ملک کے درمیان اور بھی شکوک اور منافرت پیدا کردیتی۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ بادشاہ خود بھی پرنس سے تعلق کے انقطاع کو پسند نہیں کرتے۔ ان کا خیال تھا کہ (Paramountcy) تو نہیں رہے گی لیکن (Indian Dominion) کا بڑا بھائی ریاست کے چھوٹے بھائی کو ضرور متاثر کرے گا۔

اسی گفتگو سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آیندہ ہونے والے حالات کی صحیح تصویر ان کے دماغ میں نہ تھی۔ ۱۷ جون کے روزنامچہ میں یہ بھی ہے کہ میں نے لیاقت علی خاں مرحوم کے ساتھ لنچ کیا اس ملاقات میں مرحوم نے مجھ سے کہا "جب جناح صاحب نے مسلم لیگ کے ممبر گورنمنٹ کے واسطے انتخاب کئے تو ان سے کہا کہ میں نے ایسی ٹیم دی ہے جو تمہارے کہنے پر کام کریگی اب کوشش یہ ہو کہ گورنمنٹ ناکام رہے"۔ لیاقت علی خاں مرحوم نے یہ بھی کہا کہ اگر یوپی سے کوئی اور شخص ہوتا تو ہم میں اتحاد عمل ہوتا۔ مرحوم کا اشارہ اسی فقرے سے خلیق الزماں صاحب اور نواب اسماعیل خاں مرحوم کی طرف تھا۔ مجھے اس فقرے سے لطف یوں آیا کہ جب اخبارات میں لیگ کے ممبران حکومت کے نام سے شائع ہوئے تو میں نے کہا تھا کہ "یہ ٹیم توڑنے کے لئے ہے۔ کام کرنے کیواسطے نہیں ہے۔" نتیجہ وہی ہوا کہ جو لازمی طور پر ہونا تھا۔ اتحاد عمل کے

بجائے اختلاف آرا نے دشواریاں اتنی پیدا کیں کہ حکومت چلانا عذاب ہوگیا۔

شب کے کھانے پر میں نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور سر ایرک میول کو کھانے پر مدعو کیا۔ ڈنر کے بعد انہوں نے کہا کہ دیسرائے کا یہ منشا ہے کہ برار کے متعلق ہم لوگ پنڈت جواہر لال نہرو سے گفتگو کریں۔ میں نے کہا کہ وہ تو اس میں کوئی فریق نہیں ہے۔

ہم نے برار برٹش کو دیا اور فریقین برٹش حکومت اور ہم ہیں وہ ہماری اخلاقی اور قانونی پوزیشن مانتے تھے مگر کہتے تھے کہ عملی دشواریاں ہیں قانوناً حیدرآباد کا دعوےٰ درست ہے لیکن حالات زمانہ کے لحاظ سے ناقابل عمل ہے۔ برٹش حیدرآباد کے دعوے کی صداقت کے تو قائل تھے مگر حالات ایسے تھے کہ مان نہیں سکتے تھے۔ اگر نظام معاوضہ پر راضی ہوتے تو ممکن تھا کہ حکومت ہند بیس پچیس ۲۰-۲۵ لاکھ روپیہ سالانہ کچھا اور دیتی رہتی۔ بہر حال سر والٹر مانکٹن اور میں نے اپنا فرض ادا کیا۔ اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور سر ایرک میول نے چلتے وقت کہا کہ ہمیں آپ کی رائے سے اتفاق ہے۔ مجھے اس وقت بے ساختہ فراق گورکھپوری کا ایک شعر یاد آگیا۔

دیکھا پیدا کرتے دونوں میں۔ ایمانوں کو دے ٹکرائے
بات وہ کہہ اے عشق کہ دل میں سب قائل ہوں کوئی نہ مانے

صورت حال یہ تھی کہ کانگریسی حکومت بجا طور پر یہ کہہ سکتی تھی کہ حیدرآباد کا معاہدہ برٹش گورنمنٹ سے تھا۔ ہندوستان کی قومی گورنمنٹ اس میں فریق نہیں اور اگر آپ چاہیں تو وہاں کے لوگوں کی رائے لے لی جائے کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔

۱۸ جون کو میں اور سر والٹر جناح سے ملے مسٹر جناح نے ایک

بیان اخباروں میں دیا تھا جس میں ریاستوں کی حمایت کی ہم نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

برار کے متعلق مسٹر جناح کی اور میری ایک رائے تھی۔ وہ برار کو حیدرآباد کے واسطے کینسر خیال کرتے تھے وہ معاوضہ لینے کے موافقت میں تھے! انکے الفاظ یہ تھے۔

YOU HAVE GOT A WHIPIN HAND, TAKE ADVANTAGE OF IT TO GET SOME GOOD COMPEN-SATION

میری رائے بھی یہی تھی مگر نظام اس کے مخالف تھے۔ وہ اس انقلاب کی بنیادی حیثیت کا تصور نہیں کر سکتے تھے۔

شب کو میں نے ڈنر پر پنڈت جی انکی صاحبزادی مسز گاندھی (جواب بفضلہ وزیر اعظم ہیں) ڈاکٹر راجندر پرشاد۔ سردار بلدیو سنگھ اور مسز شنکر لعل کو بلایا۔ بہت دوستانہ فضا میں باتیں ہوتی رہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو یہ بتاتے رہے کہ انقلابی روسی اور اسی زمانے کے روس کی پالیسی میں متعلق ملکیت مذہب، طلاق اور نکاح کیا فرق ہوا۔ میں نے پنڈت جی سے کہا کہ NEGOTIATION کے واسطے کب حاضر ہوں۔ خندہ پیشانی کے ساتھ فرمایا کہ جب دل چاہے۔ کاش پنڈت جی سے گفت و شنید ہوتی تو ممکن ہے کہ جو کچھ ہوا اس سے بہتر نتیجہ نکلتا۔ لیکن حیدرآباد میں یہ فضا تھی کہ جن کے ہاتھ زمام سلطنت آگئی تھی ان سے بات کرنا نظام کے ساتھ غداری تصور کیا جاتا تھا اور جو ہتھیار ڈال کر ہندوستان سے رخصت ہو رہے تھے ان سے اپنے درد کے مداوے کی توقع تھی۔

۱۹؍جون کو علی گڑھ ہو کر ۲۱؍ کو دہلی آیا اور حیدرآباد کو روانہ ہو گیا ۲۳؍ جون سرکار میں حاضر ہوا نظام اس سے بہت خوش تھے کہ سر والٹر مانکٹن اور میاں نے بڑی جرات اور ہمت سے دہلی میں گفت و شنید کی۔

اعلیٰ حضرت "جرأت و ہمت" کے الفاظ ایسے موقع پر جب

حکومت ہند سے بات چیت ہو ہمیشہ استعمال فرماتے تھے۔ لیکن اس زمانے کے حالات میں جب کہ تمام تاش کے ترپ کے پتے حکومت ہندوستان کے ہاتھ میں تھے۔ ان الفاظ کا استعمال نتیجہ خیز نہ تھا۔ طاقت کے ساتھ بہادری اور جرأت شجاعت ہے لیکن جب طاقت نہ ہو تو پھر تہور رہے جو خودکشی کا پیش خیمہ بن جاتا ہے۔

اس ملاقات میں میں نے نظام سے اس زمانے کے حالات پر بھی گفتگو کی انقلابی تبدیلیوں کے اثرات اور حال ماضی کے فرق کو عرض کیا۔ میں نے کہا کہ انگریز کا وجود بہت معنی میں تکلیف دہ اور خلش آفریں تھا۔ لیکن بہت سی صورتوں میں باعث پناہ بھی تھا۔ مثلاً اس زمانے میں جب کسی شخص یا طبقہ کو ہم سے شکایت ہوتی ہو تو وہ RESIDENT سے ہماری شکایت کرتا تھا اور زیادہ سے زیادہ یہ کہ دہلی کی مداخلت باعث تکلیف ہوتی تھی لیکن اسی کے ساتھ ہر بداندیش یہ بھی جانتا تھا اگر حیدرآباد کے تخت و تاج پر کوئی حملہ کیا گیا تو انگریز اپنے معاہدات کی بنا پر اس کی حفاظت کرے گا۔" آج اگر ہم سے کوئی شکایت ہو تو شاکی دہلی جاکر کانگریس کے ہائی کمانڈ سے مشورہ کرے گا۔۔۔۔ اُن کا مشورہ یہ ہوگا کہ حیدرآباد میں شورش پیدا کی جائے اور مستقل طور پر ہماری مشکلات کو بڑھایا جائے"
اس تمہید کے بعد میں نے عرض کیا کہ اس کی ضرورت کہ اس جمہوری دور کے تقاضوں کا مقابلہ کرنے کے واسطے وزرا میں ایسے لوگ مقرر کئے جائیں کہ جن کو حیدرآباد کا نیا نمائندہ خیال کریں اور جس پر انھیں اعتماد ہو۔
نظام اسے مانتے تھے اور اسی ملاقات میں یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ کسی ہندو کو صدر اعظم مقرر کیا جائے۔ میں نے اس کی تائید کرتے ہوئے

یہ کہا کہ مہاراجہ کشن پرشاد کتنے کامیاب صدر اعظم تھے۔ پھر فرمایا کہ ان کا خیال یہ تھا کہ سر سی پی راما سوامی آئیر کو ٹراونکور سے بلائیں۔ میں نے کہا کہ مجھے ڈر ہے کہ وہ اپنے آنے پر تیار نہ ہوں گے۔ میرا منشاء یہ تھا کہ کوئی حیدر آباد کے ہندو حضرات میں سے صدر اعظم ہو۔ سر سی پی پھر بھی حیدر آباد کی زبان میں "غیر ملکی" تھے اور ضرورت اس کی تھی کہ وہاں کے لوگ صدر اعظم کو اپنا نمائندہ سمجھیں اور "غیر ملکی" اس ضرورت کو کیسے پورا کر سکتا ہے۔ یہ بہت ہیجانی زمانہ تھا۔ ہر شخص کے دل و دماغ پر بحرانی کیفیت طاری تھی۔ برٹش امپائر کا آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ اور جمہوری ہندوستان کا سورج طلوع ہونے والا تھا اسی حالت میں جمہوری طرز حکومت سے لوگوں کو محروم رکھنا ناممکن تھا۔

حضور نظام نے قاسم رضوی کی تقریر کے ایک جملہ کو دہرایا جو میں اخباروں میں دیکھ چکا تھا۔ اس میں قاسم رضوی نے سر اکبر مرحوم اور سر مرزا اسماعیل مرحوم کے زمانوں کو مسلم کش زمانے سے موسوم کیا تھا اور میرے زمانہ کو دور مجہول سے تعبیر کیا تھا مجھے قاسم رضوی کے الفاظ کی تو پرواہ نہ تھی جو لوگ اہم ذمہ داریاں اٹھاتے ہیں انھیں تنقید اور تعریف دونوں سے بے نیاز ہو کر ادائگی فرض کرنا چاہیئے مگر حضور نظام کے دہرانے سے مجھے تکلیف ہوئی اور میں نے اپنی عادت کے خلاف یہ عرض کیا " اگر حقائق پر غور کیا جائے تو یہ بالکل غلط ہے۔ تو میری عادت کبھی نہیں رہی کہ میں اپنا پروپیگنڈا کروں۔ نہ اپنے ساتھ پریس کے دو تین نمائندے رکھتا ہوں کہ جو میرے ہر ہر لفظ کو اخباروں میں اچھال کر بتائیں کہ میں نے کیا کہا۔ لیکن سکندر آباد کی واپسی

برٹش حکومت سے میرے ہی زمانے میں ہوئی۔

نظام ریلوے پر جو برٹش پولیس کا تسلط تھا اس کا انقطاع میرے ہی زمانہ میں ہوا۔ حیدرآباد کی دکن ہوائی جہاز کی سروس جو بنگلور اور مدراس میرے ہی زمانہ میں ہوئی۔ ہماری کوئلے کی کانیں جو ایک انگریز کمپنی کے ہاتھ میں تھیں ان کی واپسی میرے ہی زمانہ میں ہوئی۔ تنگ بھدرا کے پانی کا جھگڑا مدراس سے میرے ہی زمانہ میں طے ہوا۔ گوداوری کی صنعتی اسکیم میرے ہی زمانہ میں بنی اگر اس پہ بھی میرے زمانہ کو دورِ مجہول کہا جائے تو خلافِ واقعہ ہے۔" میں نے یہ بھی کہا "ایک چیز اور بھی عرض کردوں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ میں انگریز کو ساتھ لے کر چلتا ہوں لیکن میں یہ عرض کروں گا کہ اگر میں ایسا کرتا تھا تو کیا غلط تھا۔ خود جب آقا (نظام) پہ قیود عائد تھے وہ خود انگریزوں کے ہاتھ بے بس تھے پھر میں انگریز کو ساتھ نہ لے کر چلتا تو نتیجہ کیا نکلتا لیکن اسی کے ساتھ پیر و مرشد یاد کرلیں کہ میرے زمانہ سے پہلے سرکار اور ریزیڈنٹ کے درمیان ہر سال ڈیڑھ سال کے بعد نہ کوئی جھگڑا ضرور ہو جاتا تھا۔ لیکن میرے پانچ گزشتہ سالوں میں کبھی ایسا ہوا" نظام نے اسے مانا۔ پھر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد ملاقات ختم ہوگئی۔

۴۶-۴۷ میں برٹش حکومت کے آخری ریزیڈنٹ سے ملا اور ان سے کہا کہ وہ برٹش فوج کو ہماری چھاؤنیوں سے ہٹائیں اور جہاں کہیں بھی ریلوے میں برٹش پولیس ہے اسے فوراً ہٹایا جائے۔ انھوں نے کہا میں لکھوں تاکہ دہلی پر وہ زور دے سکیں۔

میں نے ان سے اور باتوں کے بعد کہا کہ مجھے حیرت ہے کہ برٹش حکومت

نے ہندوستان کو آزاد حکومت دینے کا فیصلہ کر لیا تھا تو پھر نظام کی عمر
بھر کی خواہش کہ انھیں ہز میجسٹی کا خطاب دیا جائے کیوں نہ مان لی۔
گو میں جانتا تھا کہ ہز میجسٹی تو خود نیا ہے۔ بنایا ہوا تو پھر شاہِ شطرنج رہتا
انھیں اتفاق تھا کہ اگر یہ خطاب دے دیا جاتا تو کیا نقصان تھا۔ نظام مرحوم
کی یہ بڑی خواہش تھی کہ انھیں ہز میجسٹی کا خطاب مل جائے۔ میں نے بارہا اس
کے متعلق کوشش کی مگر بار آور نہ ہوئی۔ انگریزی حکومت کی طرف سے ہمیشہ
یہ کہا جاتا تھا کہ اس میں بادشاہ کا مقابلہ ہو جائے گا۔ میں نے یہ بھی کہا کہ
وہ EMPERROR ہیں مقابلہ کا سوال نہیں پیدا ہوتا بلکہ یہ ضروری ہے
شہنشاہ کے ماتحت بادشاہ ہوں۔ مگر اس پر انگریزی حکومت راضی نہیں
ہوئی۔

۲۵-۶-۴۷ کو تقی الدین اور قاسم رضوی میرے پاس آئے۔ میں
نے قاسم رضوی سے کہا کہ آپ نے میرے زمانے کو دورِ مجہول کس اعتبار
سے کہا حالانکہ کوئلہ کی کانوں کی انگریزی کمپنی سے خریداری، دکن ہوائی سروس
اکسچینج کا قیام تنگبھدرا کے پانی کی تقسیم مدراس سے سکندرآباد کی واپسی
لال گوڈھ کے رقبہ میں پولیس کے اختیارات کی واپسی۔ یہ سب کچھ میرے
ہی زمانہ میں ہوا۔ برٹش ہاتھی کے منہ سے گنا نکالنا بہت آسان نہ تھا۔
وہ شرمندہ تھے اور کہنے لگے کہ اس زمانے میں جو کچھ بھی ہوا آج حیدرآباد
کے مسلمان کا زوال آکیلے سا تھے وہ یہ سمجھ ہی نہیں سکتے تھے
کہ زمانہ کروٹ بدل چکا ہے جو کتاب ان کے پیشِ نظر تھی نہ صرف اس کا
ورق اُلٹ گیا بلکہ وہ کتاب ہی درس سے خارج کر دی گئی۔ اب نیا
کورس ہے اور نئے اساتذہ ہیں۔ جو شخص اپنی تقریر میں یہ کہدے کہ

دہلی کے لال قلعہ پر اپنا جھنڈا لگا سکے اُسے حقیقت آشنا کیسے کہا جا سکتا تھا۔

میں ۲۶ جون تا یکم جولائی تک روزانہ روزنامچہ نہ لکھ سکا لیکن اسی دوران میں ایک واقعہ قابلِ ذکر پیش آیا۔

مسٹر کرشنا مینن (جو ڈفینس کے منسٹر ہوئے اور چین کی جنگ کے نتائج کے سلسلے میں استعفیٰ دیا) مدراس سے حیدرآباد آئے نواب علی یاور جنگ نے مجھ سے کہا کہ انھیں سرکاری مہمان کر لیا جائے میں نے کہا کہ وہ حکومت ہند کے کوئی افسر نہیں ہیں۔ علی یاور جنگ اپنے گھر ٹھہرالیں۔ انھوں نے معذرت چاہی۔ وہ چونکہ نظام کے مزاج سے واقف تھے کہ اگر معلوم ہوا تو عتاب ہوگا۔ غالباً اس وجہ سے وہ کرشنا مینن کو اپنے گھر ٹھہرانے پر راضی نہیں ہوئے۔ میں نے اجازت دے دی کہ انھیں سرکاری مہمان بنا دیا جائے۔

دوسرے روز شاید ۲۸ جون کو میں نے مسٹر کرشنا مینن اور علی یاور جنگ دونوں کو کھانے پر بلایا۔ کھانے کے بعد علی یاور جنگ نے ان سے اس گفتگو کا ذکر کیا جو ان حضرات نے پہلے آپس میں کی تھی اور جس کا تعلق حیدرآباد کے مستقبل سے تھا۔ مسٹر مینن نے جو گفتگو کی وہ اس تاریخ کے روزنامچہ میں اس طرح درج ہے۔

"اس (مسٹر مینن) نے شروع ہی میں یہ صاف کر دیا تھا کہ میں کانگریس کی طرف سے کوئی ذمہ دارانہ بات نہیں کر سکتا لیکن میرا یہ خیال ہے کہ اگر حیدرآباد یہ کوشش کرے تو کانگریس اسے منظور کرے گی کہ حیدرآباد ایک

AUTONOMOUS گورنمنٹ کی حیثیت سے UNION میں رہے
لیکن حیدر آباد کو یہ ماننا پڑے گا کہ معاملات خارجہ میں
UNION حیدر آباد کی نمائندگی کرے گی اور پولیس
ایک ہی رہے گی۔ اسی طرح DEFENCE کے مسئلہ
میں حیدر آباد UNION کے ساتھ شامل ہوگا۔ الفاظ
ایسے پائے جا سکتے ہیں کہ جن سے حیدر آباد کی خود مختاری
کو بھی ٹھیس نہ لگے اور یہ سب کچھ ہو جائے۔"
اسی کے ساتھ یہ بھی کہا کہ حیدر آباد کے شہری یونین
کے شہری مانے جائیں گے اور پاکستان سے حیدر آباد
کا کوئی تعلق نہ ہوگا۔"

میں زیادہ تر خاموش ہی رہا۔ میں جانتا تھا کہ نظام اس پر تیار
نہ تھے تو پھر میرا کچھ کہنا بے سود تھا۔ وہ اسی دوستانہ گفتگو میں
خفیف دھمکیاں بھی دیتے تھے مثلاً ان کا یہ کہنا "ہم آپکو پاکستان سے
کبھی ملنے نہ دیں گے"۔ بہر حال پاکستان سے ملنے کا خواب تو حیدر آباد
میں کسی صاحب فہم کے دماغ میں نہ تھا۔

دوسرے روز صبح کو میں نے نظام سے اسی گفتگو کا ذکر پوری
تفصیل سے کر دیا۔ اعلیٰ حضرت کو بدگمانی ہوگئی اور مجھے نواب علی یاور جنگ
سے معلوم ہوا کاظم یار جنگ کے ذریعہ حکم آیا کہ مسٹر مینن سے ملاقات
کا حال بذریعہ تحریر پیش کریں اور نظام کی ناخوشی کا بھی ان پر اظہار
کیا گیا۔ اور یہ بھی کہ مجھے اس کی بنا اطلاع نہ ہو۔ نظام مرحوم بہت جلد
بدگمان ہو جاتے تھے مجھے اس پر تعجب بھی نہیں ہے

۱- ان کی ذہنی نشو و نما اور تعلیم و تربیت ایک ایسے ماحول میں ہوئی تھی جس میں آخری مغلیہ دور کی روایات درباری چالیں اور سازشیں ایک حقیقت بن گئی تھیں اور ان کا طرز فکر اس سے متاثر تھا۔

۲- برٹش حکومت کی مداخلت ان کے اختیارات میں بیحد ناگوار تھی اور یہ خیال رہتا تھا کہ دہلی کی حکومت ان کے اختیارات میں اور کم کرنا تو نہیں چاہ رہی تھی۔ اور انگریز کے جانے کے بعد یہ خیال موجود قومی حکومت کے متعلق اور بھی مضبوط ہو گیا تھا۔

نواب علی یاور جنگ ایک مسودہ نظام کو نوٹ بھیجنے کا لائے جس میں یہ بھی تھا کہ وہ اور میں کرشنا مینن سے پہلے سے واقف تھے۔ میں نے کہا کہ میں نے تو ان کا نام کبھی نہیں سنا تھا۔ میری واقفیت کیسی؟ اس پر علی یاور جنگ نے اپنی اور میری دونوں کی واقفیت کا ذکر کاٹ دیا اور نوٹ بھیجا گیا۔

۹- جولائی ۱۹۴۷ء کو میں اور سر والٹر مانکٹن، وی۔ پی۔ مینن سے جو اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے سکریٹری تھے ملے۔ ان کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ اگر حیدرآباد امور خارجہ (EXTERNAL AFF AIRS) دفاع (DEFENCE) رسل و رسائل کی حد تک ہندوستان کے ساتھ شامل ہوتے تو جملہ دیگر معاملات میں کانگریس حیدرآباد کی طرفداری کرے گی۔ مثلاً برار کا سوال۔ حیدرآباد کے واسطے بندرگاہ۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ وہ اس کی بھی کوشش کریں گے کہ ریاست میں کوئی شورش نہ ہو۔ وی۔ پی مینن بہت اعتماد سے باتیں کر رہے تھے۔

جیسے وہ جانتے ہیں کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں وہی کانگریسی حکومت کا منشا
ہے مینن بہت ذی ہوش اور دور اندیش افسر تھے ایک کلرک سے ترقی
کر کے سکریٹری حکومت ہوئے تھے۔

بخلاف مسٹر مینن کے انگریز افسران کو خود اپنے اوپر اعتماد نہیں
رہا تھا۔ اسی دور میں اور سر والٹر (SIR CONARD COURFIEED)
اور مسٹر GRIFFIN سے ملے۔ یہ دونوں والیسرائے کے سیاسی مشیر
اور سیکریٹری علی الترتیب تھے۔ ان کے متعلق میری ڈائری میں یہ فقرے
ہیں۔

"ان لوگوں کی حالت قابل رحم ہے۔ کانگریس انھیں پوچھتی
نہیں۔ چند ہفتوں میں پولٹیکل ڈیپارٹمنٹ ختم ہو جائے گا۔"

کورفیلڈ کو بہت ہمدردی تھی اور اس نے یقین دلایا کہ فوج اور پولیس
جو حکومت ہند کے ماتحت تھی جلد ہٹائی جائے گی۔ انکی ہمدردی بعد
از وقت تھی۔ جب طاقت ہاتھ سے نکل گئی تو پھر لفظی ہمدردی کی کوئی
قدر و قیمت نہیں رہتی اسی ملاقات میں انھوں نے یہ سوال کیا کہ اگر گورنمنٹ
فوج کو ہٹانے پر تیار نہ ہو تو آپ کیا کریں گے۔ میں نے جو حقیقت تھی
بیان کی کہ ہم میں کیا طاقت تھی جو ہم کچھ کر سکتے تو پھر انھوں نے جھلا
کر کہا تو پھر آپ خود مختاری کا اعلان کیوں کرتے ہیں۔ ان کا یہ اعتراض
بالکل بجا اور درست تھا جس سے مجھے اتفاق تھا۔" ہماری حالت یہ
تھی کہ لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں۔" لیکن نظام ایسی صورت حال
کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ میں نے جواب کے طور پر کہا کہ پولٹیکل ڈیپارٹمنٹ
نے ہمیں اس قابل ہی نہ رکھا کہ ہم کچھ کر سکیں تو سر کونراڈ بولے "اگر

پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ نہ ہوتا تو پرنسس بھی غائب ہو گئے ہوتے۔" مجھے اِس سے اتفاق ہے میں نے کہا کہ ہاں بہت سے غائب ہو گئے ہوتے مگر جو رہ جاتے وہ طاقتور بادشاہ ہوتے۔

مجھے اس کا یقین ہے کہ والیانِ ملک میں سے بہت سے برٹش حکومت ہی کی وجہ سے قائم رہے۔ لیکن برٹش حکومت ہی کی وجہ سے وہ اپنی رعایا سے بے نیاز ہو گئے اور کوئی تعلق راعی اور رعایا میں باقی نہ رہا۔ بعض پرنس یہ چاہتے تھے کہ وہ اپنی ریاست میں جمہوری طرز حکومت جاری کریں۔ مثلاً سابق مہاراجہ بڑودہ۔ مگر ریذیڈنٹ کا مشورہ جہاں تک میں نے سنا یہ تھا۔ کہ اگر وہ ایسے کریں گے تو دوسرے والیانِ ملک کی پوزیشن ان کی رعایا کی نظر میں خراب ہو گی۔

اسی روز شب کے ۹ بجے میں اور سر والٹر مسٹر جناح سے ملے۔ اسی روز کی ڈائری سے نقل کر رہا ہوں۔

"مسٹر جناح نے بہت زور کے ساتھ ہمیں متنبہ کیا کہ وائسرائے کے دباؤ میں نہ آئیں۔"

I warn you Nawab Saheb it is your responsibility don't be influenced by the Viceroy. I tell you please keep it secret until it is announced that he is Governer General of Hindustan and I am of Pakistan.

مسٹر جناح نے یہ بھی کہا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی یہ خواہش تھی کہ وہ دونوں جگہ کے گورنر جنرل ہوں لیکن مسٹر جناح نے ان سے یہ کہا کہ وہ صرف دو آدمیوں کو اس قابل سمجھتے ہیں "یا تو مسٹر چرچل گورنر جنرل پاکستان ہوں اور اگر وہ نہیں آسکتے تو پھر میں"۔

یہ سچ ہے کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی یہ خواہش تھی اور یہ ظاہر ہے کہ ان کی بڑی نیک نامی تھی کہ مسلم لیگ اور کانگریس میں کتنا بھی اختلاف ہو مگر جہاں تک لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی ذات ہے دونوں کو اُن پر اعتماد ہے۔

ممکن ہے بعض حضرات کو میری رائے سے اختلاف ہو مگر میرا یہ خیال ہے کہ مسٹر جناح نے بڑی غلطی کی کہ جس کا ثمرہ تمام ملک کو اٹھانا پڑا۔ اگر ایک ہی شخص عبوری دور کے تین چار ماہ کے واسطے وائسرائے اور گورنر جنرل ہوتا تو اتنا کشت وخون پورے ملک میں نہ ہوتا کشمیر کا قصہ بھی بہ آشتی طے ہوجاتا کہ جس سے دونوں کو شکایت نہ ہو۔ کشمیر پر قبائل کا حملہ نہ ہوتا۔ آپس میں اگر اتحاد بھی نہ ہو تو اتفاق سے دونوں ملک شروع کرتے اور ہندوستان اور پاکستان میں جو ۱۹۶۵ء میں جو چھ سات روز کی لڑائی ہوئی جس کی اصل وجہ کشمیر ہی کا معاملہ تھا نہ ہوتی یہ وہ پہلی اینٹ تھی جو ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کی عمارت کی بنیاد میں ٹیڑھی رکھدی گئی اور پھر دیواروں میں کجی ہونا لازمی ہو گیا۔ دونوں گورنر جنرل اپنے اپنے ملک کے طرفدار ہو گئے۔ ایک دوسرے کو حریف سمجھنے لگے۔ موانست تو درکنار مصالحت بھی باقی نہ رہا۔

نظام کی طرف سے ایک خط وائسرائے کو لکھا طے پایا۔ اور سر
والٹر مانکٹن نے اس کا مسودہ تیار کیا۔ نظام نے منظوری کے بعد یہ حکم دیا
کہ مسٹر جناح کو دکھانے کے بعد دیا جائے۔ سر والٹر مانکٹن اور علی یاور جنگ
دہلی میں تھے۔

۲۳ جولائی کو میں بھی ریل سے دہلی گیا چونکہ گاڑی لیٹ تھی اور مسٹر
جناح سے ملاقات کا وقت ڈھائی بجے تھا۔ میں اسٹیشن سے سیدھا مسٹر
جناح کے یہاں گیا۔ یہاں علی اور سر والٹر موجود تھے۔ مسٹر جناح اس سے اختلاف
کر رہے تھے کہ کوئی خط ایسا وائسرائے کو لکھا جائے جیسا مسودہ سر والٹر
نے لکھا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ خط ایک دوسرا طریقہ تھا۔ ہندوستان کی
یونین میں شرکت کرنے کا۔ انھوں نے اپنے بکس سے نکال کر اعلیٰ حضرت
نظام کا خط بھی دکھایا۔ نظام نے اسی زمانے میں انھیں خطوط بھیجے۔ مسٹر
جناح نے کہا کہ یہ خط میرے اوپر بڑی ذمہ داری ڈالتے ہیں۔" میں یہ اجازت
نہیں دیتا کہ یہ خط بھیجا جائے لیکن مسٹر جناح اس پر تیار تھے کہ اگر حیدرآباد
اور ہندوستان میں Offencive & Defencive alliance ہو جائے یا
تو کر لی جائے۔ وہ اس کے بھی خلاف تھے کہ حیدرآباد جیسا کہ اس مسودہ
میں تھا پاکستان کے معاملہ میں غیر جانب دار رہے۔ مسٹر جناح کا خیال
تھا کہ جب پاکستان بن جائے تو ایسی ALLIANCE حیدرآباد پاکستان
سے بھی کر لے۔

جس وقت مسٹر جناح نظام کا خط نکال رہے تھے تو نواب علی یاور
جنگ کی نگاہ کچھ کاغذات پر پڑی اور ملاقات کے بعد جب باہر آئے
تو انھوں نے کہا کہ ہمارے خط کا مسودہ عبدالرحیم کے ذریعہ سے (جو

اتحاد المسلمین کے ممبر تھے اور وزراء میں شامل کر لئے گئے تھے) مسٹر جناح کے پاس پہونچا۔ سر والٹر مانکٹن، علی اور مجھ کو اس سے بہت تکلیف پہونچی کہ نظام نے بغیر ہمارے علم اور اطلاع کے ایسا خط مسٹر جناح کو لکھا مسٹر جناح کا خیال تھا کہ ہمارا خط کا ایک دوسرا طریقہ ہندوستان کی یونین میں شرکت کا تھا۔ یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ ہماری دشواریاں کتنی بڑھ گئیں۔ کانگریس گورنمنٹ اور خاص کر سردار پٹیل کو اس پر راضی کرنا کہ حیدرآباد کے ساتھ اور ریاستوں سے معاہدہ کیا جائے دشوار تھا اور والیانِ ملک ACCEDE کریں اور حیدرآباد انھیں تین صیغوں پر TREATY یا معاہدہ کرے۔ اس پر حکومت ہند کو راضی کرنا آسان نہ تھا۔ لیکن نظام اگر ہر معاملہ میں مسٹر جناح سے مشورہ لیتے ہیں پھر کوئی فیصلہ ہونا محال ہوگا۔ ہمارے اور مسٹر جناح کے نقطۂ نظر میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ ان کا نظریہ پاکستان کی مصالح اور پالیسی کے لحاظ سے تھا کہ جو ایک الگ ملک بن گیا تھا۔ ہمارا نظریہ یہ تھا کہ ہندوستان کی گورنمنٹ سے کن شرائط پر فیصلہ کریں۔ مانکٹن نے مجھ سے کہا کہ حیدرآباد کو اس سے بہتر شرائط نہیں مل سکتے جس سے مجھے اتفاق تھا۔ مانکٹن بہت پریشان اور ناخوش تھے۔ اول تو ذاتی طور پر انھیں یہ ناگوار تھا کہ ان کے مسودہ پر کوئی اور نظر ثانی کرے۔ وہ ایک بہت ممتاز بیرسٹر تھے جو شاہی خاندان کے مشیر قانونی رہتے۔ اور انگلستان کی حکومت کے کابینہ کے ممبر دو بار رہے۔ انھیں بجا طور پر یہ ناگوار تھا۔ پھر ہماری اور مسٹر جناح کی پالیسی میں بنیادی اختلاف تھا۔ وہ پاکستان کے نقطۂ نظر سے چیزوں کو دیکھتے تھے۔

جہاں ان کے ہم مذہب لوگوں کی اکثریت تھی۔ حیدرآباد ہندوستان کے وسط میں تھا جہاں اقلیت یعنی ۱۳ فی صد مسلمان اکثریت پر حکمراں تھے۔ غرض میرے اور ان کے واسطے یہ صورت بہت پریشانی کا باعث ہوگئی

نظام کے اس خط میں جس سے مسٹر جناح کو اختلاف تھا نظام نے وائسرائے کو یہ لکھا تھا کہ اگر ہندوستان کی تقسیم نہ ہوئی ہوتی تو مجھے شرکت میں آسانی ہوتی مگر جب تقسیم ہوگئی تو جب تک میں یہ نہ دیکھ لوں کہ ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کیسے رہتے ہیں شرکت نہیں کر سکتا۔ میرے خیال میں مسٹر جناح کو جس خط کے حصّہ سے اختلاف تھا وہ حسب ذیل ہے۔

I am fully prepared to enter into a treaty with them whereby a suitable arrangement is made in respect of land communications, so that all-Indian Standards are recognised, and Hyderabad contributes to the defence of the Dominion by a system analogous to that now in force under the Indian States Forces scheme. Moreover, I should be willing to agree in this treaty to conduct the External affairs of my State in confirmity with the Foreign policy of the Dominion of India. But it would be necessary for me to provide against possibility, which I earnestly hope will never arise in fact, that the two new Dominions might persue a mutually hostile policy. In that case, it would be unthinkable for my troops to be used against the Dominion of Pakistan and it would have to be provided that Hyderabad in such an event would be neutral.

مسٹر جناح نے اسی روز مجھے پھر ٹیلی فون کیا کہ ۹ بجے شب کو ان سے ملوں۔ میں گیا اور مجھے یقین ہوگیا کہ جیسا نواب علی یاور جنگ نے کہا تھا صحیح تھا اور مسٹر جناح کے پاس تمام کاغذات کی نقل عبدالرحیم کے ذریعہ سے پہنچی۔ مسٹر جناح نے مجھ سے یہ بھی کہا:

"I DONOT CARE WHAT ABDUR RAHEM SAYS BUT- I DO THINK THAT- THE LETTER SHOULD NOT BE ISSUED TEAR IT OFF"

مسٹر جناح کی گفتگو سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عبدالرحیم نے اس خط کے مسودہ پر PROTEST کیا۔

میں نے اِس ملاقات میں مسٹر جناح سے یہ بھی کہا کہ جب وہ ہمارے اِس خط کے مسودہ سے متفق نہیں ہیں تو کیا مشورہ دیتے ہیں۔ ان کا جواب یہ تھا STAND STILL معاہدہ کر لیا جائے اور اس کے بعد جو حکومت ہند اپنی تجویز دیں مسٹر جناح سے مشورہ کیا جائے۔

حضور نظام کا بغیر ہم لوگوں کے علم و اطلاع مسٹر جناح کو خط لکھنا اور مسٹر جناح کا ہماری تجاویز مسترد کرنا اتحاد پارٹی کے ذریعہ سے ہماری تجاویز کا علم مسٹر جناح کو ہونا یہ تمام باتیں ایسی تھیں کہ جو میرے لیے اور سوائے عبدالرحیم میرے شرکائے کار کے لئے ناقابلِ برداشت تھیں اور حیدر آباد کے معاملہ کو سلجھانا نہ صرف مشکل بلکہ محال بنا دیتی تھیں۔

۲۷ – ۷ میں نے آج والسرائے کو خط لکھا کہ ہم سے یہ کہا گیا تھا کہ حیدر آباد کے متعلق میٹنگ ہمارے وفد سے ہو گی ہم لوگ آ گئے مگر ہنوز ہمیں کوئی اطلاع نہیں ملی۔ اِس پر وائسرائے کے پرائیویٹ سکریٹری نے یہ کہا کہ دوسرے روز جو والیانِ ملک کی میٹنگ تھی اس میں ہم شریک ہوں میں نے کہا کہ ہم سے کہا گیا تھا کہ ہماری گفتگو علیحدہ ہو گی۔ اس پر پرائیویٹ سکریٹری نے یہ کہا کہ وہ میٹنگ اسی غرض سے ہو گی کہ آپ شریک ہونا چاہتے ہیں یا نہیں۔ مگر اور اغراض کے واسطے نہیں۔

ہم لوگوں نے یہ طے کیا کہ میں تو شریک نہ ہوں مگر علی یاور جنگ۔ عبدالرحیم اور بھنگل وِنکٹا ریڈی شریک ہوں چنانچہ یہ لوگ شریک ہوئے۔ ویسرائے نے اپنی تقریر میں بہت زور ڈالا کہ وہ سب ہندوستان کی یونین میں شریک ہو جائیں۔

مجھے تحقیقی ذرائع سے معلوم ہوا کہ ولایت میں ویسرائے کی اس تقریر کو پسند نہیں کیا گیا اور وزیر ہند نے انھیں لکھا کہ وہ حدود سے آگے بڑھ گئے میری رائے میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن پر اس غلطی کا اثر پڑا کہ جو مسٹر جناح نے ان کے دونوں جگہ کے گورنر جنرل ہونے میں اختلاف کیا تھا۔

مجھے دو ایک روز کے واسطے حیدر آباد جانا تھا تا کہ نظام کو بتاؤں کہ مسٹر جناح اس کے خلاف ہیں کہ ہم کوئی معاہدہ ہندوستان سے امور خارجہ دفاع اور رسل و رسائل پر کریں۔ میں نے سر والٹر سے مشورہ کیا کہ جب حضور نظام ہر تجویز پر مسٹر جناح کا مشورہ ضروری خیال کرتے ہیں تو ان کے مشورہ کے نتائج کی ذمہ داری بھی ان کی ہونی چاہیے۔ میں جانتا تھا کہ مسٹر جناح ایسی ذمہ داری نہیں لے سکتے تھے۔ مگر اول تو جو مشورہ دیں یہ اس کا فرض ہے کہ اس کے نیک و بد نتائج کی ذمہ داری لے۔ اور دوم یہ کہ حضور نظام کو یقین ہو جائے کہ اگر ان کے مشورہ سے ہندوستان کی حکومت اور حیدر آباد کے تعلقات خراب ہو گئے تو مسٹر جناح اس کی تلافی نہ کر سکیں گے اور انکی رائے پر عمل کرنا مفید نہ ہوگا۔ سر والٹر نے اس تجویز کو بہت پسند کیا۔ چنانچہ اسی دوران میں دو ایک روز کے واسطے میں حیدر آباد گیا اور حضور نظام سے میں نے کہا کہ جب وہ ہر معاملہ میں مسٹر جناح کا مشورہ ضروری خیال کرتے ہیں تو پھر مسٹر جناح سے یہ

بھی پوچھا جائے کہ اگر ان کے مشورہ پر عمل کرنے کا نتیجہ یہ ہو کہ حیدرآباد اور ہندوستان کے تعلقات خراب ہوں۔ تو پاکستان ہماری کیا مدد کر سکتا ہے۔ سرکار نے اس تجویز کو منظور کیا اور مسٹر جناح کے نام خط ۲۹ جولائی کو لکھا گیا۔

حیدرآباد میں عبدالرحیم صاحب نے ہمارے کاغذات قاسم رضوی کو دکھائے اور غالباً جو دہلی میں گفتگو ہوئی اسے بیان کیا۔ قاسم رضوی نے ایک بیان اخباروں میں دیا کہ جس میں مجھ پر علی یاور جنگ اور سر والٹر پر غیر اعتمادی کا اظہار کیا گیا۔ جس سے ہم سب کو تکلیف اور ناگواری ہوئی۔ سر والٹر نے اس کمیٹی ہی سے استعفیٰ دے دیا کہ جو گفت و شنید کے واسطے مقرر ہوئی تھی۔

۴-۸-۴۷ آج مسٹر جناح سے پھر ملاقات ہوئی۔ علی یاور جنگ اور عبدالرحیم صاحب بھی ساتھ تھے۔ میں نے H-E-H کا خط معہ نوٹ مسٹر جناح کو دیا جس میں جان سخن وہی حصہ تھا کہ جو اس سے متعلق تھا کہ اگر مسٹر جناح کے مشورہ پر عمل کرنے کا انجام یہ ہو کہ حیدرآباد اور ہندوستان کے تعلقات خراب ہو جائیں تو مسٹر جناح کیا مدد دے سکیں گے؟

If a settlement could be reached now, His Exalted Highness would be likely to get good terms in relation Berar, a customs agreement, the use of a Port and full recognition of his internal autonomy in all respects. Otherwise, His Elated Highness feels sure that Congress will make every effort by means, that are indirect and not manifestly provocative, to make the economic and political position of Hyderabad intolerable and, as Mr. Jinnan knows, with a large Hindu population there would be limits to the State's power of resistance to such a pressure.

In these circumstances, before making up his mind what attitude to adopt at this vital juncture, His Exalted Highness must know in black and white what steps Mr. Jinnah could take to assist and rescue Hyderabad of if this pressure were adopted. Could Mr. Jinnah guarantee to get supplies of food, salt and kerosene oil and other goods in which Hyderabad could be made a deficit area, introduced into the State? To what extent could Mr. Jinnah provide the State with arms and equipment and, if necessary, with troops? If economic pressure can be shown to be used against Hyderabad, what effective steps could be taken by Pakistan in time to rescue the State from its predicament? If Congress supporters inside the State revolted and were indirectly assisted by Congress forces in the Dominion of India, what assistance could His Exalted Highness expect from Pakistan? How could Hyderabad hope to get an outlet to the sea without the co-operation of the Dominion of India?

مسٹر جناح نے بہت لمبی تقریر کی آخر میں میں نے کہا کہ وہ نظام کے خط کا تحریری جواب دیں انھوں نے کثرت مشاغل اور مصروفیت کی بناء پر معذرت چاہی۔ آخر میں یہ طے پایا کہ نواب علی یاور جنگ اس ملاقات کا ایک نوٹ لکھ کر مسٹر جناح کے سامنے پیش کر دیں اور وہ اس پر دستخط کر دیں۔ چنانچہ علی یاور جنگ نے نوٹ لکھا اور مسٹر جناح نے جزوی ترمیم کے بعد شب کے دس بجے اس نوٹ پر دستخط کر دیئے جس کی نقل یہ ہے

Ashok House,
New Delhi.

4th Aug., 1947.

NOTE OF INTERVIEW WITH MR. M. A. JINNAH

The Prime Minister, the Constitutional Affairs Member and the Local Government Member interviewed Mr. Jinnah on the afternoon of 4th August, the subject of interview being

the note sent by His Exalted Highness to Mr. Jinnah on 29th July. In the course of a separate interview which Sir Walter Monckton had the same day with Mr. Jinnad, Mr. Jinnah was apprised of the discussion the previous night with the Viceroy.

Mr. Jinnah said that the Viceroy and the Congress were following a policy totally contrary to the declared policy of H. M. G. H. M. G. had definitely offered the two alternatives of accession or political relations, and had also said that time would be given and that the choice would be free and voluntary. If H. M. G. had a shred of conscience, they would put a stop to the threats which were now being given both by the Viceroy and the Congress. It was highly probable that at least the Conservative party would rebel.

What had been said by the Viceroy about Berar was tentamount to daylight dacoity. It amounted to holding a Pistol at a person and making him sign the Instrument of Accession. H. M. G. had admitted the Legal and Constitutional claim of The Nizam over Berar; the Nizam had all the right on his side and what was being now threatened was the exercise of might. If, even the little that was necessary to continue the Nizam's legal title to Berar was not done it would not be much of a loss but the World would know the standard of morality which goverened the conscience and acts of the Congress party. Mr. Jinnah said that he could not believe that this would be supported by sense of Honour and the conscience of the British people.

Mr. Jinnah said that he thought if H. E. H. and his advisers had really made up their minds against accession they should stick to it, firmly and loyally. He did not believe that threats of economic sanction would be carried out but even if

they were, His Exalted Highness' line should be as follows :—

"You may do what you like and you may threaten me as you like but I shall never agree to sign any instrument of Accession or join the Union unless my conscience says that I should do so. You have no right to coerce me and I have the right to make a free choice."

He said that after all there was some such thing as standing for one's own right, despite every threat or provocation. If it comes to the worst, one should die fighting rather than yield on a point of fundamental principle. Mr. Jinnah gave the illustrations of what he called the greatest martyrdom in history, the example of Imam Husain standing for what was right and giving his life for it. All the sanctions in the world then existing were applied against him and his followers but they withstood them and suffered wholesale butchery. It was a moral triumph and they gave their lives for it. That should be the attitude which the Nizam and his advisers and the people should adopt. If it came to the worst, rather than to yield to coersion or to surrender what was right, he should be prepared to abdicate and go in last resort and show to the world that he had fought uncomprisingly for right as against might. Mr. Jinnah said that, in our own times, England had done the same against the heaviest odds. Her people had fought till the end and had reversed the position, by perseverence and conviction, from defeat to victory.

This immoral aspect of threats and coersion on the part of the Viceroy and the Congress, despite the declared policy of H. M. G. to the contrary, should be broadcast to world and be supported by propaganda so as to convince the man in the street of the wrongness of their position and the

rectitude of Hyderabad's stand for her rights. But any such declaration or announcements should contain a firm indication of absolute willingness to enter into standstill arrangements which are necessary for the advantage of both and to avoid a breakdown of the administrative machinery or the prevalence of chaos. It must be stated that Hyderabad desires to help India and herself in producing the conditions necessary for stability. If, by the time of such announcement, the Congress persists in refusing to negotiate Stand-still agreement, the entire responsibility of the consequence will rest with them. The above declaration may mention the fact that while accession was never understood to be a condition for the conclusion of Stand-still agreements and had in fact nothing to do with them, even such agreements had been refused because the State had declined to accede and had chosen the other alternative offered to the State both by His Majesty's Government and by the Political parties through their acceptance of Plan of June 3.

As regards His Exalted Highness' question as to how far Pakistan would be able to assist Hyderabad economically for politically or with troops or arms and equipment and the like, Mr. Jinnah said that it was not possible for him at present to give any specific undertaking but that, generally speaking, he was confident that he and Pakistan would come to the help of Hyderabad in every way possible. There should be no doubt on that point. He said that even Countries with long established Governments could not give specific undertakings of the nature desired except by reference to the situation as it developed. The United States could not give any such undertaking when it was first approached by the United Kingdom for help during the last war, but the United States gradually began helping on different fronts until they ultimately came into the War itself. England was very nearly beaten when, to her good fortune Hitler diverted himself from England and attacked Russia, thus bringing the latter into a natural alliance with England and saving England from the concentrated attack which might otherwise have centered upon her. Then, America which had till then kept out of the War except by the

way of moral and material help, entered the struggle as a result of the Japanese attack on her. These were providential developments without which all the odds were against England. They brought about Allied Victory. If Hyderabad was short of petrol or kerosene, it would not matter if, on the other hand Hyderabad had abundance of firmness, preserverence and courage. The Russians were threatened by a blockade against them but they won the war. If Hyderabad was similarly threatened there would be other ways to fight, not necessarily with guns if there were no guns, and not necessarily with mechanised transport if there was no petrol.

The Prime Minister thanked Mr. Jinnah for the interview and for the elucidation of his views on the different points raised by His Exalted Highness; he also said that H.E.H. would expect a written reply as he had made that request in his letter to Mr. Jinnah. Mr. Jinnah said that with all the volume of work thrust upon him and the short time left between now and the establishment of Pakistan, it would be most difficult for him to write a detailed letter answering each of the points raised by His Exalted Highness. He said, however, that the best way would be to have a record prepared of the interview. The record could then be shown to Mr. Jinnah the same night at 9.30 and, if he had any modifications to make he would make them after which he could sign the record and give it back for submission to His Exalted Highness. The Prime Minister agreed with this suggestion and the Constitutional Affairs Member was requested to prepare a record of the interview.

The above notes are correct of the interview and represent my views and I hope that H. E. H. will be firm and accept them and act accordingly and I most fervently pray to God that he would help us all as our cause is righteous.

Sd/- M. A. Jinnah,
4th August, 1947,
New Delhi.

۵-۸-۱۹۴۷ ہوائی جہاز سے روانہ ہو کر ہم سب حیدرآباد گئے
ہیں H-E-H کی خدمت میں حاضر ہوا اور مسٹر جناح کی ملاقات کا نوٹ پیش
کیا۔ نظام نے اسے پڑھا اور فرمایا کہ اس میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔
منشا یہ تھا کہ نظام کے سوال کا کوئی صاف جواب نہ تھا۔ میں
نے عرض کیا کہ بجا ارشاد ہوا اس میں کوئی خاص بات نہیں ہے اور دست
بستہ اتنا عرض کر دوں کہ سرکار نظام حیدرآباد ہیں۔ امام حسین علیہ السلام
نہیں ہیں اور یہ حیدرآباد ہے۔ میدانِ کربلا نہیں ہے۔

اس دوران میں حیدرآباد کی فضا اور بھی زیادہ مکدر ہو گئی تھی۔ میں
استعفیٰ تو ایک بار پہلے ہی دے چکا تھا۔ لیکن اب ان حالات میں یکسوئی اور
سکون خاطر سے کام کرنا ممکن نہ تھا۔ اس لئے استعفیٰ کے خیال کا اعادہ کرنا
ہی مناسب سمجھا۔ چنانچہ ۷ اگست کو میں نے بر بنائے صحت سبکدوشی کی درخواست
پیش کی۔ شام کو جواب آیا جس کا پیرایہ ہمدردانہ تھا لیکن یہ فرمایا کہ فوراً
سبکدوشی ناممکن تھی۔ چھ ماہ بعد سبکدوش کرنے کا امکان تھا۔ نقل
خط مذکور اگلے صفحہ پر ہے۔

اعلیٰ حضرت بندگان عالی متعالی مدظلہ العالی

H-E-H-THE NIZAM'S PAISHI OFFICE

KING KOTHI

HYDERABAD DECCEN

۱۸ رمضان المبارک ۱۳۶۶ھ

راز

خدمت شریف عالی جناب نواب سعید الملک بہادر صدر اعظم باب حکومت سرکار عالی

آپ کا معروضہ ۱۸ رمضان المبارک ۱۳۶۶ھ ملاحظہ فرما کر آپکو تحریر کرنے کے

لئے سرکار کا جو حکم ہوا ہے وہ حسب ذیل ہے۔

آپکی درخواست بابت سبکدوشی از خدمت (بوجہ عوارض جسمانی) کو میں نے غور سے دیکھا اور آپ کے ساتھ ہمدردی کرتا ہوں کہ حالات مبینہ کے مد نظر واقعی آپکو اب آرام لینے اور معالجہ کرانے کی ضرورت ہے۔ دوسری طرف حالات حاضرہ کس نوعیت کے ہیں وہ بھی ظاہر ہے۔ اس کے سوا کوئی قابل شخص کا سر دست ملنا آپکے جیسے اہم خدمت کے لئے بھی دشوار ہے ایسی حالت میں بعوض ایک سال کے (جو کہ معاہدہ تھا جس کو آپ نے قبول کر لیا تھا) آپکو چھ ماہ کے بعد سبکدوش کرنیکی کوشش کرونگا یعنی ماہ جنوری ۱۹۴۸ء تک) مگر اس درمیان میں آپ اپنی صحت کا خیال رکھتے ہوئے کام کریں۔

اس کمیٹی کے ساتھ جو کہ اس وقت کام کر رہی ہے اور مجھے امید ہے کہ زمانہ قریب میں ریاست حیدرآباد کے امور کی ایک سولی خاطر خواہ ہو جائیگی جس کے بعد آپ ... [illegible] کا تقرر ہونے میں آسانی ہوگی۔

مجھے امید ہے کہ میری تجویز سے آپ کو اتفاق ہوگا۔

صدر المہام پیشی

چونکہ مسٹر جناح کو ہمارے مسودہ سے اختلاف تھا لہٰذا اس میں کچھ اور ترمیم کی گئی۔ مسٹر جناح چونکہ کراچی چلے گئے تھے۔ H-E-H کے حکم کے مطابق عبدالرحیم اور نواب علی یاور جنگ کراچی چلے گئے تاکہ اسی ترمیم شدہ مسودے کو بھی مسٹر جناح دیکھ لیں اور وہ خط ویسرائے کو ۱۰ اگست کو دے دیا گیا۔

ویسرائے نے اپنے جواب میں بہت دوستانہ خط لکھا اور دو مہینے کی مہلت گفت و شنید کے واسطے دیدی۔ لیکن ACCESSION کا سوال ہنوز باقی رہا۔

۱۳تا۱۹ اگست ۱۔

میں نے سردار پٹیل کو خط لکھا کہ ہم لوگ دہلی مزید گفتگو کی غرض سے کب آئیں اور سردار پٹیل نے ۲۶ اگست تجویز کی۔ خیال یہ تھا کہ ایک روز پہلے سر والٹر اور دوسرے ممبر چلے جائیں گے اور میں ۲۶ اگست کو پہنچونگا۔ لیکن حیدرآباد کی تقدیر کی تحریر کون مٹا سکتا تھا۔ روز ایک نئی دشواری آجاتی تھی۔ ۱۹ اگست کو سر والٹر مانکٹن علی یاور جنگ اور میں اعلیٰحضرت کے پاس حاضر ہوئے اور اعلان آزادی اور اصلاحات کا مسودہ پیش کیا اصلاحات کے مسودہ پر نظام بیکایک برہم ہو گئے۔ چونکہ مسودہ علی یاور جنگ کا لکھا ہوا تھا خفگی کا زیادہ نشانہ وہ ہوئے گو بحیثیت صدر اعظم میں بھی نہ بچا۔ سر والٹر مانکٹن نے بہت کہا کہ وہ مسودہ ان کے مشورہ سے لکھا گیا تھا۔ مگر نظام کی برہمی میں کمی نہ ہوئی۔ علی یاور جنگ سے دوران گفتگو میں یہ بھی کہا کہ مسلمانوں کو اپر اعتماد نہ تھا۔ علی یاور جنگ نے استعفیٰ دے دیا۔

NEGOTIATION COMMITTEE ۳۰-۸-۴۷ کی میٹنگ تھی۔ ۲۶ تاریخ کو جن مسائل پر گفتگو کرنی تھی ان پر بحث کے دوران میں عبدالرحیم اور سر والٹر میں کچھ تیز و ترش گفتگو ہو گئی۔ سر والٹر اٹھ کر چلے آئے گفت و شنید کی کمیٹی سے تو پہلے ہی استعفیٰ دے چکے تھے۔

اب مشیر دستوری کے فرائض سے بھی علیحدگی اختیار کر لی اور استعفیٰ دے
دیا۔ دراصل اتحاد کے لوگ یہ نہیں چاہتے تھے کہ ہندوستان سے مصالحت
ہو۔ وہ یہ سمجھ ہی نہیں سکتے تھے کہ وہ حیدرآباد کو کس تباہی میں ڈال رہے
تھے۔ میں نے سر والٹر کا استعفیٰ حضور نظام کے پاس بھیج دیا۔ دوسرے روز
میری طلبی ہوئی۔ اعلیٰ حضرت پریشان تھے۔ میں نے یہ عرض کیا کہ سر والٹر کو نظام
خود بلا کر گفتگو کریں۔ میں ابھی مفاہمت کی بات چیت ہی کر رہا تھا کہ ۲۱ اگست
کے روزنامہ "پیام" میں اتحاد کی مجلس عاملہ کا وہ ریزولیوشن شائع ہوا کہ
جس میں انھوں نے سر والٹر، علی یاور جنگ اور میسکر او پر بے اعتمادی کا اظہار
کیا تھا اور یہ کہ اگر قاسم رضوی اور عبدالرحیم نہ ہوتے تو ہم لوگوں نے حیدرآباد
کو ڈبو دیا ہوتا"، گو عبدالرحیم کو اس سے انکار تھا مگر مجھے یہ معلوم ہوا کہ
یہ جلسہ مجلس عاملہ کا انہی کے گھر پر ہوا اور انھوں نے مجھ سے اس کا تذکرہ
تک نہیں کیا۔

۲۲-۸-۴۷ مجھے اور سر والٹر کو H-E-H نے طلب فرمایا اور
دست خاص سے لکھا ہوا ایک طویل نوٹ دیا اور حکم دیا کہ عبدالرحیم کو یہ نوٹ
دیا جائے اور وہ اس کے مطالب سے قاسم رضوی کو آگاہ کریں۔ اس کی
نقل عبدالرحیم لے سکتے ہیں۔ مگر اصل نوٹ واپس کر دیا جائے۔ میں نے شاہ
منزل آ کر عبدالرحیم کو بلایا اور تعمیل حکم کی اور کہہ دیا کہ ۲۳ تک جواب پیش
کریں۔

"نقل نوٹ"

۵ شوال

نواب صاحب چھتاری

آپ عبدالرحیم ممبر آف کونسل کو طلب کر کے کہو کہ باوجود میرے فرمان
شائع ہونے کے اتحاد المسلمین بے سوچے سمجھے کام کر رہی ہے کہ علانیہ

پبلک میٹنگ میں رزولیوشن پاس کر رہی ہے وگرنہ اگر کچھ لکھنا تھا تو میرے ہاں لکھ کر پیش ہوتا تو میں اس پر غور کر کے جو کچھ جواب دینا ہوتا دیتا مگر ایسا نہیں ہو رہا۔

دوسری طرف ہنوز جس طور سے آمادہ فساد ہیں وہ ظاہر ہے۔ اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ اگر مسلم طبقہ کی طرف سے اعلیٰ عہدہ داران کی توہین ہوتی رہے گی تو میں بحیثیت حکمراں اس کو جائز نہیں رکھ سکتا۔ لہذا اس کا سدباب مجھ کو کرنا ہوگا۔ اس کے سوا حیدرآباد نے جواب تک طریقہ کار اختیار کیا ہے اس سے مسٹر جناح کو اتفاق ہے ایسی حالت میں سردست گفت شنید دہلی میں نہیں ہوگی لہذا کمیٹی نیگوسیشن کو جانے کی ضرورت نہیں ہے نظر بر آں اس درمیانی وقت میں ایک خط میں وائسرائے کے نام بھجوا رہا ہوں جو کہ پریزیڈنٹ کونسل اور مشیر دستوری لے جا رہے ہیں۔ بہ حیثیت قاصد اور جو کچھ جواب وائسرائے دیں گے وہ لاکر مجھ کو پہنچائیں گے جس پر میں غور کرتے وقت کونسل کی رائے خط کے جواب کے متعلق حاصل کروں گا۔ قبل اس کے کہ کوئی قطعی کارروائی اختیار کروں۔

الحاصل عبدالرحیم کو میں حکم دیتا ہوں کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے یہ قاسم رضوی سے کہہ دیں تاکہ وہ اس سے لاعلم نہ رہیں۔ عبدالرحیم چاہیں تو اس نوٹ کی نقل لے سکتے ہیں۔ بہرحال زمانہ پُرآشوب ہے اس لئے میرے خط کا جواب وائسرائے کے دینے تک کسی قسم کی چیز یہاں منجانب اتحاد المسلمین وقوع میں نہ آئے ورنہ اس کی ذمہ داری اس پر عاید ہوگی۔

شکوری:- باوجود میری صراحت کے اگر اتحاد المسلمین اسی طرح سے کام کرتی رہے گی (منی لفافہ) تو میں مجبور رہوں گا کہ سب واقعات سے مسٹر جناح کو بتوسط تحریر آگاہ کروں۔

ضمیمہ

رحیم سے گفتگو کرنے کے بعد آپ آ کر کل مجھ کو نتیجہ سے اطلاع دیا اور اس نوٹ کی نقل اپنی مثل کے لئے رکھ کر یہ واپس لا کر مجھ کو دیا تاکہ میری مثل میں رہے۔

مجھے حیرت ہے کہ عبدالرحیم باوجود سب امور کا علم رکھتے ہوئے بہ حیثیت ممبر آف کونسل و ممبر نیگوشیشن کمیٹی انھوں نے رضوی سے سب امور کی وضاحت نہیں کی۔ معلوم نہیں کہ اس کی کیا وجہ تھی۔ حالانکہ میں ان کو ہر چیز سے باخبر سمجھتا تھا۔

مکرر:۔ کچھ عرصہ قبل میں نے رضوی کو بالمشافہ طلب کر کے گفتگو کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا کہ وہ پبلک ادارے کے پریسیڈنٹ تھے دوسرے فریق کے ساتھ بھی ایسا کرنا ضروری تھا مگر اب حالات میں کسی قدر تغیر ہوا ہے لہذا میرا ارادہ ہے کہ قریب میں کسی دن ان کو نذری باغ طلب کر کے رحیم کے ساتھ گفتگو کروں گا۔

مکرر:۔ اس امر کو بھی پوشیدہ رکھنا نہیں چاہتا کہ حالیہ اتحادالمسلمین کے رزولیوشن کی وجہ سے پریزیڈنٹ کونسل مسٹر دستوری علی یاور جنگ نے میرے ہاں استعفیٰ پیش کر دیا ہے مگر میں نے ان لوگوں سے کہہ دیا ہے کہ جب تک میں خود مناسب نہ سمجھوں گا استعفیٰ کو منظور نہیں کر سکتا۔ لہذا وہ کام کرتے رہیں کیونکہ حکمران ہی ایک ایسا شخص ہے جو ہر چیز کے مالہ وما علیہ کو سمجھ کر تصفیہ کرتا ہے جیسا کہ میں نے اپنے سابقہ فرمان میں بیان کر دیا تھا۔

اس ملاقات میں بھی عبدالرحیم صفائی قلب اور خلوص سے بات نہیں کر رہے تھے۔ زبان سے سب کچھ ہوا فقط میں کہتے تھے مگر دل سے نہیں۔

۲۷-۸-۴۳ (میں) نے حسب الارشاد اعلیٰ حضرت کا دستی نوٹ واپس

کیا اور عبدالرحیم کا جواب پڑھ کر سنایا۔ (میسکر یرانے کاغذوں میں اصل محفوظ ہے) نوٹ کے جواب میں عبدالرحیم کا خط "نورٌ علیٰ نور" تھا۔ اس کی نقل حسب ذیل ہے۔

عالی جناب صدر اعظم بہادر۔

"میں نے حسب الحکم سرکار مولوی سید قاسم رضوی کو واقعات مندرجہ فرمانِ مبارک تبلانے کی سعادت حاصل کی"

۱۔ "رضوی صاحب نے کوئی جواب دینے سے انکار کیا اور یہ کہا کہ اس سے پہلے پیر و مرشد نے خود کسی عرض اور معروضہ سے منع فرما دیا ہے۔

۲۔ میں نے ان سے دریافت کیا کہ کسی بات کو پبلک کرنے سے پہلے آپ سرکار سے عرض کیوں نہیں کرتے۔ تو رضوی صاحب نے جواب دیا کہ سرکار کو معروضوں کے ذریعہ عرض کئے بغیر کوئی بات میں نے پبلک نہیں کی"

میں نے جب باریابی ہوئی تو یہ خط عبدالرحیم صاحب کا اعلیٰ حضرت کو پیش کیا۔ روزنامچہ میں یہ الفاظ ہیں۔

"میں نے اس خط کو بار بار پڑھ کر سنانے کی کوشش کی مگر سرکار توجہ کرنے سے گریز فرماتے تھے۔ بالآخر فرمایا تو یہ کہا اس کا تو مجھے کوئی علم نہیں تھا" یہ صورتِ حال میرے واسطے بحیثیت صدر اعظم تکلیف دہ تھی۔

اب سر والٹر کی بددلی رفع کرنے کا سوال تھا۔ میں نے لائق علی صاحب کو بلا کر مشورہ کیا۔ انکی رائے تھی کہ قاسم رضوی اور سر والٹر مل کر گفتگو کر لیں اور لائق علی دونوں کو ناشتہ پر بلالیں۔ میں نے اتفاق کیا۔ دوسری طرف سرکار نے وائسرائے کو خط لکھا کہ سر والٹر پر زور دیں کہ وہ ولایت واپس نہ جائیں۔

۲۷-۸-۲۵- میرے خیال میں یہ آیا کہ پھر استعفیٰ پیش کروں مگر صفیر صاحب مرحوم کا یہ خیال تھا کہ زبانی نظام سے گفتگو کر کے اسے طے کر دوں۔ کسی مناسب موقع پر عرض کروں گا۔ حضور نظام کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اعلیٰ حضرت نے دریافت کیا کہ وہ قاسم رضوی کو بلا کر بات چیت کرنا چاہتے ہیں وہ کھل کر قاسم رضوی سے بات کریں۔ میں نے عرض کیا "جو شخص مالک کے ارادوں کا احترام نہ کرے وہ اِس قابل نہیں کہ اس سے کھل کر بات چیت کی جائے"۔ میرا اشارہ عبدالرحیم کے اس خط کی طرف تھا کہ جس کی نقل اوپر لکھ چکا ہوں۔ جس میں قاسم رضوی نے یہ کہا تھا کہ "سرکار کو معروضوں کے ذریعہ عرض کئے بغیر میں نے کوئی بات پبلک نہیں کی"۔ اس پر اعلیٰ حضرت نے "بہت ٹھیک" دو بار فرمایا۔ پھر لائق علی کے متعلق دریافت کیا کہ ان سے نظام کھل کر بات چیت کریں یا نہیں۔ میں نے کہا کہ لائق علی بہت معقول اور ذی ہوش شخص ہیں۔ سرکار ان سے کھل کر بات کر سکتے ہیں۔ لیکن مسٹر جناح کے ان سے تعلقات ہیں اس کا خیال رہے۔

آج لائق علی آئے اور میں نے سرکار نظام کا حکم کہ وہ اپنی موجودگی میں سر والٹر اور قاسم رضوی سے مفاہمت کرا دیں۔ پہونچا دیا۔ پھر لائق علی بہت دیر تک یہ کہتے رہے کہ انھیں نہ گفت و شنید کی کمیٹی کی رکنیت چاہیے اور نہ وزارت یہ چیزیں ان کے دائرۂ عمل سے باہر تھیں اور بقول ان کے انھوں نے اس خیال کا اظہار اتحاد پارٹی پر بھی کر دیا ہے۔ میں یہ سوچتا رہا کہ اس تقریر کا کیا موقع تھا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ چار پانچ روز پہلے صدارت عظمیٰ کے سلسلے میں زین یار جنگ مرحوم نے کہا تھا کہ اتحاد پارٹی کی طرف سے ایک عرض داشت نظام کو دی گئی ہے جس میں لائق علی صاحب اور جہاں [illegible] کا نام پیش کیا ہے لیکن پتہ یہ [illegible] ہوا [illegible] انھوں نے یہ تقریر کی۔ کاش انھیں یہ معلوم ہوتا کہ میں اس قدر دل برداشتہ ہو گیا تھا کہ اگر کوئی [illegible] اور شخص صدر اعظم

ہوجائے تو مجھے رہائی نصیب ہو اور میں اس کا شکریہ ادا کروں۔

۲۴؍ اگست کو سرکار نے ویسرائے کو تار دیا کہ وہ سر والٹر مانکٹن کو سمجھائیں کہ وہ استعفا واپس لیں اور ولایت نہ جائیں۔ ۲۶؍ کو جواب آیا ویسرائے نے مانکٹن کو دہلی بلایا اور وہ چلے گئے۔

۲۸؍ اگست سرکار نے مجھے وہ تار دکھایا جو گورنر جنرل (۱۵؍ اگست کے بعد ویسرائے نہیں رہے تھے) نے سرکار کو دیا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ اگر حیدرآباد اسی طرح پس و پیش کرتا رہا تو حیدرآباد کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے گا جو اور ریاستوں کے ساتھ کیا گیا تھا۔ اور کوئی امتیازی شکل نہ ہو سکے گی۔ اس تار میں اس کا بھی اشارہ تھا کہ حیدرآباد میں رائے عامہ کے ذریعہ سے معلوم کیا جائے کہ وہاں کے لوگوں کی اکثریت کی کیا خواہش ہے۔

اس تار سے نظام بھی پریشان ہوئے اور جب میں نے یہ تار معین نواز جنگ، لائق علی صاحب اور عبدالرحیم کو دکھایا تو ان کی صف میں بھی انتشار پیدا ہوا لیکن یہ کیفیت تجربہ سے معلوم ہوا کہ عارضی تھی۔

حیدرآباد جب بھی تھا اور اب بھی ہے۔ جغرافیہ کے اعتبار سے ملکوں میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ حکومتیں بدلتی ہیں۔ افراد کی تقدیریں بدلتی ہیں۔ ترقی و تنزل کے چکر اسی طرح کارفرما ہوتے ہیں کہ ع

زمیں پیما کو آسماں کہنا ہی پڑتا ہے

مجھے فکر تھی کہ آصفیہ خاندان کو جتنا ممکن ہو ان انقلابات کے اثر سے بچا لیا جائے اور وہ حکومت ہند سے مصالحت سے ممکن تھا ورنہ نہیں۔ جو مستقبل کی تصویر میرے ذہن میں تھی اس کا یقین حیدرآباد کے لیڈروں کو نہ تھا۔

وہ بدگمان تھے اور حضور نظام کو میرے ہم خیال لوگوں سے بدگمان کرتے تھے۔ میرے متعلق کہا جاتا تھا اور اخباروں میں پروپیگنڈا کیا جاتا تھا کہ میں

زمینداری اور ریاست کانگریسی حکومت کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ میں
کانگریس کے خلاف کیسے کر سکتا تھا۔ سر والٹر مانکٹن کو کہا جاتا تھا کہ وہ
گورنر جنرل کے دوست ہیں اور ان کے زیر اثر کام کرتے ہیں۔ سر والٹر
اس پر مصر تھے کہ قاسم رضوی نے جو بیانات ان کے خلاف اخباروں میں
دیئے ہیں جب تک انکی تردید نہ ہو وہ اپنا استعفیٰ واپس نہ لیں گے۔
۲۸ - ۸ - ۴۷ وزراء کی کونسل میں وہ خط پیش کیا گیا جو قاسم رضوی
نے سر والٹر کو مطمئن کرنے کے لئے مجھے لکھا تھا جس کی نقل یہ ہے:

DARUS SALAM,
HYDERABAD.
28-8-47

Darus Salam,
Hyderabad.
28-8-1947.

My dear Nawab Saheb,

I am writing this in continuation of my conversation yesterday. I am glad the misunderstanding is now removed. So long as the basis of negotiations and future relations with the new Government of India remains a treaty and not accession in any form I am sure that the Muslim Community of Hyderabad will give Your Excellency and Sir Walter Moncton, the Constitutional adviser and the Negotiating Committee which I expect will be formed including people commanding public confidence, every moral support and the Majlis Ittihad-ul-Muslimin shall duly give public expression to their feelings.

I have convened a meeting of the Majlis Amela this evening and will place the matter before them and shall communicate their resolution in this regard to you and release it to the Press.

I remain.

Yours sincerely
Sd/- Q. Rizvi
President
Ittihadul Muslimin

Nawab Ahmad Said Khan of Chhatari,
H. E. The Prime Minister,
Hyderabad.

اس خط کا انداز تحریر محتاج بیان نہیں۔ اس کا فیصلہ کہ معاہدہ ہو یا ACCESSION نہ نظام پر منحصر تھا نہ حکومت حیدرآباد پر بلکہ قاسم رضوی پر تھا۔ وہ ایک لفظی ترمیم کے ساتھ میں نے اسے قبول کر لیا اور سر والٹر مانکٹن کو بھی راضی کر لیا تاکہ وہ اپنی مساعی کو جاری رکھیں اور آصفیہ خاندان کی حفاظت کر سکیں۔ اس خط کے آخر میں جس رزولیوشن کے پاس کرنے کا ذکر کیا ہے وہ کبھی پاس نہیں کیا اور کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے اسے ٹالا گیا۔

اسی دوران میں لائق علی صاحب نے ایک سفر پاکستان کا کیا اور واپس آ کر مجھ سے کہا کہ مسٹر جناح کو بڑی ہمدردی ہے۔ پھر کہا کہ مسٹر جناح انھیں U.N.O میں بھیجنا چاہتے ہیں لیکن اگر حضور نظام کو ان کی خدمات کی ضرورت ہو تو مسٹر جناح کو لکھ دیں کہ وہ لائق علی صاحب کو امریکہ نہ بھیجیں۔ پھر یہ بھی خواہش کی کہ اگر نظام انھیں ایک تعارفی خط شاہ انگلستان اور وزیر اعظم کے نام دیدیں تو وہ ولایت جا کر کوشش کریں۔ گو میں جانتا تھا کہ ایک آئینی حکومت میں بادشاہ کچھ دخل نہیں دے سکتا۔ مگر سنتا رہا۔

۷-۹-۴۸ سر والٹر دہلی میں تھے۔ انھوں نے مطلع کیا کہ ۸ ستمبر کو حکومت ہند کے نمائندوں اور گورنر جنرل سے حیدرآباد کے مستقبل پر گفتگو ہوگی میں سر والٹر مانکٹن کی خواہش کے مطابق ہوائی جہاز سے روانہ ہوا۔ ہوائی جہاز ناگپور پر رکا۔ وہاں لوگوں سے معلوم ہوا کہ دہلی میں انتظامی حالت بہت بگڑ گئی ہے اور قتل و غارتگری کا بازار گرم ہے۔ مگر دہلی جا کر جو کچھ دیکھا اس کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔

ولنگڈن ہوائی اڈے پر پہنچ کر سب سے پہلے جو غیر معمولی چیز معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ جو موٹر مجھے لینے آیا تھا وہ بجائے باہر کھڑے ہونے کے جہاں ہوائی جہاز رکا تھا۔ اس کے پاس آ کر کھڑا ہوا اور حیدرآباد کی فوج کے دو سپاہی

معہ رائفل نکل کر کھڑے ہو گئے اور جلد ہی مجھے موٹر میں سوار کرا کر میرے ساتھ بیٹھ کر چل دیئے۔ راستہ میں دیکھا کہ ایک شخص فوجی وردی پہنے ہوئے ایک انسانی نعش کو ٹانگ پکڑے ہوئے اس طرح گھسیٹ کر لے جا رہا تھا کہ جیسے صفائی کے محکمہ کے لوگ مردہ کتے کو گھسیٹ کر لے جاتے ہیں۔ قتل و غارتگری اور ہلاکت سامانی کا بازار گرم تھا۔ دہلی ایک ہو کا مقام تھا۔ میں نے سنا کہ سکھ اور پنجابی فوجی ہتھیاروں سے مسلح قتل و غارتگری میں مصروف تھے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت خود راجدھانی میں معطل ہو گئی تھی۔ حیدر آباد مہمان خانہ میں جا کر معلوم ہوا کہ وہاں کھانے پینے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ ملازمین جو اکثر مسلمان تھے مکان میں مقید تھے۔ میں نے خورشید مرحوم آئی سی ایس کو جو دہلی میں چیف کمشنر تھے ٹیلی فون کیا۔ مرحوم نے کہا کہ انتظام کریں گے مگر کوئی انتظام نہ ہو سکا۔ آخر اپنے ہی ایک آدمی کو موٹر میں دو مسلح سپاہیوں کے ساتھ بھیجا وہ کہیں سے کچھ کھانے کا سامان لائے۔ کہا جاتا تھا کہ اس قتل و غارتگری میں پٹیالہ کی فوج کا بڑا حصہ تھا۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ یہ کہاں تک سچ تھا۔ ناسپاسی ہو گی اگر میں یہ نہ لکھوں کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے مردانہ وار مسلمانوں کو بچانے کی کوشش کی۔ جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ جامعہ ملیہ پر حملہ ہونے والا ہے تو خود موٹر میں وہاں پہنچے اور جامعہ کو بچایا۔ اس زمانے میں مسز سبھدرا جوشی اور مسز اندرا گاندھی نے بھی مسلمانوں کے محلوں میں جا کر انھیں بچانے کی بہت کوشش کی اور جو مسلمان خطرے میں تھے انھیں وہاں سے نکالا۔

صبح کو گورنمنٹ ہاؤس گیا مگر گفتگو کیا ہوتی۔ وائسرائے اور ساری حکومت اس ابتری وغیرہ سے پریشان تھی۔ حکومت کی کشتی کو سنبھالنا دشوار ہو رہا تھا۔ میں لارڈ ازمے کے کمرہ میں بیٹھا تھا اور سر والٹر اور ہم باتیں کر رہے تھے کہ فون آیا کہ مسلح سکھ اور ہندو لیڈی ہارڈنگ ہسپتال پر حملہ کر رہے ہیں۔ فوراً انگریزی باڈی گارڈ

کا دستہ بھیجا گیا اور بلوائی لوگوں پہ فیر کرکے انھیں منتشر کیا۔ انسانی سفلگی کی
کتنی شرمناک مثال ہے کہ زنانہ ہسپتال میں جاکر مریضوں کو تہ تیغ کیا جائے
بہرحال میں نے اور سر والٹر مانکٹن نے نظام کا نقطۂ نظر بیان کر دیا
کہ وہ معاہدہ کرنے کو تیار ہیں مگر ACCEDE کرنے کو تیار نہیں ہیں۔

۱۸ ستمبر ۱۹۴۸ء کو میں حیدر آباد آ گیا میری حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی جب
مجھے ان خطوط کی نقلیں ملیں جو اعلیٰ حضرت نے بادشاہ اور وزیر اعظم انگلستان کے
نام لائق علی صاحب کو دیئے تھے نہ سر والٹر مانکٹن مشیر قانونی سے مشورہ کیا اور نہ
مجھ سے کوئی مشورہ ہوا۔ اس پر کیا تنقید کروں۔

بہرحال حضور نظام اپنی مصالح مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں۔ یہ زمانہ یوں تو سارے
ہندوستان کے واسطے پر تشویش تھا مگر حیدر آباد میں سخت ہیجان پیدا
ہو گیا تھا۔ قاسم رضوی اور ان کے ہم خیال لوگوں کی سازشیں اب علانیہ بغاوت
کی صورت اختیار کر رہی تھیں۔ میں نے اس صورت حال کے نتائج پہ غور کرکے
پھر سبکدوش ہونے کی خواہش ظاہر کی مگر منظور نہ ہوئی۔ میں پریشان
تھا اور اسی طرح سر والٹر مانکٹن بھی ولایت واپس جانا چاہتے تھے۔ نظام نے
سر سلطان احمد مرحوم کو جو پٹنہ کے باشندے تھے بلا لیا تھا تاکہ اگر سر والٹر مانکٹن
اور ولایت چلے جائیں تو وہ انکی جگہ مشیر قانونی کا کام کریں۔ وہ میری اور سر والٹر
کی رائے سے متفق تھے کہ کسی طرح ہندوستان سے فیصلہ کر لیا جائے آزادی
کامل کا ملنا ناممکن ہے میرے شرکا میں زین یار جنگ مرحوم نواب مہدی یار جنگ
اور محمود یار جنگ مرحوم تو دل سے میرے ہم خیال تھے مگر باقی حضرات قاسم
رضوی کو خبریں پہنچاتے تھے۔

میرے مشورے سے سر والٹر نے ایک طویل نوٹ لکھا جس کا منشا یہ
تھا کہ نظام کو یہ صاف صاف بتا دیا جائے کہ اگر آپ صلح نہیں کریں گے اور

شریک نہیں ہونگے تو آپ کی ہندو رعایا ایجی ٹیشن کریگی۔ باہر کی جماعتیں ساتھ دینگی بغاوت ہوگی۔ نقض امن ہوگا اور حیدرآباد کا وجود خطرہ میں آجائیگا۔

یہ نوٹ ۱۵ ستمبر کی وزراء کی کونسل میں پیش کردیا گیا۔ میں چاہتا تھا کہ حضور نظام کے سامنے پوری مستقبل کی تصویر آجائے [illegible] طویل تھا جس میں سر والٹر مانکٹن نے یہ بتایا تھا کہ انھوں نے بحیثیت حیدرآباد کے ایک نمائندے کیا کیا کوششیں کیں۔ جس میں ہم نے اپنے اندیشوں کا اظہار کیا تھا کہ جو حیدرآباد کو پیش آنے کا امکان تھا تاکہ نظام کے سامنے پوری تصویر آجائے۔

اس نوٹ کا اقتباس یہ ہے:۔

Note by Sir Walter Moncton for Council.
15th September, 1947.

I wanted an opportunity befose my departure to England to explain my policy and give a final opinion on the situation.

1. My object has been to advise a course calculated to obtain for Hyderabad the maximum degree of real, practical independence, compatiable with its prosperity and security.

2. In working for the object we have to recognise and take into account the facts as they are and remember that they may not all be permanent.

3. The overmastering immediate facts include the facts—

(a) that Hyderabad is land locked in the belly of Hindustan.

(b) that Pakistan is not yet in a sufficiently established state to be able to give effective help;

(c) that therefore, if Hyderabad is to remain independent she must stand on her own feet.

What I think Hyderabad must be prepared to meet is :—

(a) a voilent propaganda campaign against the State inside India and in England and the U. S.

(b) a recrudescence of trouble from the State Congress who are likely to get financial help from the Congress Party (not of course from the Dominion Government as such);

(c) a great deal of covert economic, financial and business pressure and obstacles.

There is moreover the fear that at a later stage, if it becomes necessary to deal severly with hostile Hindu elements in the State, the Dominion Government might find an excuse to say that they cannot stand by and see the Hindus oppressed and ill treated in the State, which is wholly within their border: They might then ultimately intervene by force; or again if there were interruption in Railway, telegraphic or telephonic communications in the State, the Dominion Government might make an opportunity to intervene on the ground that these are thorough communications vital to the security of the Dominion.

۲۱ ستمبر کو ہم لوگ پھر دلی پہونچے۔ اس دفعہ سر سلطان احمد مرحوم بھی ساتھ تھے۔ بیرسٹر مانکٹن پہلے جاچکے تھے۔ انھوں نے اپنی ملاقات کا نوٹ تیار کیا جو ہم لوگوں کو دکھایا جس سے یہ معلوم ہوا کہ نظام مجھ سے چھپا کر جو کچھ بالا بالا کر رہے تھے اس سے حکومتِ ہند پوری طرح واقف تھی کہ نظام مجھ پر اور سر والٹر مانکٹن پر جس اعتماد کا اظہار کرتے تھے اور گورنر جنرل کو جو یقین دلاتے تھے وہ حقیقتِ حال کے خلاف تھا۔ مانکٹن نے اس نوٹ میں یہ بھی کہا کہ اگر حیدرآباد کا یہی طرزِ عمل رہا تو حکومتِ ہند گفت و شنید بند کر دے گی۔

۲۲ ستمبر: دوسرے روز گورنر جنرل سے ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات میں V. P. MENON بھی شریک تھے۔ گورنر جنرل نے اس ملاقات میں ہمیں یقین دلایا کہ ACCESSION کی صورت میں بندرگاہ کے متعلق ہمیں ہر قسم کی سہولت دی جائے گی اور برار کا قضیہ بھی اطمینان بخش طور پر طے ہو جائے گا اور دوسرے فوائد بھی حاصل ہوں گے۔ انھوں نے کہا کہ وہ اپنی حکومت کو اپنا ہم خیال بنائیں گے اور ہم لوگ نظام کو راضی کریں۔ گورنر جنرل نے یہ بھی کہا کہ وہ خود شاہ پسند میں جو کچھ کہا ہے وہ حیدرآباد کی ہمدردی میں کہا ہے۔ اگر کوئی مفاہمت نہ ہو سکی تو گورنمنٹ کو تو دشواریاں ہوں گی لیکن حیدرآباد ایک ریاست کی حیثیت سے تباہ ہو جائے گا۔ انھوں نے اس کا بھی یقین دلایا کہ حیدرآباد کی حکومت

کے اندرونی معاملات میں حکومت ہند دخل نہیں دے گی۔ گورنر جنرل نے یہ
بھی کہا کہ حیدرآباد کے لوگوں کی رائے لے لی جائے۔

۲۳ ستمبر: حیدرآباد وہی پرانی داستانیں شروع ہو گئیں۔ کاؤنسل
کے جلسے اعلیٰ حضرت کی خدمت میں حاضری حکومت کے خلاف سازشیں۔

۹ اکتوبر کو ہم لوگ پھر دہلی گئے۔ گفتگو کا وہی رنگ رہا اور نتیجہ
کچھ نہ نکلا۔ جام صاحب نوانگر نے اس خیال کا اظہار دہلی میں کیا تھا کہ حیدرآباد
ممکن ہے پاکستان کے واسطے SPIRING BOARD بنے اور جنوب سے
ہندوستان پر حملہ ہو جائے ہیں اس کے خلاف حیدرآباد میں ریڈیو پر
بیان دے چکا تھا اور دہلی میں اس کی تردید کی۔

مسٹر مینن ۱۷ اکتوبر کو حیدرآباد آ کر وہاں کے قصے خود ختم کرنا چاہتے
تھے۔ مجھے اس سے اتفاق تھا۔ مسٹر مینن ایک غیر معمولی قابلیت کے
انسان تھے وہ ایک معمولی کلرک کی حیثیت سے ترقی کر کے اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ
کے سکریٹری ہوئے اور سردار پٹیل کے خاص معتمد تھے۔ لیکن اتحاد المسلمین کے
لوگ اس کے خلاف تھے۔ نظام کو اطلاع دی گئی کہ اگر مسٹر مینن آئیں گے
تو ہندو ان کا استقبال کریں گے اور اتحاد کے لوگ مظاہرہ کرنے پر مجبور
ہوں گے۔ نظام کا حکم ہوا کہ ان کا آنا روکا جائے مجھے تعمیل کرنی پڑی۔
اور ناخوشگوار بات کو خوشگوار طریقے سے لکھنا پڑا جواب میں جو ان کا تار
آیا اس کی عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ اس کا اثر قدرتاً خراب ہوا۔
نقل تار درج ذیل ہے۔

I DEEPLY REGRET THAT THE LAW AND ORDER
SITUATION IN HYDERABAD SHOULD HAVE SO GONE
BEYOND THE GOVERNMENT IS CONTROL AS TO COMPEL
YOU TO ASK ME AT THE LAST MOMENTIS TO ABANDON MY

VISIT WHICH WAS ARRANGED AT THE INSTANCE OF YOUR REPRESENTATIVE AND IN CONSULTATION WITH YOUR GOVERNMENT, IF YOU STILL THINK THAT CONTINUANCE OF NEGOTIATIONS IN SUCH CIRCUMSTANCES WOULD YIELD ANY USEFUL RESULTS, WE HEVE NO OBJECTION TO YOUR DELEGATION COMING HERE ON THURSDAY.

یہ محتاج بیان نہیں کہ اس غلطی کا اثر ہماری دہلی سے گفت شنید پر کیا پڑا۔ ۱۱ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو میں نے ایک خط لیاقت علی خاں مرحوم کو جو پاکستان کے وزیر اعظم ہو گئے تھے لکھا مسٹر کھوڑو جو سندھ کے چیف منسٹر تھے نے ایک تقریر میں کہا تھا کہ پاکستان اسلامی حکومت ہو گی۔ میں نے لیاقت علی خاں کو اس طرف توجہ دلائی کہ مذہب کے اعتبار سے وہ لوگوں میں فرق نہ کریں۔ میں نے THEOCRATIC گورنمنٹ کے خلاف انھیں لکھا اور اس خط کی ایک نقل غلام محمد صاحب مرحوم کو اپنے خط کے ساتھ بھیجی۔ لیاقت علی خاں مرحوم نے کوئی جواب نہیں دیا مگر غلام محمد مرحوم نے جواب دیا جس کا منشاء یہ تھا کہ مسٹر جناح کی بھی یہی پالیسی ہے جو میں نے خط میں چاہی تھی۔ ان خطوط کی نقول حسب ذیل ہیں۔ اس زمانے کے حالات ایسے تھے کہ مجھے ان خطوط کا بھیجنا ناگزیر تھا۔

New Delhi
11th October, 1247

My dear Liakat,

As some of my messages were kept unreplied I would not have taken the liberty to encroach upon your time as I know how terribly busy and worried you are at present. But I do think that in the interest of Muslims of the minority Provinces I must write to you, the recent statement by the Chief Minister, Mr. Khuro in which he said that Sind is the Islamic Government, has caused certain amount of difficulties for the Muslims in the minority Provinces. If they are going to form theocratic Government in Pakistan, there will be every justification to Hindus to form a Hindu Raj in rest of India and, therefore, I would request you to make a definite declaration on this question or advise His Excellency the Qaide Azam to make some announcement including the following points :—

(1) That the formation of Government in Pakistan will be on secular basis and not on religious basis;

(2) That a declaration about the protection and rights of minorities in Pakistan; and

(3) That an expression of disappointment and regret at what happened in Western and Eastern Punjab with an assurance of protection and fair treatment to those who had left their homes and property if they come back to Western Punjab;

so that on the basis of reciprocity Muslims in minority Provinces may hope to receive the same protection.

With kindest regards,

Yours very sincerely
Sd/– Ahmad Said Khan

The Hon'ble Nawabzada Liakat Ali Khan,
Prime Minister, Karachi.

Camp New Delhi,
11th October, 1947

My Dear G. M.,

I herewith attach a copy of the letter written to Nawabzada Liaqat Ali Khan. As Liaqat could not reply to my letters since he left Delhi. I am sending a copy to you also to make a sincere effort in the interest of the minority Provinces to get such declarations, as I have suggested in my letter to the Prime Minister from Pakistan in most unequivocal terms. You can show this copy of my letter to the Prime Minister and to Qaide Azam, if necessary. What I wrote to Liaqat is not against the policy of Pakistan, but it should be made clear. For instance, the Chief Minister, Mr. Khuro in one of his speeches said something about Islamic State. They should be advised not to speak in these terms.

With kindest regards,

Yours very Sincerely
Sd/- Ahmad Said

The Hon'ble Mr. Ghulam Mohammad,
Finance Minister,
Karachi.

Reply to my letter from Ghulam Mohammad Sabib
the then Finance Minister, Pakistan.

D. No. 196

Government of Pakistan
Ministry of Finance
KARACHI.

15-10-1947

My dear Nawab Sahib,

I have to thank you for your letter of the 11th Oct., with which you have sent me a copy of your letter of the same date addressed to Mr. Liaqat Ali Khan.

I am sure you have been studying the papers and have read the speeches of Qaide Azam and other members of the Pakistan Cabinet which have definitely and categorically dealt with the points raised by you. I deal with these seriatim.

(1) Definite declarations have been made by the Qaide Azam and other members of the Cabinet that Pakistan will be a secular State.

(2) Definite declarations have been made by the Qaide Azam and other members of the Cabinet about the protection of rights of minorities in Pakistao which shall be the same as any other citizen.

(3) Both Qaide Azam and other members of Cabinet have condemned in no uncertain terms and deplored what has happened in the Punjab. There is no bar and Pakistan is prepared to let any one who went of his own accord out of Pakistan to come back. You will agree the question of mass retransfer of population, however would raise a definite practical and other difficulties and would need consideration.

With kind regards,

Yours Sincerely
Sd/- Ghulam Mohammad

Nawab Ahmad Said Khan Sahib,
Prime Minister,
Hyderabad.

یہ زمانہ صرف حیدرآباد ہی کی پریشانی کا نہ تھا بلکہ ہندوستان بھر میں اس قدر انتشار اور مستقبل کے متعلق تذبذب تھا کہ کسی کو آنے والے زمانے کی تصویر صاف نظر نہیں آتی تھی۔ حیدرآباد میں ہر کوشش اس انقلاب کے طوفان سے بچنے کی ناکام ہو جاتی تھی۔ نظام کے دفتر سے ہماری ہر تجویز کی نقل اتحاد المسلمین کو دے دی جاتی تھی اور جو ان لوگوں کی رائے ہوتی تھی اس سے حضور نظام متاثر ہوتے تھے اس زمانہ میں اپنا روزنامچہ صفیر صاحب مرحوم اپنے پرائیویٹ سکریٹری کو نہیں لکھا سکا آئندہ جو کچھ لکھ رہا ہوں وہ اپنی یاد اور مسٹر دی۔ پی۔ مینن کی کتاب "INTEGRATIAN OF THE INDIAN STATES" کی مدد سے لکھ رہا ہوں۔

حیدرآباد کی کہانی سے الگ لیاقت علی خاں اور غلام محمد کے خطوط کا تذکرہ جملۂ معترضہ ہو گیا۔

اب پھر حیدرآباد کی کہانی شروع کرتا ہوں مسٹر مینن کے تار کے بعد یہ صاف ظاہر ہو گیا کہ اب گفت و شنید کی فضا بہت ناموافق ہو گئی تھی۔ بہر حال ہمارا ڈیلیگیشن دلی گیا جو سر والٹر، سر سلطان اور راقم پر مشتمل تھا۔ ۱۱ اکتوبر کو وائسرائے گورنر جنرل LORD MAUNT BHTTON سے ملاقات ہوئی۔ سب سے پہلے مسٹر مینن کے حیدرآباد نہ آنے کا مسئلہ درپیش ہوا میرے لئے اس غلطی کی صفائی میں بڑی دشواری تھی بہر حال کسی نہ کسی طرح یہ قضیہ ختم ہوا۔

سر سلطان احمد نے مسٹر مینن سے دریافت کیا کہ حیدرآباد کو کیا فائدہ ہندوستان میں شرکت سے ہوگا انھوں نے وہی کہا جو گورنر جنرل ایک بار کہہ چکے یعنی بیار۔ کسی بندرگاہ سے حیدرآباد کے مال کی درآمد و برآمد وغیرہ بہت سی گفت و شنید کے بعد سر والٹر مانکٹن نے یہ سوال کیا کہ اگر حیدرآباد کو کامل ACE SSION منظور نہ ہو تو کوئی اور صورت بھی ہندوستان

اور حیدر آباد کے درمیان ہو سکتی ہے جس سے وہ ہی مقصد پورا ہو جائے
گورنر جنرل کا جواب نفی میں تھا مسٹر مینن نے سردار پٹیل کے مشورے کے
بعد سر والٹر اور گورنر جنرل سے کہا کہ اگر ACCESSION کا مطلب کسی
STAND STILL معاہدے سے پورا ہو جائے تو عارضی طور پر کہا جا سکتا
ہے۔

۱۱ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو ہمارا ڈیلی گیشن پھر حیدر آباد آ گیا بڑی بحث کے بعد
وزرا نے ایک مسودہ STAND STILL کا منظور کیا جسے لے کر ہم لوگ پھر
۱۶ر تاریخ کو دہلی آئے۔ اس کے ساتھ نظام کی طرف سے ایک خط بھی تھا
حکومت ہند نے نہ اس مسودہ سے اتفاق کیا اور نہ نظام کے خط کو کافی خیال
کیا۔ مسٹر مینن نے سردار پٹیل سے مشورہ کے بعد کہا کہ اگر ڈیفنس اور صیغہ
خارجہ EXTERNAL DEPARTMENT پر حیدر آباد گورنمنٹ کی تجویز سے اتفاق
نہیں کرتا تو گفت و شنید بیکار ہے ختم کر دی جائے۔ جب گورنر جنرل کو مینن
نے اس صورت حال کی اطلاع دی تو انھوں نے اظہار افسوس کیا اور دوسرے
روز گورنر جنرل سے مینن اور سر والٹر سے ملاقات ہوئی اور مسٹر مینن
سے کہا گیا کہ تم ایک مسودہ عارضی معاہدہ STAND STILL اور اس کے ساتھ
نظام کی طرف سے جو خط ہے COLLATERAL LETTER تیار کرو۔ چنانچہ
مسٹر مینن نے مسودہ لکھا اور سر والٹر کو دکھایا۔ اس میں سر والٹر نے کچھ ترمیمات
بھی کیں۔ ہم یہ مسودہ اور اس کے ساتھ گورنر جنرل جو نظام کو ان کے خط کا جواب
دیں گے۔ لے کر ۲۲ر اکتوبر کو ہم لوگ حیدر آباد واپس آ گئے۔ ہم نے وہ کاغذات
جاتے ہی نظام کے حضور میں پیش کئے اور اعلیٰ حضرت نے وزراء کی کونسل
کی رائے طلب کی۔ ۲۳، ۲۴، ۲۵ر اکتوبر کو کونسل کے اجلاس ہوتے رہے
آخر کار وزراء میں ۶ کی رائے موافقت اور تین کی خلاف رہی جن میں نے اکثریت

کی رائے پیش کر کے نظام سے عرض کیا کہ وہ منظور فرما کر خط پر دستخط کر دیں۔ حضور نظام نے منظور کر لیا لیکن دستخط کرنے کو دوسرے دن پر ملتوی کیا۔ جب ۲۸ر اکتوبر کی شام کو ڈیلی گیشن نے دستخط کرنے کے واسطے عرض کیا تو ارشاد ہوا کہ کل صبح دستخط کریں گے یہ روز ہمارے دہلی واپس جانے کا تھا۔

تین چار بجے صبح سے بیس پچیس ہزار اتحاد کے لوگوں نے میرا، سر والٹر مانکٹن اور سر سلطان احمد کے مکان گھیر لیا تاکہ ہم لوگ STAND STILL کا معاہدہ دہلی نہ لے جا سکیں۔ مجھے صغیر صاحب مرحوم میرے پرائیویٹ سکریٹری نے سونے کے کمرے میں آکر مطلع کیا۔ مجھے سب سے زیادہ فکر سر والٹر اور لیڈی مانکٹن کی ہوئی۔ میں نے انھیں ایک حیدر آباد کی فوج کے برٹش افسر کے یہاں پہنچوا دیا۔ صبح آٹھ نو بجے نظام کا حکم آیا کہ ڈیلی گیشن دہلی نہ جائے اور وائسرائے کو تار دیا کہ ڈیلی گیشن ۳۰ر یا ۳۱ر کو آئے گا۔ بعض غیر متوقع اسباب سے ۲۷ر تاریخ کو نہ آ سکے گا۔

دوسرے روز شام کو نظام نے سر سلطان، سر والٹر اور مجھے دفتر پیشی میں طلب فرمایا۔ جب ہم لوگ وہاں پہنچے تو قاسم رضوی بھی وہاں موجود تھے۔ نظام کے استفسار پر قاسم رضوی نے کہا کہ اگر ملکی لوگوں کا ڈیلی گیشن جائے اور حکومت ہند پر زور ڈالے تو وہ ضرور اس سے بہتر شرائط لائے گا۔ اس لئے کہ حکومت ہند دوسری طرف کشمیر میں اتنی الجھ رہی ہے کہ وہ ہمارے شرائط منظور کرے گی۔ کشمیر میں کچھ پشاوری قبائل کے لوگوں نے حملہ کیا تھا۔ رضوی کا اشارہ اسی جانب تھا۔

ہم تینوں نے نظام سے عرض کیا کہ قاسم رضوی کا خیال غلط ہے اور محض خوش فہمی پر ہے لیکن نظام کا رجحان خاطر اسی طرف تھا۔ میں نے عرض کیا کہ انھیں موقع دیا جائے اگر حضور کا خیال ہے کہ حیدر آباد کی خدمت یہ کامیاب

شمائحہ کر سکیں گے ہم لوگوں نے ڈیلی گیشن سے استعفیٰ دے دیا۔
مجھے بہت افسوس تھا اور حیدرآباد کے مستقبل کی تصویر میرے ذہن میں آرہی تھی۔ مگر تقدیر الٰہی کو کون بدل سکتا تھا۔
میں نے دوسرے روز پھر وزارت سے سبکدوش ہونے کی خواہش پر زور دیا۔ میں جانتا تھا کہ ایجی ٹیشن ہوگا۔ خونریزی ہوگی اور آصفیہ خاندان کی حکومت کا خاتمہ لازمی ہے میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے زمانے میں یہ ہو۔
حضور نظام نے میری درخواست منظور فرمالی اور جہاں تک مجھے یاد ہے میں ۲ نومبر کو وزارت سے سبکدوش ہو کر حیدرآباد سے گھر کو روانہ ہوگیا۔ میں نے وزارت کا چارج نواب سر مہدی یار جنگ کو دیا۔ میری کہانی تو یہاں ختم ہوگئی اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ حیدرآباد کی کہانی ہے مسٹر مینن کی کتاب INTEGRATION OF INDIANSTATS کے صفحہ ۳۴۴ پر حسب ذیل عبارت ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نیا وفد جو حیدرآباد نے بھیجا تھا وہ کتنا کامیاب ہوا۔

THE DELEGATION RETURNED TO HYDERABAD WITHOUT ANY MATERIAL CHANGE IN THE AGREEMENT OF THE COLLATERAL LETTER THE TWO DOCUMENTS WERE SIGNED BY THE NIZAM ON 29 TH. NOV. 47

کاش پہلے ہی مان لیتے تو بدمزگی پیدا نہ ہوتی۔
حیدرآباد کے ڈرامے پر میرے واپس ہونے کے بعد آخری پردہ (DROPSEEN) پڑا۔ ۱۰ ماہ کی مدت کے بعد حکومت ہند کی فوجیں حیدرآباد میں داخل ہوئیں ایک ہفتہ میں حیدرآباد بحیثیت ایک ریاست کے ختم ہوگیا۔ مجھے حسرت افسوس کے ساتھ عبرت بھی ہوئی کہ مغلیہ سلطنت کے زمانے کے آداب وتہذیب، اخلاق و مروت کا ایک ٹمٹماتا ہوا چراغ بھی بجھ گیا۔ رہے نام اللہ کا۔ دنیا اور اس کی دولت

وثروت، شان وشوکت ہر چیز فانی ہے ؎

تا سحر وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے بادِ صبا
یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک

میں نے حسب ذیل تار اعلیٰ حضرت نظام کو بھیجا۔

His Exalted Highness the Nizam,
Hyderabad (Deccan).

My anxiety was greatly relieved when I heard on the Radio last night the report of Your Exalted Highness's wise decision about Hyderabad affairs. I am certain in my mind about the correctness of this step and hope and pray that this welcome move will be greatly appreciated by all concerned and will help in bringing about all round peace, happiness and prosperity to Hyderabad.

Nawab Chhatari
18-9-48

حضور نظام نے پولیس ایکشن کے بعد جو تقریر کہ ریڈیو سے نشر فرمائی وہ یہ تھی۔

The following is the text of message which the Nizam wishes passed to his Agent General Delhi for broadcast in English, Persian, Arabic and Urdu.

Begins :–

Leaders and Friends in Islamic Countries ;

Several delegations calling themselves Hyderabad delegation sent by the Laik Ali Ministry have been carrying on a campaign against India's so called misdeeds which in fact has merely restored my freedom to deal with Hyderabad's enemies in a manner consistent with the traditions of the Asifia dynesty and the best interest of Hyderabad. I am, therefore, placing before the World the true facts of the situation. In November last a small group which has organised into military organisation hostile to Hyderabad's best traditions sorrounded the house of my Prime Minister, Nawab of Chhatari in whose wisdom I had complete confidence and Sir Walter Monckton, my Constitutional adviser and thus by duress compelled the Nawab of Chhatari and my other trusted Ministers to resign and force the Laik Ali Ministry on me. This group with Qasim Rizvi at its head who had no stake in the Country nor any record of service behind him, by methods remniscent of Hitlerite Germany, took possession of State, spread terror in all elements of the society Muslims and non Muslims that refused to bend their knees to them committing arson and loot on a large scale

particularly on Hindus and rendered me completely helpless. For some time I was anxious to come to an honorable settlement with India which India was willing to come to. But this group in its ambition to found an Islamic State in which the the Muslims alone of Hyderabad should have citizenship rights, got me to reject the offer made by the Government of India from time to time. I am a Muslim and am proud to be a Muslim. But I know that Hyderabad cannot remain apart from India. My ancestors' never made any difference between the 86% Hindus and 13% Muslims in the State. The relations between the two communities political, social and religious were the most cordial ever found anywhere in India. This was attained as a result of the policy which my ancestors and I pursued in the past. During the eight months this group was in power aided by Razakars had brought about the most intense communal hatred which unfortunately in the position that I was placed I could not prevent. When the crises which they created came this group while professing their determination to fight to the last man and last round vanished when the Indian Army was about 40 miles from Hyderabad. The Ministry resigned leaving me to save the situation as best as I could. I have around me my old and trusted Muslim Officers who whatever regime have always contributed their best to build up the State. I have no fear from the Indian Union. I know and always have known that ihe Indian Unian is a secular State. In the very nature of things Hyderabad whose 86% of the people are Hindus cannot possibly become an Islamic State. In the meantime thousands of fanatic outsiders brought from abroad lured by money and prospects of loot who were let loose in the State are still out of hands. The city of Hyderabad was saved from their havoc because of your discipline and the exemplary behaviour of the Indian Army. The administration is now in the hands of Military Governor to whom I have asked you to give fulless support. He is Major General J. N. Chaudhri of the Indian Army. I have issued orders dissolving all delegations sent out by the Laik Ali Ministry and I warn the Muslims all over the World not to be victims of interested propaganda.

میں ۲۴ ستمبر ۴۸ء کو لکھنؤ گیا تھا وہاں مسز نائیڈو سے ملنے گیا۔ یہ بڑی ہوشمند اور شریف مزاج خاتون تھیں۔ ان سے حیدرآباد کے المیہ (TRAGEDY) کا بھی ذکر آیا انھیں بہت افسوس تھا کہ حیدرآباد کے لوگوں نے آشتی کا راستہ اختیار نہ کیا اور مجھ سے کہنے لگیں کہ بڑی غلطی یہ تھی کہ سر والٹر مانکٹن اور تمھاری رائے نہ مانی وہ اس پر خوش تھیں کہ نظام نے جو بیان ریڈیو پر دیا اس میں میری تعریف کی اور مجھ پر اظہار اعتماد کیا۔

۲۶ ستمبر کو صفیر احمد صاحب میرے سکریٹری کا فون علی گڑھ سے آیا جس میں انھوں نے نظام کا حسب ذیل تار پڑھ کر سنایا۔

Nawab of Chhatari,
Aligarh.

Believe you are well aware of the state of affairs prevailing now in Hyderabad. Since you served for Hyderabad for long time I consider you to be my well wisher and trust you will do some service now to the extent it lies in your power which I shall appreciate.

Nizam Hyderabad
25-9-48

مجھے اس تار سے بہت قلبی تکلیف بھی ہوئی اور عبرت بھی۔ فوج کشی کرنے کے بعد صورت بالکل بدل گئی۔ اب فریقین میں گفت و شنید کا وقت ختم ہو گیا اب تو فاتح اور مفتوح کی صورت پیدا ہو گئی تھی۔ ہندوستان کی فوجیں پانچ روز میں حیدرآباد پر قابض ہو گئیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب کوئی خدمت کس طرح انجام دوں۔

میں نے یہ خیال کیا کہ مسز نائیڈو جو یوپی کی گورنر تھیں ان سے مشورہ کروں اور ح۔ ہ۔ ہ کو فون کیا میں اسی روز شام کے ۵ بجے مسز نائیڈو سے ملا اور نظام کا تار دکھایا۔

میں نے یہ بھی کہا کہ اگر حکومت ہند آپکو کچھ مدد کے واسطے حیدرآباد

بھیجدے اور STATE DEPARTMENT کے کچھ افسران آپکے ساتھ ہوں تو نظام ہر تجویز کو مان لیں گے اور دنیا کی نظروں میں بھی اچھا معلوم ہوگا اور اہل حیدرآباد کو اس کا احساس ہوگا کہ حیدرآباد کی ایک ہندو بیٹی نے مصیبت کے وقت حیدرآباد اور نظام کو بچایا۔ انھوں نے میری تجویز کو پسند کیا اور اجازت دی کہ میں دہلی میں یہ کہہ سکتا ہوں۔ میں نے گورنمنٹ ہاؤس سے سردار پٹیل کو فون کرایا تاکہ ملاقات کا وقت طے ہو جائے گا۔

شام کو مجھے ۔ ۵ ۔ ۸ نے کہا کہ سردار پٹیل نے فون پر کہا ہے کہ پرسوں میں ان سے مل سکتا ہوں لیکن مس سروجنی اسمٰعیل اگر حیدرآباد جانا چاہتے ہیں تو اپنی ذمہ داری پر جائیں۔ ہم ان کی حفاظت کے ذمہ دار نہیں ہوسکتے اس فون کے بعد مجھے سردار پٹیل کے مزاج کا پورا احساس ہوگیا تھا مگر اب جوں کہ وقت مقرر ہوگیا تھا میں نے اپنا ارادہ قائم رکھا۔ مسز نائیڈو نے غالباً اس کے جواب کے بعد مجھ سے کہلوا دیا کہ جو میری تجویز ان کے حیدرآباد جانے کے متعلق تھی وہ مناسب نہیں ہے۔

۲۹ ستمبر ۱۹۴۸ء کو میں ساڑھے آٹھ بجے سردار پٹیل سے ملا۔ نظام کا تار دکھایا۔ میں نے ان سے کہا کہ میرا منشا حیدرآباد جانے کا نہیں ہے مجھے اس تار کے متعلق مشورہ کرنا ہے وہ کہنے لگے کہ اس تار کا جواب بتانا میرے واسطے مشکل ہے۔ میں نے کہا کہ کیا میں یہ کہدوں کہ "میں حیدرآباد کی ہر خدمت کو تیار ہوں" اتنا ہی کہا تھا کہ سردار پٹیل نے کہا کہ اس میں یہ بھی بڑھا دوں کہ آخری فیصلہ وہاں کے لوگوں پر منحصر ہوگا۔ انھیں کبھی ہاتھ میں لینے کی کوشش کیجئے۔

انھوں نے یہ بھی کہا کہ جو مجھ سے اور نواب اسمٰعیل خاں سے پہلے ہی کہہ چکے تھے کہ نظام پاکستان سے ملنا چاہتا تھا مگر نظام یہ چاہتے تھے

کہ جناح کا کوئی دستخطی خط ان کے پاس آجائے جو مسٹر جناح کی بیماری کی وجہ سے نہ ہو سکا۔

میں نے ان کے سکریٹری کو تار لکھا دیا۔ جو میں نے بھیجا تار حسب ذیل تھا۔

EXPRESS TELEGRAM

His Exalted Highness the Nizam,
Hyderabad (Deccan).

Honoured by yovr Exalted Highness's telegram. It will always be my desire to serve the best interest of Hyderabad, In my humble opinion every effort should be made to carry the people of Hyderabad with you. Their views will have greater influence.

Nawab of Chhatari.

مجھے اس کا ہمیشہ افسوس رہے گا کہ حیدرآباد کو نادان دوستوں کی بدولت یہ دن دیکھنا نصیب ہوا۔